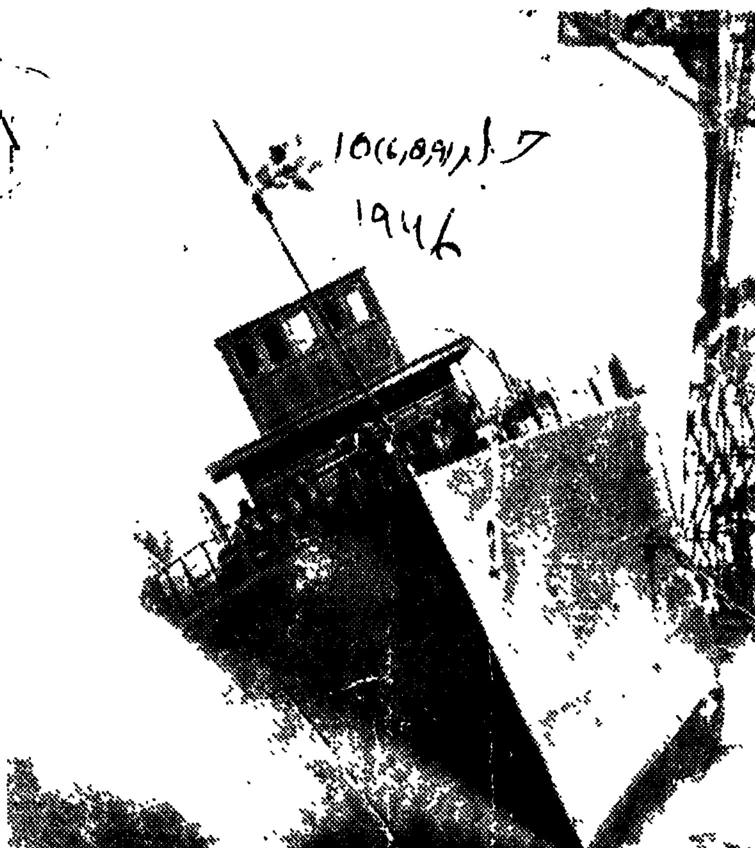
DUE DATE

Cl No. *Acc. No.*

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day

قوم پنجابیان کا واحد ترجمان

پنجابی گزٹ دہلی



FROM INDIA TO MACCA

PUNJABI GAZETTE
DELHI

FIROZE

زیر سرپرستی انجمن وکیل قوم پنجابیاں دہلی

و

زیر اہتمام پنجابی یوتھ لیگ دہلی!

[illegible]

پنجابی گزٹ

قوم پنجابیاں کا واحد ترجمان

سرپرست خصوصی

۱:- شیخ فیروز الدین صاحب جاپان والے، کلکتہ
۲:- " محمد ذکی صاحب معرفت پیرجی محمد یوسف صاحب دہلی
۳:- " محمد سلطان صاحب معرفت شیخ محمد صدیق صاحب "
۴:- لمٹن ٹریڈنگ کمپنی۔ کلکتہ۔
۵:- ایس نور الہیٰ صاحب اینڈ کو کلکتہ۔
۶:- خان بہادر شیخ محمد جان صاحب کلکتہ
۷:- شیخ محمد صدیق صاحب تار والے دہلی
۸:- حاجی ابوالحسن صاحب تار والے دہلی
۹:- محمد یونس صاحب باڑی دہلی
۱۰:- محمد صدیق صاحب رئیس اعظم کانپور
۱۱:- حاجی محمد سعید صاحب ملک دوائی والے دہلی
۱۲:- حاجی محمد سعید صاحب باڑی دہلی
۱۳:- مقبول الہیٰ صاحب جاپان والے معرفت ایس نور الہیٰ اینڈ کو کلکتہ۔
۱۴:- محمد شفیع صاحب مالک فرم انڈین ٹریڈنگ کارپوریشن کلکتہ
۱۵:- محمد ابراہیم صاحب سگرٹ والے معرفت عبدالسلام و محمد ابراہیم صاحبان
۱۶:- حافظ مقصود احمد صاحب معرفت ایس کرم الہیٰ اینڈ سنز کلکتہ
۱۷:- جناب شیخ حافظ مقصود احمد صاحب آنولہ
۱۸:- ایس۔ ایم۔ حنیف صاحب کلکتہ
۱۹:- مسرز رحیم الدین اینڈ عبدالکریم صاحبان کلکتہ
۲۰:- شیخ حافظ محمد شفیع اللہ والے
۲۱:- حاجی احمد حسن صاحب اللہ والے

(مکتبہ شفیقیہ پاکستانی)

معاونین خصوصی

۱:- جناب شیخ اعجاز احمد صاحب خلف فیاض الدین صاحب دہلی

۲:- پیر جی عبد الخالق صاحب 〃

۳:- شیخ محمد سعید صاحب مالک فرم کمرشل پٹیکل کمپنی 〃

۴:- محترمہ (پیر جی) عبد الخالق صاحب 〃

۵:- جناب شیخ محمد اسمٰعیل صاحب دواتی والے — کلکتہ

۶:- 〃 حاجی رحمت الٰہی صاحب معتکف — دہلی

۷:- 〃 محمد سعید صاحب مسلم — کلکتہ

۸:- 〃 سراج العارفین صاحب کپڑے والے — دہلی

۹:- 〃 محمد اقبال صاحب ولد شیخ احسان الٰہی صاحب دواتی والے 〃

۱۰:- گرانڈ واچ کمپنی — کلکتہ

۱۱:- 〃 محمد رفیع صاحب 〃

۱۲:- 〃 حاجی کرم الٰہی و رحمٰن الٰہی صاحبان گھڑی والے — دہلی

۱۳:- 〃 محمد نقی صاحب باڑی بی۔اے — کلکتہ

۱۴:- مقبول برادرس 〃

۱۵:- 〃 ملک ممتاز الدین صاحب 〃

۱۶:- 〃 جلال الدین اینڈ کو 〃

۱۷:- 〃 محمد اسمٰعیل صاحب دواتی والے 〃

۱۸:- 〃 فیاض الدین صاحب اینڈ کمپنی 〃

۱۹:- محترمہ مسرت کلام صاحبہ معرفت اسلام احمد صاحب اینڈ سنز کانپور

۲۰:- 〃 حاجی رحمت الٰہی صاحب جاپان والے — کلکتہ

۲۱:- 〃 عبد الرشید صاحب کلکتہ والے 〃

۲۲:- محترمہ بیگم محمد شبیر صاحب معرفت حاجی الٰہی بخش صاحب اینڈ کو — دہلی

۲۳:- مسرز ایس۔ایم سعید دہلی والے — کسولی

۲۴:- 〃 چودہری سمیع اللہ صاحب کپڑے والے — دہلی

۲۵:- 〃 عبد الرحیم صاحب سنگاپور والے 〃

۲۶:- 〃 ضمیر الحق صاحب اللہ والے — کلکتہ

۲۷:- 〃 محمد اسمٰعیل صاحب چانولہ 〃

۲۸:- 〃 سراج الحق صاحب خضاب والے — دہلی

۲۹:- 〃 محمد یوسف صاحب چشمے والے معرفت موناپٹیکل کمپنی کلکتہ

۳۰:- 〃 محمد الیاس صاحب نیو لیبر اسٹور 〃

۳۱:- 〃 محمد یونس صاحب گھڑی والے — دہلی

۳۲:- 〃 حافظ محمد عمر صاحب — کلکتہ

۳۳:- 〃 محمد عثمان صاحب چاندنہ 〃

۳۴:- عبد المالک صاحب سگرٹ والے — کلکتہ

۳۵:- محمد عاشقین صاحب مالک فرم عاشق کمپنی 〃

۳۶:- فضل احمد صاحب معرفت شفیع کمپنی 〃

۳۷:- محمد احمد صاحب معرفت مسرز ایس ایم احمد اینڈ کو 〃

۳۸:- محمد ابراہیم صاحب معرفت برٹش ہاؤس 〃

۳۹:- محمد اشفاق احمد صاحب چاندنہ 〃

۴۰:- مسرز شیخ محمد ادریس صاحب ملتانی — دہلی

۴۱:- عبد الحمید صاحب دواتی والے 〃

۴۲:- محمد اسمٰعیل صاحب سگرٹ والے — کلکتہ

۴۳:- مسرز محمد عمر صاحب محمد شفیع صاحب 〃

۴۴:- محمد نقی صاحب باڑی — دہلی

۴۵:- مسرز جلال الدین اینڈ کو — کلکتہ

۴۶:- محمد صادق صاحب بریلوی 〃

۴۷:- شاہد احمد صاحب بریلوی — بریلی

۴۸:- ایس۔ایم نور احمد صاحب بریلوی — کلکتہ

۴۹:- انور سعید صاحب بریلوی — بریلی

۵۰:- عبد الحمید صاحب چوڑی والے — کلکتہ

۵۱:- عبد الاحد صاحب مینجنگ پروپرائٹر کامرینڈ آپٹیکل کمپنی (دہلی)

۵۲:- انوار الحق صاحب چشمے والے — دہلی

۵۳:- ایس سلیم الدین صاحب — کلکتہ

۵۴:- محمد شفیع صاحب 〃

۵۵:- محمد رفیع صاحب ملتانی آنریری مجسٹریٹ — دہلی

۵۶:- ایس رحمان گھڑی والے — کلکتہ

۵۷:- اے رحمان گھڑی والے 〃

شمارہ ۶ — جلد ۱۰

ماہنامہ پنجابی گزٹ دہلی

ماہ جون سنہ ۴۶ء

ادارۂ تحریر
منظور احمد۔ ایم۔ اے
سلطان احمد
ناظم:۔ آفتاب احمد چشمہ والے
مدیر شمع کلب:۔ انیس الرحمٰن کالیہ

شمع کلب

پرنٹر و پبلشر
جمیل الرحمٰن نے دیال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر
دفتر پنجابی گزٹ سے شائع کیا

کتبۂ شفیق پاکستانی

گردوپیش

منظور احمد

ماہ گذشتہ کے شمارہ میں ادارہ کی جانب سے برادری کے باا ثر تاجروں اور بارسوخ حضرات سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنی معروفیات میں سے تھوڑا وقت نکال کر اپنے وسیع تعلقات کی مدد سے برادری کے اس نوجوان طبقہ کی رہنمائی کریں جو حصول تعلیم کے بعد گردوپیش کی الجھنوں سے گھبرا کر صرف نوکری کو اپنا منتہائے مقصد بنا چکا ہے جریدہ کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی اس لئے ادارہ کو اکابرین نیز نوجوانان قوم کی رائے معلوم کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن مسئلہ کی اہمیت مزید وضاحت کے لئے مجبور کرتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ قوم کی دیرینہ شان و شوکت واپس لانے کے لئے اس سوال کو حل کرنا ازبس ضروری ہو گیا ہے امید ہے برادری کے ارباب بست و کشاد اس مسئلہ کی نوعیت کو سمجھانے اور حل تلاش کرنے میں ادارہ کی پوری مدد کریں گے۔

تجارت جیسا کہ حالات نے ثابت کیا قوم کی زندگی میں بمنزلہ روح کے ہے اور جس وقت تک برادری کے افراد تجارت کرتے اور نوجوانوں کے لیے تجارت کے مواقع بہم پہنچاتے رہے۔ برادری کی عزت اور وقار میں اضافہ ہوتا رہا۔ دولت کے انبار موجود رہے لیکن کیونکہ ساری دولت سمٹ کر ایک مرکز پر جمع نہ ہوئی تھی۔ اس لئے نوجوانوں کا ذہن ہمیشہ عروج اور ترقی کا خواہاں رہا۔ حالات نے اچانک پلٹا کھایا اور وہ بے لوث اتالیق جو برادری کے بچوں کو اپنا بچہ سمجھتے تھے۔ اس جہاں سے رخصت ہو گئے اور اپنے ساتھ ہی وہ بے طمع محبت اور الفت بھی لے گئے۔ جس کے بغیر قوم کا شیرازہ یکجا رہنا مشکل ہوتا ہے وقت کی گردش اور زمانہ کا چکر اپنے دامن میں کچھ تبدیلیاں لاتا ہے۔ تجارتی دنیا اس سے محفوظ نہیں۔ کچھ وقت کے اقتضا کو سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ کچھ خود غرضی اور جھوٹی نمود و نمائش نے راہ روکی اور قوم کے اکثر و بیشتر حضرات کے ہاتھ سے تجارت کی دولت نکل کر دوسروں کے قبضہ میں چلی گئی یہ سانحہ قوم کی زندگی میں تشتت و افتراق کا پیش خیمہ ہو گیا اور قوم دو طبقوں میں تقسیم ہو گئی ایک وہ جو صرف اس لئے پنجابی تھے۔ کہ پنجابی برادری سے متعلق تھے۔ دوسرا طبقہ متمول حضرات کا تھا جس کے پنجابی ہونے کا سبب اس کی دولت و امارت تھی۔ دونوں طبقہ کے افراد ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہے لیکن ان کے درمیان ایک ناقابل عبور ذہنی خلیج حائل ہو گئی تھی۔ جو کسی عنوان پٹتی نظر آتی تھی ——— یہ ایک معاشرتی بحران تھا جو آیا اور اگر وقت اول الذکر طبقہ کا ساتھ نہ دیتا تو شاید ہمیشہ قائم رہتا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اور جو کچھ گذر گیا۔ لیکن اس کے اثرات آج بھی باقی ہیں۔ اور ہمارا کام صرف ان اثرات کو مٹانا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو خوف ہے کہ دوسرا طبقہ افتراق پھر ہماری معاشرتی زندگی کی بنیادیں ہلا دے گا۔ جس کے نشانات آج بھی پائے جاتے ہیں اور اگر ہم دیکھنا چاہیں ——— چاہیں کا سوال میری دانست میں بے معنی ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں ——— دیکھ رہے ہیں اور ہم کو دیکھنا چاہیئے۔

ان اثرات کو مٹانے کا موثر طریقہ کیا ہے؟

ان اثرات کو مٹانے کا واحد طریقہ برادری کے گھر میں وہی دیرینہ شان و شوکت واپس لانے کی کوشش ہے۔ جس کی تلاش میں چند بے چین روحیں بھٹک رہی ہیں۔ شکایت اور بجا شکایت ہے کہ برادری کے نوجوان بزرگوں کی وہ عزت نہیں کرتے جوان کا شیوہ رہا ہے ——— لیکن وجہ؟ ——— کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ نوجوانوں کو اکابرین کی دولت اور شان سے نفرت ہے ——— لیکن حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے نوجوانوں کو نفرت نہیں بلکہ بے التفاتی کا گلہ ہے۔ ایسی شکایت جس گوش گذار کئے بغیر ہماری حیات قومی کا تصور قطعاً بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسا شکوہ جس کے جواب میں وہ التفات کے خواہاں ہیں وہ چاہتے ہیں۔ کہ اپنے روحانی اضطراب اور اندرونی خلفشار کی ایک رمق سے آپ کو آشنا کر دیں۔ لیکن اپنے سینہ کی بیش بہا کائنات میں آپ کو حصہ دار بنانے کے باوجود آپ کی دولت ——— جو آپ کی ہے اور ہی چاہیئے ——— کے حقدار بننا نہیں چاہتے وہ چاہتے ہیں کہ آپ ان کے جائز مطالبات سمجھ کر اپنے مشوروں تجربوں اور امداد ——— جو آپ کے احاطہ امکان میں ہو اس سے گریز نہ کریں۔

قوم کے نوجوانوں کو چار گروپ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے وہ نوجوان جنہوں نے تعلیم حاصل کی یا نہیں کی اور اپنے بزرگوں کے کاروبار میں شامل ہو گئے وہ نوجوان جن کی آمدنی ان کے اخراجات سے کافی زیادہ ہے وہ ان الجھنوں میں پڑنا نہیں چاہتے اور بے حقیقت سنگریزہ کی طرح زمانہ کی ٹھوکروں سے ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ ان دو گروپ کے بارے میں کچھ لکھنا اس وقت بیکار ہے تیسرا گروپ ان نوجوانوں کا ہے۔ جن کے پاس کاروبار میں لگانے کے لئے سرمایہ اور کاروبار کو وسعت دینے کی صلاحیت بھی ہے یہ گروپ صرف مشورہ اور امداد کا طالب ہے۔ اس کے بعد ترقی کی راہیں اور ارتقا کے منازل دیکھنے اور طے کرنے کے لئے دوربین نگاہیں اور عزم راسخ اس کو قدرت نے ودیعت کیا ہے ہماری برادری کے اکابرین جو آج عظیم الشان فرموں اور بڑی بڑی صنعتوں کے مالک ہیں۔ اپنی تھوڑی سی توجہ صرف کر کے ان نوجوانوں کو برسر روزگار کر سکتے ہیں۔ ان اکابرین کے ذہن میں مختلف کاروباری لائینوں کے خاکے ہر وقت اور ہمیشہ موجود رہتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ متعلقہ افسران اور دیگر لوگوں سے ربط ضبط بھی ہوتا ہے لیکن وہ اپنے کاروبار سے اتنی فرصت نہیں پاتے۔ کہ دیگر چیزوں کی طرف اپنا ذہن رجوع کر سکیں۔ چنانچہ برادری کی فلاح اور بہتری کے خیال کے پیش نظر وہ چند نوجوانوں کو اپنے زاویہ نگاہ کے مطابق منتخب کر کے ان تجارتی لائینوں پر لگا سکتے ہیں۔ جو ان کے ذہن میں موجود رہتی ہیں یہ درست ہے کہ کہنے اور کرنے میں زبردست فرق ہوتا ہے لیکن اس گروپ کی رہنمائی اور امداد بہت سی الجھنوں اور قباحتوں سے پاک ہے علاوہ ازیں ادائیگی فرض میں اگرچہ رکاوٹیں اور الجھنیں بھی ہوں۔ تو انسانیت۔ شرافت۔ مذہب۔ اخلاق غرض ہر ایک رعیات ہم سے تھوڑی قربانی ضرور مانگتی ہے اور اگر ہم میں کچھ احساس بھی باقی ہے تو یقیناً ہم اس سے گریز نہیں کریں گے یہ میرا خیال ہے آپ اور ہر شخص اس سے مختلف بھی سوچ سکتا ہے ——— لیکن اگر واقعی کوئی ایمانداری سے سوچے تو شاید اس سے مختلف نتیجہ برآمد نہیں کر سکے گا۔

چوتھا گروپ ان نوجوانوں کا ہے۔ جن کے پاس ہمت اور تعلیم کے علاوہ پنجابی برادری کا فرد ہونے کے سبب صرف یہ حق اور ہے کہ وہ امداد اور توجہ کے لئے اکابرین کی جانب دیکھیں ——— اس طبقہ کے رہنمائی اور امداد میں چند قباحتیں اور جزوی مسائل ایسے ہیں۔ جن پر کافی سوچ بچار کی ضرورت ہے نہ صرف یہ گروپ بلکہ اس تمام موضوع پر ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور اگر برادری

کے افراد نے اس کی اہمیت محسوس کی اور ادارہ سے تعاون کیا تو انشاء اللہ بہترین مقالات شائع کئے جائیں گے۔ فی الحال ادارہ آپ کی رائے کا طالب اور منتظر ہے امید ہے اس مرتبہ ناظرین گزٹ اظہار رائے میں بخل سے کام نہیں لیں گے

پائندہ باد پاکستان زندہ باد قائد اعظم

ہندوستان ایک سیاسی اسٹیج ہے جس پر ہر شخص بغیر کسی امتیاز کے ہیرو اور ریشیو کا پارٹ ادا کر سکتا ہے۔ مقرر۔ پیر مولوی مہاتما کسی کی تخصیص نہیں ہے جو عوام پر تقریر کے ذریعہ اثر ڈال سکے وہ بھی رہنما سمجھا جاتا ہے اور جو ہر قسم کی صلاحیت سے بے بہرہ ہونے کے باوجود آسمانی دنیا کے عذاب و ثواب سے ڈرا دھمکا کر اپنا گرویدہ بنا سکے وہ بھی لیڈر گنا جاتا ہے۔ سیاست کے اعتبار سے ہندوستان ایک گنبد بے در ہے جس کے باہر چوکیدار ہے نہ "یہ راستہ شارع عام نہیں ہے" کا بورڈ ہی آویزاں کیا گیا ہے جب کیبنٹ مشن ہندوستان آیا اور ملک کی سیاسی جماعتوں سے تبادلہ خیالات کا پروگرام مرتب کیا گیا تو چند ایسے لوگ بھی ان میں شامل تھے کہ اگر حالات کے بنا پر وہ خود نہیں جا سکتے تھے تو دوسرے کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر ہی اندر پہنچ گئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندو مسلمان کی قسمت کا فیصلہ نہیں بلکہ مختلف سیاسی جوکروں اور ان کی جماعتوں کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے اگر کوئی انگریزی میں گفتگو نہیں کر سکتا تو مترجم کے ذریعہ ہی اس فرض کو ادا کیا گیا اگر مشن مختلف آدمیوں کو وقت نہیں دے سکتا تو تین تین اور چار چار کی ٹولیاں بنا کر بلا فائیں کی گئیں۔ اور یہ سلسلہ اس وقت جاری رہا کہ کیبنٹ مشن نے ملک کی سبھی نمائندہ جماعتوں اور ان کے قائدین کو بلا کر یہ قصہ ختم کر دیا

آپس کا فیصلہ اور باہمی مفاہمت جیسا کے خیال تھا نہ ہو سکی اور مشن نے اپنی "سفارشات" ملک سامنے پیش کر دیں جس میں پاکستان کو رد کرتے ہوئے وہ تمام اگل دیا۔ جو مختلف طرفوں سے ان کے ذہن میں اتار گیا تھا لیکن اس ساتھ ہی وہ مجھ بھی نہ دیا جس سے ملک کی دوسری جماعت یا ہندو قوم ہی شاد کام ہو جاتی۔ مشن کے نشریہ کے بعد ہندوستان کے اس کونہ سے اس کونے تک تمام ہندو پریس خوشی کے مارے بے حال ہو گیا۔ خوشی اس امر کی تھی کہ ہندوستان آزاد نہ ہوا تھا سے کم از کم پاکستان کا مطالبہ تو نامنظور کر دیا گیا۔

لیکن جس وقت ملک کے طول و عرض میں یہ ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی۔ اس وقت مسلم قوم انتہائی ضبط اور تحمل کے ساتھ اپنے اس قائد اعظم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو موافق اور مخالف ہر دو حالات میں قوم کی قیادت کرنی جانتا ہے۔ بحر ذہانت کا شناور اور حب قوم کا یہ پیراک انتہائی انہماک سے تمام حالات کا گہرا مطالعہ کرتا رہا ——— دن بیتتے گئے مہاتما گاندھی نے جن کا نعرہ "ہندوستان چھوڑ دو" تھا مشن کی شان میں قصیدہ خوانی شروع کر دی کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس یہ ظاہر کرتا تھا کہ مشن کی سفارشات پر لبیک کہہ دیا جائیگا۔ لیکن اس کے باوجود نہ مسلم قوم نے سراسیمگی کا اظہار کیا اور نہ بدولت و فطانت کے پرانے غواص نے حالات و واقعات کے خوفناک ریلے سے گھبرا کر اپنے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑے ——— آخر شملہ کی برفانی چوٹیوں سے دانائے راز سیاست قائد اعظم جناح کا پیغام پہنچا کر "پاکستان ہی تمام مشکلات کا حل ہے" یہ ہے سیاست جس میں تعصب اور ہٹ دھرمی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے وہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی ہماری مانگ غلط ہے اتنے عرصہ کے سوچے ہوئے

حل کو پھر سوچا لیکن غور و فکر کے بعد یہی نتیجہ مرتب ہوا کہ دنیا کچھ بھی کہے ہندوستان کی الجھی ہوئی حالت اور مسلمانوں کی فلاح

"پاکستان ہی تمام مشکلات کا حل ہے"

اس اعلان باوجود نمائندے مسلم قوم کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں سونپ دیا لوگ کہتے ہیں۔ جناح آمر ہے ڈکٹیٹر ہے۔ جو حکم دینا جانتا ہے سننا نہیں بلکہ آج کے حالات بتا رہے ہیں کہ جناح عوام کا نمائندہ ہے جو سننا جانتا ہے رہنمائی کرنا جانتا ہے حکم دینا نہیں۔ جناح نے یہ نہیں کہا کہ ہمارے پاس اس کے سوا دوسرا چارہ نہیں کہ ہم مشن کی سفارشات کو مان لیں۔ لیکن گاندھی بار بار ہریجن میں نوٹ لکھ رہے ہیں کہ ہمارے لیے بہترین صورت یہ ہے کہ مشن کی سفارشات کو مان لیں۔ کل تک مہاتما جی کے بقول انگریز ہندوستان کی آزادی کا خواہاں نہ تھا۔ لیکن آج جبکہ مسلم مفاد پر ضرب پڑتی نظر آ رہی ہے تو یہ انگریز قوم اور اس کی پارلیمنٹ کے بھیجے ہوئے مشن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ:۔

"مشن اتنی دور سے اس لیے نہیں آیا کہ ہمارے اختلافات سے فائدہ اٹھائے"

لیکن سوال یہ نہیں کہ وہ اس لیے آیا تھا۔ نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ اس نے ہمارے اختلافات سے فائدہ اٹھایا یا نہیں؟ لیکن مہاتما گاندھی اس سوال کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس کا جواب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ انھوں نے فائدہ اٹھایا اور کانگریس نے جناح کے اس ہاتھ کو جھٹک دیا جو ملک اور قوم کی محبت سے مجبور ہو کر ان سے مفاہمت کیلئے بڑھایا تھا۔

مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی اور کونسل مشن کی سفارشات کے متعلق کیا فیصلہ کریگی۔ ہم اس کے متعلق رائے زنی کرنا نہیں چاہتے اور ڈسپلن کے تحت نہ اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں لیکن ایک چیز یقینی ہے کہ:

ہمارا فیصلہ وہ ہوگا جو ہماری جماعت کا ہوگا۔ (پائندہ باد پاکستان زندہ باد قائد اعظم)

اشارات

سلطان احمد

ہمارے گردوپیش میں آئے دن بڑے دھوم دھڑکوں کے ساتھ بے شمار شادیاں رچائی جاتی ہیں ــــ "شادی" کے لغوی معنی ہیں۔ ایک ازلی خوشی ــ ایک پائیدار امن ــ ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر رشتے ایک ہی افسوسناک انجام پر ختم ہوتے ہیں ــ گھر بگڑتے ہیں جو گھروں کو جہنم بنا دیتے ہیں۔ اور ان کا بنیادی سبب چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن کی اگرچہ کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ مگر زبردستی اہمیت دے کر انہیں کچھ نہ کچھ بنا دیا جاتا ہے۔

"شادی" ــ کس قدر خوش آئند تخیل ہے! اس لفظ سے ہی ہمارے دماغوں میں کچھ عجیب سے تاثرات ہوتے ہیں۔ ہم کبھی اس سلسلے میں سنجیدگی سے سوچنا پسند نہیں کرتے اور جب ہم اس مرحلے سے دوچار ہوتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ایک کھیل ہے ــ اپنے بچپن میں ریت والی سے ننھے ننھے گھروندے کس نے نہیں بنائے؟ جب کھیلتے کھیلتے جی بھر گیا تو کیسے مزے سے انہیں توڑ پھینکا ــ بس کچھ ایسا ہی ہم یہاں بھی سوچتے ہیں۔ دولہا سوچتا ہے کہ چلو کھیلنے کو ایک خوبصورت کھلونا ہاتھ آیا۔ جب تک جی نہیں بھرتا اپنا ہی ہے جب جی چاہیں گے فرش پر دے ماریں گے ــ دلہن سوچتی ہے کہ میکے کی روکھی سوکھی اور یکساں زندگی نے کروٹ لی اور یہ بہت کچھ ہے ــ اور رہ ہی کون جاتا ہے جو یہ سوچے کہ شادی کا حقیقی مقصد کیا ہے؟ ــ اور اس طرح جب ہم اپنی گھریلو زندگی کی ابتدا کرتے ہیں تو ہمارے سامنے کوئی واضح مقصد نہیں ہوتا ــ کوئی راستہ متعین نہیں ہوتا ــ اور ہم یونہی منہ اٹھائے بے مقصد اور بے ارادہ الجھی ہوئی پگڈنڈیوں پر ہو لیتے ہیں ــ ہم سمجھتے ہیں کہ جنسی جذبہ کی تسکین ہی کا دوسرا نام شادی ہے ــ جوانی اندھی بھی ہوتی ہے اور دیوانی بھی ــ ہم عورتوں کو بچے جننے کی ایک مشین سمجھ لیتے ہیں ــ ایک ایسی مشین جس میں اکنی ڈالی اور کھٹ سے ایک کارڈ نکل آیا ــ اپنی نفسانی خواہشات اور جنسی بھوک کو جسے ہم ایک عرصہ سے دبائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یوں پورا ہوتے دیکھ کر ہم پاگل ہو اٹھتے ہیں۔ اور پاگلوں کے لئے آہنی زنجیریں بھی بیکار ہیں ــ ہمارے سامنے کوئی مقصد نہ ہو۔ اور ہماری نظریں اس دیوار سے آگے دیکھ ہی نہ سکیں تو کیونکر امید کی جاسکے کہ ہماری زندگی ایک کامیاب زندگی ہو اور بامعنی۔

جب کچھ مقدس بول پڑھ کر ایک مرد اور ایک عورت کو جو اب سے پہلے ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ ایک غیر مرئی مگر مضبوط بندھن میں جکڑ دیا جاتا ہے ــ اسی وقت انہیں محسوس کرنا چاہیئے کہ ان کے کاندھوں پر کچھ عظیم ذمہ داریاں آپڑی ہیں جنہیں تاحیات نبھانا ہوگا۔ ایک عورت اور ایک مرد کے اشتراک سے ایک گھر کی بنیاد پڑتی ہے ــ بچے پیدا ہوتے ہیں ــ وہ چلتے اور بڑھتے ہیں اور ہماری ذمہ داریاں بدستور قائم ہیں اپنے گھر کو پر امن رکھنے، سچے اور اچھے شہری بننے، اپنی اولاد کو صحیح تربیت دینے، انہیں تندرست جسم اور تندرست خیالات کا مالک بنانے، ان کا مستقبل تعمیر کرنے، ان کے لئے ترقی کے راستے ہموار کرنے، تعلیم و تربیت سے مزین کرنے کا تمام ذمہ داری مرد اور عورت پر یکساں ہے۔ انہیں چاہیئے کہ معمولی معمولی جھگڑوں، فروعی باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے ان بنیادی باتوں پر توجہ دیں اور ہاتھوں میں ہاتھ [illegible] یہی ترقی کا راستہ ہے [illegible] خوشحالی کا راستہ ہے

عمر الٰہی

انقلاب ۱۸۵۷ء

۴ مئی ۱۷۹۹ء کو ہندوستان اور ہندوستانی قوموں کی آزادی کے سب سے بڑے علمبردار اور سب سے پہلے مجاہد ٹیپو سلطان کے مقدس جسم کو سرنگا پٹم کی خاک میں دفن کر دیا گیا۔ جنرل ہارس کو جب سلطان کی شہادت کی خبر پہنچائی گئی تو وہ خوشی سے چلا اٹھا۔

"آج ہندوستان ہمارا ہے۔"

غیر ملکی غاصبوں کا سب سے بڑا خطرہ دور ہو چکا تھا۔ ٹیپو کی شہادت کے بعد نصف صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں نے ہندوستان کی آزاد ریاستوں کے ایک ایک کر کے تخت الٹ دیئے۔ مرہٹہ قوت کو منتشر کیا۔ اور پورے اودھ، نیپال، سندھ، پنجاب اور برما کے ایک حصے پر بربریت کا علم لہرا دیا۔ ان فتوحات کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ رسوا کن سلوک شروع کر دیا۔ سر رابرٹس نے جو خطوط دوران انقلاب ۱۸۵۷ء میں لکھے ہیں اس میں ایک جگہ اپنے مقصد کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ:۔

"ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ
خدا کے حکم سے اب صرف انگریز ہی ہندوستان
پر حکومت کریں گے۔"

انگریزوں کی طرف سے نہ صرف ہندوستان کی سیاسی زندگی میں انتشار پیدا کیا گیا بلکہ سماجی زندگی میں بھی نئے نئے الجھاؤ پیدا کئے گئے۔ سر میلکم لوئن جج ہائی کورٹ ممبر مدراس کونسل نے ایک رسالہ میں لندن سے لکھا تھا۔

"ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا۔ انکے قانون وراثت کو منسوخ کر دیا۔ بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا۔ مذہبی رسم و رواج کی توہین کی عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کر لیں، لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا۔ انہیں تکلیفیں دیکر مال گذاری وصول کی سب سے اونچے خاندانوں کو برباد کر کے انہیں آوارہ گرد بنا دینے کے بندوبست قائم کئے۔"

ہندوستان کے صوبوں کے عوام انگریزوں سے بدظن تھے۔ راجوں اور نوابوں کے علاوہ صرف ایک جماعت کمپنی کے حق میں تھی۔ یہ جماعت ان لوگوں پر مشتمل تھی جس نے شہروں میں انگریزی مال کی کھپت کے لئے دوکانیں کھول رکھی تھیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ترقی کی تمام راہیں بند تھیں بغاوت کے نشان ہر طرف موجود تھے۔ لیکن کمپنی کی آنکھیں اُسے نہ دیکھ سکتی تھیں۔

اودھ پر تسلط جما لینے سے بنگال آرمی کے دیسی سپاہی بگڑ چکے تھے۔ دیسی سپاہیوں نے انگریز افسروں کا حکم ماننا ترک کر دیا تھا، نہ صرف بنگال آرمی بلکہ بنگال کی فوجوں آسام اور ملحقہ صوبوں کے دیسی سپاہیوں میں بغاوت کے جذبات ابھرے ہوئے تھے۔ بے چینی

سب سے پہلے ۲۲ جنوری ۱۸۵۷ء کو ڈم ڈم میں ظاہر ہوئی۔ سپاہیوں نے کہا کہ انفلیڈ رائفلوں کے لئے جو کارتوس بنائے جاتے ہیں۔ ان میں گائے اور سور کی چربی ہے۔ افسر نے حکومت کو اس بات سے آگاہ کیا۔ حکومت نے بعض چھاونیوں میں سپاہیوں کو یقین دلایا کہ کارتوس میں ممنوعات استعمال نہیں کی جارہی ہیں۔ یہ بات بارود کی طرح دوسری رجمنٹوں میں بھی پھیل گئی۔ بیرک پور کے فوجیوں نے بہرام پور کی ۱۹ ویں رجمنٹ میں بے چینی کا بیج بو دیا۔ اور ۱۹ فروری کی رات کو فوجیوں نے مظاہرہ شروع کر دیا۔ اور ۳۴ ویں رجمنٹ کی پریڈ کے وقت "دین، دین" کا نعرہ لگاکر فوجیوں کو فرنگیوں کے خلاف لڑنے کی دعوت دی۔ سرجنٹ میجر موقع پر پہونچ گیا۔ منگل پانڈے نے اس پر گولی چلا دی۔ سرجنٹ بچ گیا بغاوت کے آثار پاکر جنرل ہیری موقعہ پر پہنچا۔ بغاوت پر قابو پالیا گیا۔ اگلے دن گورنر جنرل کا فرمان سنایا گیا انیسویں رجمنٹ توڑ دی گئی اور منگل پانڈے کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ بنگال کی فوجی بغاوت کی خبریں مبالغہ آمیزی کے ساتھ شمالی ہندوستان میں پہنچ رہی تھیں اور یہاں بغاوت کے آثار نمایاں تھے۔ اپریل کے آخری ہفتہ میں میرٹھ کے ہندوستانی سپاہیوں نے مختلف طرح بے چینی کا اظہار کیا۔ ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو فوجی پولیس کی حراست میں ۸۵ ہندوستانی سواروں کو لایا گیا۔ اور بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔ اور چھ سال سے دس سال تک کی سزائیں دی گئیں ساری فوج کے سامنے ان کی وردیاں پیچھے سے پھاڑی گئیں لوہے کی بھاری بیڑیاں ان کے پیروں میں ڈالدی گئیں یہ نظارہ انتہائی ذلت آمیز تھا۔ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے سپاہیوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور اس ذلت کو خاموشی سے برداشت کر لینے پر آنکھوں آنکھوں میں انھیں شرمندہ کیا۔ لیکن بھری ہوئی توپوں اور بندوقوں کی موجودگی میں بغاوت کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

جب سپاہی اپنی بارکوں میں گئے تو نفرت اور جوش کا ان پر غلبہ تھا۔ انھوں نے بغاوت کا ارادہ کر لیا ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو دیسی سپاہیوں نے بارکوں میں آگ لگا دی اور بغاوت کا اعلان کر دیا کرنل فینی سپاہیوں کو ان کا "فرض" یاد دلانے کیلئے آگے بڑھا۔ لیکن ایک سنسناتی ہوئی گولی نے کرنل کو ختم کر دیا۔ جو بھی انگریز افسر آگے بڑھا گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

باغی سپاہی دو ٹولیوں میں تقسیم ہوگئے ایک چھاونی کو آگ لگانے کی طرف متوجہ ہوئی اور دوسری میرٹھ جیل جا پہنچی۔ جیل کے دروازے توڑ دیئے گئے ۸۵ سواروں کو جیل سے باہر نکالا گیا بارہ سو قیدی ان کے ساتھ شامل ہوگئے انھوں نے پہلے چھاونی کی طرف رخ کیا۔ پھر دلی کی طرف چل دیئے انگریزوں نے ان کا تعاقب نہ کیا۔ البتہ جو زخمی سپاہی دہلی نہ جا سکتے تھے ان کو گرفتار کر کے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

میرٹھ کے دیسی سپاہیوں کی بغاوت کی خبر جب لاہور پہنچی تو وہاں بھی بغاوت کے آثار نمایاں ہوئے۔ انگریز حکام نے بغاوت کو دبانے کے لئے فیصلہ کیا کہ میاں میر کی چھاونی کے سپاہیوں سے

ہتھیار چھین لئے جائیں۔ پرکاش سنگھ کی رہنمائی میں علم بغاوت بلند ہوا۔ میجر سپنسر کو قتل کر دیا گیا۔ باغی سپاہی بھاگ نکلے۔ باغی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد راوی پار ایک ٹاپو میں اتر پڑی۔ انگریز تعاقب کر رہے تھے۔ ۲۸۲ گرفتار کر لئے گئے اور اتیالہ جیل میں مقید کر دئے گئے۔ اگلے دن عید تھی مسلمان پلٹن کو عید منانے کے لئے امرتسر بھیج دیا گیا۔ دوسرے دن صبح کو سنتریوں نے لوگوں کا ہجوم اس طرف آنے سے روکا۔ باغی دس دس کی تعداد میں نکالے جاتے اور گولیوں کا نشانہ بنائے جاتے۔ جب ۱۵۰ قتل کئے جا چکے تو ایک "جلاد" بے ہوش ہوگیا۔ چنانچہ جلادوں کو آرام کرنے کے لئے وقفہ دیا گیا۔ آرام کے بعد پھر قتل شروع ہوا۔ جب ۲۳۷ مارے جا چکے تو اطلاع ملی کہ باقی ماندہ سپاہی برج سے باہر نکلنے سے انکار کر رہے ہیں۔ دروازے کھولے گئے۔ وہ سب تقریباً مر چکے تھے ۴۵ نعشوں کو باہر نکالا گیا۔ اور دوسرے باغیوں کی نعشوں کے ساتھ ایک گڑھے میں دفن کر دیا گیا۔

میاں میر کے علاوہ پنجاب اور صوبہ سرحد کے کئی مقامات پر بغاوت کے شعلے بلند ہوئے۔ دلی اور فیروز پور کا درمیانی علاقہ سب سے زیادہ متأثر ہوا۔

میرٹھ کے باغی سپاہی جو دو گھنٹہ کے اندر اندر دلی پہنچ گئے تھے۔ ۱۱ مئی کی صبح کو راج گھاٹ کا دروازہ ان پر کھل گیا۔ دلی میں مقیم انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں نے جب باغیوں کے آنے کی خبر سنی تو انھوں نے انگریزی افسروں کو قتل کر کے بہادر شاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بہادر شاہ بساط سیاست کا مفلوج مہرہ جو نہ بادشاہت کی صلاحیت رکھتا تھا نہ انگریزوں کی مخالفت کی۔ بہادر شاہ نے اس نئی بادشاہت کے قبول کرنے میں پس و پیش کیا۔ باغیوں نے بے پرواہ ہوکر کہا "اگر یہ بڈھا نہیں مانتا تو نہ مانے ہم جس کے سر پر جوتا رکھدیں گے وہی بادشاہ ہوجائیگا۔"

دلی اور میرٹھ کے باغی سپاہی شہر میں داخل ہوئے اور کشمیری دروازہ کے انگریزی میگزین کی طرف بڑھے۔ انگریز افسر نے آگ لگا دی۔ خوفناک دھماکہ ہوا۔ کشمیری دروازے کی دیسی فوج جو ابھی تک انگریزوں کا ساتھ دے رہی تھی وہ بھی باغی سپاہیوں سے جا ملی شام تک پوری دلی پر قبضہ تھا۔

۱۱ مئی سے ۱۴ ستمبر تک باغیوں کا دلی پر قبضہ رہا۔ اس زمانہ میں انھوں نے عوام اور مسلح قوتوں کے درمیان تال میل قائم نہیں کیا۔ انھوں نے حریت و مساوات کے نعروں سے لوگوں کے دلوں کو نہیں گرمایا۔ انھوں نے اکثر اپنے بڑے مقصد کو پس پشت ڈال دیا۔

دلی پر انگریزوں کی یلغار شروع ہو چکی تھی۔ اور پنجاب سے سر لارنس انگریزی فوج کی مدد کے لئے اسلحہ اور سپاہی بھیج رہا تھا۔ ادھر مرشدآباد۔ بریلی۔ اور شاہجہاں پور سے دیسی سپاہیوں کے باغی دستے دہلی میں داخل ہو رہے تھے۔ انگریزی فوج کی کمان جنرل ولسن کے ہاتھ میں تھی۔ اور ہندوستانی باغی سپاہیوں کی رہنمائی بخت خان جیسا قابل جنرل کر رہا تھا۔ دن رات لڑائی جاری تھی۔ اور انگریز فوج کو کئی بار شکست ہوئی تھی ۱۱ ستمبر کو انگریزی توپیں اہم مقامات پر نصب کر دی گئیں ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ ستمبر تو دہلی پر گولے برستے رہے۔ باغیوں نے اس موقعہ پر بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ انھوں نے

فصیل میں بڑے بڑے شگاف کر کے ہر انگریزی توپخانہ کے سامنے ایک توپ نصب کر دی۔

۱۴ ستمبر کو کشمیری دروازہ کی فصیل میں شگاف ہو گئے۔ جنرل نکلسن نے فوجیوں کو اجمیری دروازہ اور کابلی دروازہ سے دلی میں داخل ہونے کا حکم دیا سر جیلو فیس مٹکاف کی فوج جامع مسجد تک پہنچ گئی تمام نمازیوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ انگریزی فوج جامع مسجد کو گرانے کے لئے جمع ہو رہی ہے۔ ہجوم نے تلواروں سے مسلح ہو کر حملہ کر دیا۔ انگریزی فوج نے گولی چلادی لیکن ہجوم مرتا لڑتا آگے بڑھتا چلا گیا۔ آخر انگریزی فوج کشمیری دروازہ کی طرف بھاگ نکلی۔

۱۴ ستمبر کو اگرچہ انگریزی فوج شہر میں داخل ہو چکی تھی لیکن چار دن تک دلی کے بازاروں اور گلی کوچوں میں لڑائی ہوتی رہی ۱۹ ستمبر کو انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

بخت خاں نے بہادر شاہ کو لال قلعہ سے ہمایوں کے مقبرہ اور وہاں سے اپنے ساتھ لیجانے کی کوشش کی تاکہ اس کے گرد فوج جمع کر کے دلی پر حملہ کیا جائے۔ لیکن انگریز الٰہی بخش کے ذریعہ پٹھان اور مغل اقتدار کے نام پر بہادر شاہ کو باغیوں سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور بہادر شاہ نے جسمانی کمزوری کا عذر کر کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا بخت خاں ہمایوں کے مقبرہ کے مشرقی دروازہ سے نکلکر اپنی فوج لے کر ایسا غائب ہوا کہ پھر اس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ الٰہی بخش نے میجر ہڈسن کو حالات سے آگاہ کیا۔ وہ پچاس سپاہیوں کا دستہ لے کر دلی کے بادشاہ کو گرفتار کرنے کے لئے ہمایوں کے مقبرہ میں داخل ہوا۔ اور وہ بادشاہ جواں بخت اور زینت محل کو جان بخشی کے وعدے کے ساتھ گرفتار کر لیا۔ اور زینت محل کے مکان میں بادشاہ کو قید کر دیا۔

جنرل ہڈسن کو بتایا گیا کہ بہادر شاہ کے دو بیٹے مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان اور ایک پوتا ابوبکر جو باغیوں کے لیڈر تھے ابھی تک ہمایوں کے مقبرہ میں مقیم ہیں۔ چنانچہ اگلے دن ایک سو سواروں کو ساتھ لے کر ہڈسن ہمایوں کے مقبرہ پہنچا اور شہزادوں کو حراست میں لے لیا۔ اور دلی دروازے کے قریب تینوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ شہزادے تڑپے اور مر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ہڈسن نے ان شہزادوں کا خون پیا تھا۔ لاشوں کو کوتوالی پر لٹکا دیا گیا۔ ان کے سر تن سے جدا کر کے ہڈسن نے بطور نذرانہ بادشاہ کے حضور میں پیش کئے۔

جنرل نکلسن نے یہ خواہش ظاہر کی کہ انگریزوں کے قاتلوں کے خلاف ایک ایسا قانون بنایا جائے جس کی رو سے ہم انھیں زندہ جلا سکیں یا گرم سلاخوں سے اذیت دیکر انھیں ہلاک کر سکیں۔ اس نے کہا کاش میں دنیا کے کسی ایسے دور افتادہ گوشے میں جا سکوں جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں اپنی مرضی کے مطابق انتقام لیکر اپنے دل کی بھڑاس نکال سکوں نکلسن کی اس خواہش میں موت حائل ہو گئی لیکن اسکے ساتھیوں نے اسے پورا کر دیا۔

ٹائمز آف انڈیا کے اڈیٹر نے اپنی ڈائری ۱۸۵۷ء،۵۸ء میں لکھا ہے۔

"زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا۔ یا

پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا۔" یہ سفاکانہ مظالم دیکھ کر "ہماری گردنیں شرم اور ندامت سے جھک جاتی ہیں یقیناً یہ حرکات عیسائیت کے لئے ایک بدنما دھبہ ہیں۔"

دہلی میں انگریزی فوج نے قتل عام شروع کر دیا۔ جو مرد نظر آیا موت کے گھاٹ اتار دیا گیا انگریز سپاہی کوچہ چیلان میں حکیم فتح اللہ خاں کے مکان میں گھس گئے۔ ان کی نیت ظاہر تھی۔ حکیم فتح اللہ خاں نے آگے بڑھتے ہوئے سپاہی کو زخمی کر دیا۔ اسپر انگریزی فوج کے افسر اعلیٰ کے حکم سے کوچہ چیلان کے تمام مردوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ تڑپ تڑپ کر مرنے والوں میں بہترین ادیب اور فن کار بھی تھے۔

خاک خون میں لپٹے ہوئے شہریوں کا نظارہ فاتح قوم کے سپاہیوں کے لئے ایک کھیل تھا۔ حینٹ رابرٹس نے اس نظارہ کو اس طرح پیش کیا ہے

"ہم لاہوری دروازہ سے ہوتے ہوئے چاندنی چوک گئے۔ تو دلی ہم کو مردوں کا شہر دکھائی دیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ ہمارے گھوڑے کی ٹاپوں سے یہ خاموشی ٹوٹ گئی۔ ہم کسی زندہ انسان کی صورت کو نہ دیکھ سکے۔ ہر طرف مردے ہی مردے تھے زمین مردوں کا بچھونا بنی ہوئی تھی۔ چلتے وقت ہم آہستہ آہستہ باتیں کرتے۔ ڈر تھا کہ کہیں ہماری آواز سے مردے نہ چونک پڑیں۔ ایک طرف نعشوں کو کتے کھا رہے تھے دوسری طرف گدھ انھیں نوچ رہے تھے۔ بعض مردوں کے ہاتھ اوپر کو اٹھے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کو اشارہ کر رہے ہیں۔"

چاندنی چوک کی کوتوالی کے سامنے ایک حوض کے تین طرف پھانسیاں دی جاتی تھیں۔ ایک طرف (انگریز) تماشائیوں کے لئے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ تیسرے پہر کو ادھر بینڈ بجتا ادھر لال قلعے سے مجرموں کی قطار روانہ ہوتی۔ ان کے ہاتھ پیٹھ کی طرف بندھے ہوتے تھے۔ ان میں سے آدھے پھانسی پر لٹکا دیئے جاتے اور آدھے موت کے انتظار میں کھڑے رہتے

مسٹر کوپلینڈ نے اپنی ۱۳ ستمبر کی چٹھی میں لکھا ہے

"خونریزی کے عادی سپاہیوں نے جوش انتقام کو فرو کرنے کے لئے جلادوں کو رشوت دیکر آمادہ کیا ہوا تھا کہ مجرم کو زیادہ دیر تک پھانسی کے تختے پر لٹکے رہنے دیا جائے۔ تاکہ لاش تڑپنے کی کیفیت دیکھ کر جسے وہ ناچ سے تشبیہ دیتے تھے اپنی خونخوار طبائع کی تسکین کا سامان بنا سکیں۔"

میرٹھ اور دہلی کے واقعات نے دوسرے مقامات پر بھی اثر کیا۔ یہ اثر بعض مقامات پر طوفان کی ایک آدھ لہر سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن سر ولیم میور کے الفاظ میں "فوجیوں کی یہ بغاوت اودھ میں پہونچ کر قومی جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔"

۶ جون کو الہ آباد میں دیسی سپاہیوں نے بغاوت کر دی انگریز افسروں کو قتل کر دیا۔ سٹیشن اور ٹیلیگراف دفتروں کو آگ لگا دی اور آگے روانہ ہو گئے ۱۱ جون کو کرنل نیل نے الہ آباد پر قبضہ کر لیا اور باغی شہریوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔

مورخ کیٹی نے تسلیم کیا ہے کہ:

"تنہا الہ آباد کے علاقہ میں نیل نے اتنے ہندستانیوں کو مروا ڈالا جتنے انگریز ہندوستان بھر میں ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے سارے ہنگامے میں انقلابیوں کے ہاتھ سے انقلاب کی وجہ سے نہیں مرے۔"

[illegible] نے لکھا ہے:-

" بوڑھے [illegible] سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ان سے اور بے بس عورتوں سے جن کی گود میں [illegible] دودھ پیتے بچے تھے۔ ہم نے اس طرح بدلہ لیا جس طرح بڑے بڑے باغیوں سے "

مئی کے مہینے میں کانپور کی دیسی فوجیں بے چینی کا اظہار کرتی رہیں ۵ جون کو انھوں نے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ چھاؤنی کو آگ لگا دی۔ خزانے کے محافظ سپاہی بھی باغیوں کی صف میں کھڑے ہوگئے باغیوں نے ایک لاکھ ستر ہزار پونڈ ہاتھیوں اور چھکڑوں پر لاد کر دلی جانے کا ارادہ کیا۔

کرنل نیل نے میجر رینالڈ اور جنرل ویلر کی کمان میں کانپور فوج بھیجی۔ رینالڈ کو قدم قدم پر مشکلوں کا سامنا تھا۔ اودھ کی ساری آبادی باغی ہوگئی تھی آخر جنرل ہولاک کی کمان میں ایک اور فوج بھیجی گئی نانا صاحب نے کانپور سے ۱۶ میل آگے بڑھ کر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ کرنل نیل کانپور پہنچا۔ انگریز مقتولین کا انتقام لیا۔ ہولاک کو لکھنؤ روانہ کیا لیکن باغیوں کا بڑھتا ہوا جوش دیکھ کر اسے واپس بھاگنا پڑا

۲۳ اگست ۱۸۵۶ء کو جب کہ انگریزوں نے انتہائی چالاکی اور عیاری سے اودھ پر تسلط جما کر خزانوں پر قبضہ کیا تھا۔ میوزم اور دو لاکھ کتابوں کی ایک عظیم الشان لائبریری اور ادبی خزانے کو ضبط کیا تھا۔ تاتاری گھوڑوں کو نیلام اور بیگمات اودھ کو بے عزتی سے محل سے نکالا اور واجد علی شاہ کو قید کیا تھا۔ ابھی ایک سال کا عرصہ بھی پورا نہ ہوا تھا اودھ کے عوام اور خصوصاً نوجوانوں کے سینے میں نفرت اور غضب کی آگ سلگ رہی تھی۔ اودھ کے گورنر سر لارنس نے جون ۱۸۵۷ء کو کرنل نیل کو اطلاع دی کہ باغیوں نے سیتا پور، شاہجہانپور اور فیض آباد پر قبضہ کر لیا ہے اور لکھنؤ کی طرف بڑھ رہے ہیں" باغی سپاہیوں نے لکھنؤ کو گھیر لیا۔ سارا اودھ انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ سر لارنس نے باغیوں پر حملہ کیا لیکن شکست کھا کر بھاگا۔ باغیوں کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔ لکھنؤ کی محصور انگریزی فوجیں کانپور بھاگ گئیں۔

۱۱ فروری ۱۸۵۸ء کو تازہ دم انگریزی [illegible] کی طرف بڑھی خونریز جنگ ہوئی ۵ [illegible] کے بعد انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ باغی اور روہیلکھنڈ کی طرف پسپا ہوگئے

نانا صاحب کانپور سے بریلی [illegible] کی کمان میں روہیلکھنڈ میں انگریزی فو[illegible] کے لئے تیاریاں مکمل ہوچکیں۔ انگریز[illegible] اور ہر بار شکست کھائی آخر ۲ مئی ۱۸۵۸ء [illegible] باغیوں کو منتشر کرنے میں کامیاب ہو[illegible]

بندیل کھنڈ میں بغاوت کے [illegible] بغاوت کا مرکز جھانسی تھا۔ بغاوت [illegible] شروع ہوئی۔ یہاں انگریزوں نے [illegible] سر ہیو روز کی کمان میں انگریزوں نے جھانسی [illegible] حملہ کیا۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں تانتیا ٹوپی [illegible] کے لئے بڑھا اور وہ بہادری سے لڑ[illegible] کی طرف نکل گیا۔ اس وقت [illegible] تین ہزار مرہٹے اور سات ہزار مسلمان تھے۔ [illegible] کی رانی لکشمی بائی قلعہ کی دیوار سے [illegible]

شکست دیکھ رہی وہ اسی رات اپنے ہمراہیوں سمیت جھانسی سے فرار ہو کر اپنی فوج میں شامل ہو گئی انگریزی فوج جھانسی میں داخل ہوئی اور قتل عام کا بازار گرم کیا باغی گوالیار پہنچے اور سندھیا کو گدی سے اتار دیا۔ انگریزی فوج گوالیار کی طرف بڑھی لکشمی بائی اپنی فوج کی ایک جمعیت لیکر انگریزوں کو راستے میں روکتا۔ اسی جنگ میں یہ ۲۰ سالہ مجاہدہ شہید ہوئی باغی فوج کی مرکزیت ٹوٹ گئی اور اس نے جیپور کی طرف راہ فرار اختیار کی ستمبر ۵۸ء تک باغی [illegible] لڑائیاں لڑتے رہے آخر نانا تا تو پی پکڑا گیا [illegible] کی سزا پائی۔ جس بغاوت کو منگل پانڈے [illegible] ۵۷ء میں شروع کیا تھا۔ نانا تا تو پی [illegible] ستمبر ۵۸ء میں اسے ختم کر دیا۔

۵۷ء کی بغاوت ایک عالمگیر بغاوت ہونے [illegible] ناکام رہی اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ [illegible] باقاعدہ نقشہ کے مطابق [illegible] ہوئی تھی [illegible] بغاوت کا دوسرے مقام کی [illegible] نہیں تھا۔ اس ناکامی کا سبب اسے [illegible] اور [illegible] کہ عوام کو ایک ایسے نظام [illegible] لڑایا جا رہا تھا جو اپنی آخری [illegible] پہنچ چکا تھا۔ جو [illegible] میں آ کر بعض مقامات پر کچھ ایسے کام کئے گئے جو انقلاب پسندوں کے شایان شان نہیں تھے۔ بہادر شاہ کی بادشاہت کا اعلان کرنا بھی ایک بہت بڑی حماقت تھی۔ ۸۲ سال کا وہ بوڑھا جس کی پوری عمر انگریزی خوشامد اور وظیفہ خوری میں گذری ہو ہندوستانی عوام کے حقوق کی حفاظت کا اعلان کیا کر سکتا تھا "انگریزوں کو نکال دو" کا ایک ہنگامی مقصد تھا جس کے ماتحت لاشعور میں اپنی اپنی عظمت اور شخصی راج کا جذبہ کام کر رہا تھا مغل پٹھان [illegible] روہیلہ اور مرہٹوں کے اقتدار کا [illegible] ذہن میں گھوم رہا تھا۔ ایک ہنگامی مقصد نے جن مختلف عناصر کو ایک جا کر دیا تھا۔ ان کا دیر تک ایک ساتھ رہنا ناممکن تھا۔ ہندوستان وطنیت اور قومیت کے تصور سے ناآشنا تھا ہندوستان جن عناصر سے عبارت تھا وہ [illegible] کے مخالف تھے۔ ان سب کو اکٹھا [illegible] ہندوستان کی آزادی کے اعلان" کی ضرورت [illegible] باغی سپاہی اور باغی عوام نہ ان کی حقوق سے واقف تھے اور نہ آزادی کے [illegible] سے آشنا۔

یہی [illegible] کہ اتنی عالمگیر بغاوت ناکام رہی۔

فکرِ تونسوی

مراجعت

محسوس کیا میں نے ستاروں کا تنفس　　معلوم کئے میں نے بہاروں کے دفینے
بادل میں لچکتی ہوئی بوندوں کو ٹٹولا　　روکے ہیں بہکتے ہوئے کرنوں کے سفینے
نوچی ہیں اندھیروں کی الم پوش ردائیں　　چھیڑے ہیں اجالوں کے جھلکتے ہوئے سینے
میں بڑھتا ہی گیا بڑھتا گیا کونین بہ کونین
اور چڑھتا ہی گیا چڑھتا گیا ادراک کے زینے

اور اب کہ مجھے لایا ہے واں جادوئے ایام　　جب مجھ سے مرا ذہن سنبھالا نہیں جاتا
کانٹا سا کھٹکتا ہے خیالوں کی تہوں میں　　جو علم کی پوروں سے نکالا نہیں جاتا
ہونٹوں پہ تڑپ بوسۂ منزل کی ہے لیکن
آگے ہے وہ کہرا جو اُجالا نہیں جاتا

بل کھا کے بڑھتی آتی ہیں تیروں کی لکیریں　　جیسے کسی چھیڑی ہوئی ناگن کا تناؤ
رہ بھی نہیں سکتا انھیں سہ بھی نہیں سکتا　　چوٹیں یہ تفکر کی۔ تدبیر کے یہ گھاؤ
کچھ رہ گیا، کچھ رہ گیا، آغاز سفر میں　　اے ساتھیو، اے آتش و آہن کے خداؤ
کچھ بھی ہو۔ الاؤ، کوئی شعلہ، کوئی دیپک　　اس کہرے کی سیلی ہوئی آنکھوں میں جلاؤ
ورنہ مجھے لے جاؤ انھیں خواب گہوں میں
تھیں دل سے ہم آہنگ جہاں وقت کی سانسیں

طلوعِ اسلام

نظر بر خطبۂ صدارت

راشٹرپتی مولانا ابو الکلام صاحب آزاد

چنیں دَور آسماں کم دیدہ باشد | کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا | پرستد مومن و کافر تراشد

...... مولانا آزاد صاحب کے انتخاب صدارت سے ہمیں ایک خوشی ضرور ہوئی تھی۔ امید یہ کہ اب خدا خدا کر کے وہ صبر آزما سکوت ٹوٹے گا۔ جس نے بیس سال سے یہ کیفیت پیدا کر رکھی تھی کہ

دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

چنانچہ لاہور کی تقریب کے بعد کانگریس کے اجلاس رام گڑھ کی تقریب پر مولانا صاحب کو خطبۂ صدارت سنانا پڑا۔ جس میں ان سے وہ سب کچھ کہلوایا گیا۔ جس کے کہنے سے وہ اب تک پہلوتہی کرتے چلے آ رہے تھے۔ ہم کانگریس کے ارباب بست و کشاد کے رہین کرم ہیں۔ کہ انھوں نے حضرت مولانا کو یہ عزاز عطا فرما کر سادگی و پرکاری کے ان حسین و جمیل نظر فریب پردوں کو اٹھا دیا۔ جن میں مولانا صاحب مدت سے چھپے بیٹھے تھے اور جس کی مصنوعی کاریوں کی بنا پر بیت سے ابلہ فریب حضرات بیچارے سادہ لوح مسلمانوں کو دام تزویر میں پھنسا لیا کرتے تھے۔ اب حقیقت بے نقاب ہو گئی اور کسی کو یہ کہہ کر دجل و تلبیس کا موقع نہ رہا کہ "ہاں حضرت مولانا نے بھی ہم سے تخلیہ کی گفتگو میں یہی فرمایا ہے۔ کہ میرا عقیدہ بھی یہی ہے جو جمہور مسلمانوں کا ہے"! اب پردے اٹھ گئے۔ اب مولانا صاحب کے خیالات کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ کیا یہ کانگریس کے ارباب حل و عقد کا کچھ کم احسان ہے۔

اس خطبہ کو شروع سے اخیر تک دیکھ جائیے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کا نام کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ وہ مولانا آزاد کہ جن کی عہد اسلامی میں یہ حالت تھی۔ کہ ہر دوسرے فقرے کے بعد آیات قرآنی اور ہر تیسرے جملہ کے بعد کوئی حدیث مقدسہ آ جاتی تھی۔ آج ان کی یہ حالت ہے۔ کہ اللہ کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ جھجکتے ہیں۔ اور تو اور خطبۂ صدارت کی ابتدا میں بسم اللہ تک بھی نہیں لکھی گئی۔

انقلابات ہیں زمانے کے

کہہ دیا جائے گا کہ یہ خطبہ چونکہ مختلف مذاہب و ملل کے لوگوں کے اجتماع میں پیش کیا جانا تھا۔ اس لئے اس میں قرآن و حدیث کی ضرورت نہ تھی نہ ہی اس امر کی حاجت کہ اس کا آغاز خدا کے نام سے کیا جاتا۔ کیونکہ اس مجمع میں بہت سے ایسے سامعین بھی تھے جو سرے سے خدا کی ہستی ہی کے منکر ہیں۔ بجا اور درست۔ یہی ہم کہتے ہیں۔ کہ جب ایک مسلمان کو متحدہ قومیت کا چولا پہننا پڑتا ہے۔ تو اسے اپنے اسلامی مقام سے ہٹنا ضرور پڑتا ہے اور مسلمان جب اپنے اصلی مقام سے ہٹا، تو پھر دنیاوی اصطلاح میں وہ کچھ بھی کیوں نہ بن جائے

مسلمان تو باقی نہیں رہتا۔ مسلمان رہے تو اور کچھ نہیں تو آغاز کلام اللہ کے نام سے کرے۔

ہم اشاعت طلوع اسلام کی اس دو سالہ مدت میں متعدد مقامات پر مولانا آزاد کے دَور الہلال کے خیالات کو شرح و بسط سے پیش کر کے بتا چکے ہیں کہ ان کا موجودہ مسلک خود انہی کے سابقہ دور کے الفاظ میں کس قدر اسلام کے خلاف ہے۔ اگر ان تمام اقتباسات کو یکجا جمع کر دیا جائے۔ جو ہم اس ضمن میں متفرق طور پر پیش کرتے رہے ہیں۔ تو وہ ایک ایسا مصفّا آئینہ بن سکتا ہے جس میں حضرت مولانا کے نہج خد و خال نمایاں طور پر نظر آ سکتے ہیں۔ ان اقتباسات کے جواب میں ہمارے اکثر دوستوں نے ہمیں لکھا کہ مولانا ... ان پارینہ داستانوں سے تائب ہو چکے ہیں۔ یہ انسانی خیالات تھے۔ جن میں ہر آن تبدیلی ہو سکتی ہے ہم ان کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے ... صاحب اپنے اس وقت کے خیالات کی تائید میں ہمیشہ کتاب و سنت کی نصوص صریحہ پیش کیا کرتے تھے۔ اور اب موجودہ خیا... جو ان کے عہد اول کے خیالات سے بالکل متضاد واقع ہوئے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی قرآن و حدیث کی سند نہیں لاتے ... مولانا صاحب پر جن حقائق کا اب انکشاف ہوا ہے۔ ان کے پیش نظر وہ اپنے سابقہ اسلامی خیالات کو ... مولانا نے ہماری یہ مشکل حل کر دی۔ اور اپنے اس خطبہ میں واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا۔ کہ میرا مسلک ... کے زمانہ میں تھا۔ فرماتے ہیں

"مجھے معلوم نہیں۔ آپ لوگوں میں کتنے ایسے آدمی ہیں۔ جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گذر چکی ہیں ... پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں تو میں ان ... اپنا حافظہ تازہ کر لیں اگر خطبہ صدارت ص (؟) دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں۔

میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انھیں مخاطب کیا تھا آج بھی میں ... ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔ ان میں کوئی حالت ایسی نہیں۔ جو ... سے نہ گذری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات ... سامنے گذرتے ہی نہ رہے۔ میں ان کے اندر ٹھہرا رہا۔ اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہد... کو نہ جھٹلاؤں۔ میرے لئے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں میں اپنی ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصے ... ان سے کہتا رہا ہوں۔ کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمان کے لئے صرف وہی ایک راہ عمل ہو سکتی ہے۔ جس کی ... ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی۔"

(ص ۲۵)

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ لوگوں کو چاہئے کہ اپنا حافظہ تازہ کر لیں لیکن ہم پوچھنا چاہتے ہیں۔ کہ حافظہ تازہ کرنے کی ضرورت ... یا خود مولانا صاحب کو؟ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا صاحب کے پاس الہلال کا کوئی پرچہ بھی موجود نہیں ورنہ اس بلند آ... نہیں پکھ سکتے کہ جو کچھ میں ۱۹۱۲ء میں کہتا تھا آج بھی وہی کہتا ہوں۔ آیئے ہم مولانا صاحب کو بتائیں کہ وہ ۱۹۱۲ء میں ... لکھ رہے ہیں۔ مولانا صاحب ذرا توجہ سے سنیں۔ کہ بڑی گہری تفکر طلب باتیں ہیں۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس تمام خطبہ میں کہیں اللہ اور اس کے رسول کا نام نہیں آیا۔ اسلام کے کسی بزرگ کی جلالت اور عظمت کا [illegible] نہیں کیا گیا۔ بھولے سے بھی کسی اسلامی تاریخی واقعہ کا اشارہ تک نہیں آنے پایا۔ لیکن اس میں اگر کسی کی عظمت کا اعتراف ہے تو (نعوذ باللہ) اس وجودِ اقدس و اعظم کی عظمت کا جو مشرہ عن الخطا رقرار پا جانے کی وجہ سے ہر نیشلسٹ کے نزدیک خدائی صفات کا حامل قرار دیا جا[illegible] فرماتے ہیں:۔

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں [illegible] [illegible] مہاتما گاندھی عظیم روح۔ اللہ اکبر!!!

یہی مولانا صاحب روح کی عظمت و رفعت کا یہ معیار قرار دیا کرتے تھے۔

"اولیاء اللہ کا گروہ جس قدر محبت الٰہی اور انقطاع ماسوی اللہ میں ترقی کرتا ہے [illegible] نورِ ربانی کا ظہور بھی ترقی کرتا ہے یہاں تک کہ تکمیلِ مرتبۂ انسانیت تک اس کا ارتقا ہو جاتا ہے۔ (اور یہی "صراطِ مستقیم" اور "دین قیم" کا آخری مرتبہ ہے .... (یہ) وہ قانونِ ارتقا ہے جسے محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا [illegible] کیا ہے۔" (الہلال مورخہ ۴ اگست ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۲)

[illegible] مولانا صاحب اپنے پیر و مرشد گاندھی جی کے متعلق کیا ایمان رکھتے ہیں! اور ان کا مقام کس فلک پیما بلندی [illegible]

[illegible] کا یہ دعویٰ ہے کہ کانگریس ملک کی قومی جماعت ہے۔ اور اس کے سوا اور جتنی جماعتیں ہیں۔ وہ فرقہ وارانہ ہیں۔ [illegible] جماعتوں کی جدوجہد اپنے اپنے فرقہ [illegible] کے لئے ہے۔ اس [illegible] جو کچھ کانگریس کر سکتی ہے [illegible] جماعتیں نہیں کر سکتیں یہ [illegible] مولانا صاحب کی زبان سے کہلوائے گئے ہیں۔ [illegible]

"بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں۔ جو سیاسی جدوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکتیں۔ جہاں تک کانگریس کے قدم پہونچ گئے ہیں۔ وہ جماعتیں ہیں جو اپنے طبقہ (کلاس) [illegible] کے تحفظ کے لئے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورتِ حال کی تبدیلی کے خواہشمند نہ ہوں [illegible]"

یعنی جو کچھ کانگریس کر سکتی ہے وہ فرقہ وارانہ جماعتیں نہیں کر سکتیں۔ اب سنئے کہ دورِ اوّلی میں مولانا صاحب کیا فرماتے تھے:۔

"کانگریس کمیٹیاں جو کام کر رہی ہیں۔ ان میں ہندی مسلمان بھی ہندوؤں کے برابر کے شریک ہیں۔ لیکن خالص مسلمانوں کے اندر سرگرمیٔ عمل پیدا کرنے کے لئے کانگریس کا نظام کافی نہیں ...... کانگریس کمیٹیاں کسی شہر یا بستی میں [illegible] جلسے منعقد کر کے مسلمانوں سے کہیں ایک چرخہ چلاؤ اور ولایتی کپڑا چھوڑ دو تو وہ اثر پیدا نہیں ہوگا۔ جو [illegible] کے دن مسجد میں ایک وعظ کر کے پیدا کر سکتا ہے۔"

اس وقت یہ ارشاد تھا آج اگر کوئی جماعت خالص مسلمانوں کے اندر سرگرمیٔ عمل پیدا کرے [illegible] وارانہ قرار دے کر جھاؔلہ سوار دست [illegible]

رہا ہوں جہاں وہ «الہلال» میں کھڑا تھا۔

ہندوستان کی سیاسی کشمکش میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ میں جو بنیادی اختلاف ہے اسے چند الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ

(۱) ہندو اس تمام ملک کو ایک "واحد کل" (SINGLE UNIT) قرار دے کر ایک ایسے طرز حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ جس میں مرکز (CENTRE) ایک ہو۔ اس نظام حکومت کا نام آل انڈیا فیڈریشن ہوگا۔ جو خالصتہً مغربی انداز کے نظام جمہوری کے قالب میں ڈھلا ہو۔

اس کے برعکس مسلمان یہ چاہتا ہے۔ کہ ملک کے اس حصہ کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے الگ کر کے وہاں جداگانہ اسلامی حکومت قائم کی جائے

(۲) ہندو تمام ہندوستان کے باشندوں کو ایک قوم فرض کر کے وحدتِ قومی (Single Nationality) کی بنیادوں پر نظام حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے آپ کو ایک الگ جداگانہ مستقل بالذات قوم قرار دیتے ہیں۔ اور ہندوستان کے مسئلہ کو بین الفرق (Inter-communal) نہیں بلکہ بین الاقوامی (Inter-national) مسئلہ سمجھتے ہیں۔ اور دو جداگانہ قوموں کی بنیادوں پر الگ الگ حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مسائل اس قدر وضاحت سے طلوع اسلام کے صفحات پر آ چکے ہیں۔ کہ انہیں اس وقت مزید بحث ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ مولانا صاحب ان مسائل کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں:-

«ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی (Constitution) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو۔ مگر اس ایک بات ہم سب کو معلوم ہے۔ وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (Federation) کا جمہوری دستور ہوگا جس کے تمام حلقے (Units) اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے۔ اور فیڈرل مرکز کے حصے میں صرف وہی معاملات رہیں گے۔ جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع (Defence) کسٹم وغیرہ (۱۰۱-۱۰۳)

یہ ظاہر ہے کہ یہی نظام زندگی ہے جو یورپ کی ٹکسالوں سے مضروب ہو کر آیا ہے۔ اور ہندو اسے اس لئے اختیار کرنا چاہتا ہے کہ اس کی رو سے وہ یہاں اپنی اکثریت کی بنا پر خالص ہندو راج قائم کر سکتا ہے۔ اب دیکھئے کہ یورپ کی نقالی میں نظام زندگی اختیار کرنے کے متعلق مولانا صاحب کبھی کیا فرمانے تھے۔ جمعیۃ العلمائے لاہور کے خطبۂ صدارت ۱۹۲۱ء کے دوران میں ارشاد ہے۔

«قوم افراد سے مرکب ہے۔ اور افراد کی قومی ہستی کے قیام و ظہور کے لئے ضروری ہے کہ ایک جماعتی مسلک میں تمام افراد منسلک ہو جائیں۔ اور فرقہ و تشتت کی جگہ وحدت و اتحاد پیدا کر کے قوم کی شیرازہ بندی کی جائے۔ ہم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اور یورپ کے اجتماعی طریقوں کی نقالی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ آخر اسلام نے بھی حیاتِ اجتماعی کے لئے کوئی نظام بھی دیا تھا۔ یا نہیں۔ اگر دیا تھا۔ اور ہم نے ضائع کر دیا ہے۔ تو یورپ کی دریوزہ گری سے پہلے اسلام کا قرار دادہ جماعتی نظام کیوں نہ قائم کریں۔»

کیا مولانا صاحب ارشاد فرمائیں گے کہ جو کانگریس کے نظام سے جس قسم کی جماعتی نظام کے قیام کی تلقین کر رہے ہیں۔ وہ یورپ کی نقالی ہے۔ یا اسلام کا عطا فرمودہ نظام حکومت۔ کیا وہ نظامِ زندگی یا طرزِ حکومت کبھی اسلامی قرار پا سکتا ہے۔ جو کفار اور مومنین کی متحدہ قومیت سے وجود میں آئے۔ اور جس میں فیصلے کفار کی اکثریت کے تابع ہوں۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ کس چیز کو اسلامی قرار دے رہے ہیں۔ کیا یہ وہی چیز نہیں جسے قرآن کریم طاغوتی نظام زندگی قرار دے رہا ہے اور جسے کانگریس نے یورپ کی دریوزہ گری سے حاصل کیا ہے۔ اس قسم کے فیڈرل نظام میں جہاں مختلف حلقے اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار رہیں گے۔ وہاں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن۔ ثقافت و معاشرت کی کیا حالت ہو گی۔ اس کی بات پوچھیئے ان سیاہ اوراق سے جن پر آپ کی کانگریس کے اٹھائی سالہ دورِ حکومت کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ اور پھر آپ کس بھولے پن سے ارشاد فرماتے ہیں:۔

"مرکز کے حصہ میں صرف وہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مسائل سے ہو گا۔ مثلاً بیرونی تعلقات۔ دفاع کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنے سامنے رکھ سکتا ہے ان اندیشوں کو قبول کرنے کیلئے تیار ہو جائے جنھیں اکثریت اور اقلیت کے اس پُر فریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے" (صفحہ ۱۴)

یعنی مولانا صاحب کے نزدیک بیرونی تعلقات اور دفاع (Defence) وغیرہ کچھ ایسے اہم مسائل نہیں۔ کہ جن سے خواہ مخواہ کے اندیشے پیدا کئے جائیں یہ "بیرونی تعلقات" جسے اب اکثریت اور اقلیت کے پُر فریب سوال کا نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے، الہلال کے مولانا صاحب کے نزدیک کیا معنے رکھتے تھے۔ سنیئے فرماتے ہیں۔

"پس اے عزیزانِ ملت! اور اے بقیہ ماتم زدگانِ قافلۂ اسلام!! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروانِ اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے۔ تو تعجب ہے۔ اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پروانۂ توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے۔ ان ساٹھ کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک حامی وطن کے حلق بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے۔ کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرتے؟ ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن کی آخری ساعت نزع میں، اشہد ان لا الہ الا اللہ کی آواز نکل رہی تھی۔ تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو۔ اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدانوں میں حافظین کلمۂ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھن رہے ہیں تو ہم اللہ۔ اس کے ملائکہ اور اس کے رسول کے آگے ملعون ہوں۔ اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لئے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ ہاں؟ اگر اسلام کی روح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیروؤں میں باقی ہے۔ تو مجھ کو کہنا چاہئے کہ اگر میدان جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے۔ تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان، مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے۔ کیونکہ ملت اسلام ایک جسم واحد ہے۔ اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضاء

دو بلاح ہیں۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضاء رکٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں۔ ممکن نہیں کہ اس کے صدمے سے بے خبر رہیں۔ اور جو کچھ کہہ رہا ہوں محض اظہار مطلب کا زور بیان ہی نہیں ہے۔ بلکہ عین ترجمہ ہے۔ اس حدیث مشہور کا جس کو امام احمد و مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ جناب رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا:۔

مثل المؤمنین فی توادھم و تراحمھم و تعاطفھم مثل الجسد اذا اشتکی لہ عضو تداعی لہ سائر الجسد بالسھر والحمی۔ (الحدیث)

مسلمانوں کی مثال باہمی مودّت و مرحمت اور محبت و ہمدردی میں ایسی ہے۔ جیسے ایک جسم واحد کی اگر اس کے ایک عضو میں کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ تو سارا جسم اس تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے؛

اور اسی کے ہم معنی صحیحین کی وہ حدیث ہے۔ جس کو ابو موسیٰ اشعری نے روایت کیا ہے کہ:۔

المؤمن للمؤمن کالبنیان یشدّ بعضہ بعضاً

ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایسا ہے۔ جیسے کسی دیوار کی اینٹیں کہ ایک اینٹ دوسری اینٹ کو سہارا دیتی ہے؛

اور فی الحقیقت یہ خصائص مسلم میں سے ایک اولین اور اشرف ترین خصوصیت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اپنے جامع و مانع الفاظ میں ارشارہ کیا ہے:۔

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (۲۹:۴۹)

کافروں کے لئے نہایت سخت مگر آپس میں نہایت رحیم اور ہمدرد۔

ان میں جس قدر سختی ہے، باطل اور کفر کے لئے اور ان کی جس قدر محبت و الفت ہے حق و صدق اور اسلام و حید کے لئے فما عنیدوا یا ایّھا المسلمون و لا تکونوا کالذین قالوا سمعنا وھم لا یسمعون۔"

یہ ہیں وہ بیرونی تعلقات جن کا آج یوں استخفاف کیا جا رہا ہے۔ سچ ہے یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ سیاستِ حاضرہ میں سب سے اہم سوال یہ ہے۔ کہ کیا ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم کے افراد ہیں یا مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں ہندو تمام باشندگانِ ملک کو ایک "متحدہ قومیت" کے عناصر ترکیبی قرار دیتا ہے اور مسلمان کا دعویٰ ہے کہ۔

بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اس لئے مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ لیکن ہندو اسے تسلیم نہیں کرتا۔ اور مسلمان کو ایک اقلیت قرار دیتا ہے۔ مولانا صاحب نے اس باب میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ وہ ان کی پریشانیٔ افکار کا ایک کھلا ہوا صحیفہ ہے۔ جس کا لفظاً لفظاً اس

[illegible] کا خیال ہے۔ جو ان کے ضمیر اور مصلحت کوشی میں جاری ہے۔ انہیں مسلمانوں کو اقلیت قرار دینے کے لیے کوئی دلیل نہیں ملتی اس لئے انہیں اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ مسلمان اقلیت نہیں رہا۔

میں نے اس زمانہ (زمانہ اشتعال) میں بھی اپنے اس عقیدہ کا اظہار کیا تھا۔ اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں۔ کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے۔ جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے۔ اور اس لئے انہیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہئے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط بنیادوں پر غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی۔ دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتاتا۔ کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی۔ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگرس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئی تھیں ایک یہ کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لئے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس لئے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا۔ کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ .... ..

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے، ان میں سے ایک بیج یہ تھا اس نے فوراً پھول پتے پیدا کئے اور گو پچاس برس گذر چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی جڑوں میں خشکی نہیں ہوئی۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے۔ اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہئے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے۔ جو تعداد اور صلاحیت، دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لئے صرف یہی کافی نہیں۔ کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے

گروہ سے کم ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے ساتھ ہی اس میں تعداد (Quantity) کے ساتھ نوعیت (Quality) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجئے۔ ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ دوسرے کی دو کروڑ ہے اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا۔ اور اس لئے دو کروڑ سے کم ہوگا۔ مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا۔ کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزوریوں کا اعتراف کر لیں۔ اس طرح کی اقلیت بننے کے لئے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (Factors) کی موجودگی بھی ضروری ہے؟

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے۔ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے۔ کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی۔ لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے۔ خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لئے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کر سکے گی۔

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کو بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہو جائیں گے اگر ہم ابھی مجبور ہیں۔ کہ مذہبی تفریق بنا پر ہی "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصور کرتے رہیں۔ تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلیت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ اگر وہ سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تو پانچ صوبوں میں انھیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں۔ کہ انھیں کو ایک اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کر سکے۔"

ان تصریحات سے واضح ہے۔ کہ مولانا صاحب کے نزدیک مسلمان اقلیت نہیں۔ اور اگر یہ اقلیت نہیں تو لامحالہ ایک جداگانہ قوم ہیں۔ لیکن ایسا کہنے سے تو ان کی نیشنل ازم کی تمام عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہے۔ وہ ایسا کس طرح کہیں! اور کہنا بھی چاہئیں۔ تو تو وہ جن کی نظرِ کرم نے انھیں "راشٹر پتی" کے منصب جلیلہ پر فائز المرام کیا ہے۔

وہ ایسا کیوں کہتے ہیں! اس باب میں مولانا صاحب عجیب شکل میں جا پھنسے ہیں۔ ان کی حالت قابل رحم نظر آتی ہے۔ اپنے خطبہ کے صفحات ۲۵ لغایت ۲۶ پر انھوں نے بار بار اس امر کی وضاحت کی ہے کہ کانگریس نے ہمیشہ اس بنیادی اصول کو سامنے رکھا ہے کہ ہندوستان میں جو دستور اساسی بنایا جائے۔ اس میں اقلیتوں کے حقوق و مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیئے۔ اور ان تحفظات کے تعین خود اقلیت ہوں۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"آج بھی اس نے (کانگریس) نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی) کے سلسلہ میں اس مسئلہ کا اعتراف کیا ہے...... کہ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگرچہ وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمائندوں کو چن کر بھیجیں"

قارئین کرام کو غالباً معلوم ہوگا کہ "تسلیم شدہ اقلیتوں" کی اصطلاح گاندھی جی کی وضع کردہ ہے۔ اور اس کی تصریح میں انھوں نے مسلمان اور سکھوں کا ذکر نمایاں طور پر کیا تھا۔

اب ذرا اس قضیہ کے صغریٰ کبریٰ کو سامنے رکھیے اور دیکھیے نتیجہ کیا مرتب ہوتا ہے۔

(۱) مسلمان اقلیت نہیں ہیں ــــ مولانا صاحب خود بدلائل و براہین ثابت کر رہے ہیں۔

(۲) مسلمان ایک الگ قوم بھی نہیں ہیں ... کہ اس طرح دو قوموں کا نظریہ درست ماننا پڑتا ہے جو بقول مولانا صاحب سرکاری دماغوں کا وضع کردہ نظریہ ہے

(۳) مسلمان ایک تسلیم شدہ اقلیت ہیں ــــ کہ مولانا صاحب کے راہنما گاندھی جی کا ارشاد ہے جو مولانا صاحب کے نزدیک وحی منزل سے زیادہ واجب التسلیم ہے۔

تو پھر عقل حیران ہے کہ بالآخر مسلمان ہیں کیا؟

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

اگر یہ دانستہ فریب دہی نہیں تو خود فریبی کی اس سے زیادہ بین مثال بھی مشکل سے مل سکیگی۔

مولانا صاحب نے سب سے زیادہ زور اس امر پر دیا ہے کہ جب مسلمان اتنی بڑی جماعت رکھتے ہیں۔ تو انھیں اپنے مفاد کے تحفظات کے متعلق ڈرنے کی کیا وجہ ہے! یہ دلیل بظاہر جتنی خوش آئند ہے۔ درحقیقت اتنی ہی زیاں کار فریب بھی ہے۔ یہ درست ہے کہ اتنی بڑی جماعت کو کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ جس قسم کا نظام جمہوری آپ یہاں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں اتنی بڑی جماعت ایک چوتھائی کی اقلیت بن کے رہ جاتی ہے۔ جب آپ ہندوستان کو ایک کل (UNIT) تسلیم اور تمام ملک کا ایک مرکز (CENTRE) قرار دیکر جمہوری انتظام قائم کر لیں۔ تو اس مرکز میں مسلمانوں کی حیثیت چوتھائی سے زیادہ بڑھ کس طرح سکتی ہے۔ لہذا اکثریت کے فیصلے غیر مسلموں کے فیصلے ہوں گے۔ مولانا صاحب مصیبت تو یہ ہے۔ کہ یہاں لڑائی ہی آپڑی ہے

ایسی جس میں آدمی گنے جاتے ہیں۔ تولے نہیں جاتے۔ اگر تولے جانے کا مسئلہ ہوتا تو پھر ڈرنے کی کیا بات تھی۔

اب اس اہم موضوع پر آئیے۔ جو اس تمام خطبہ کا نقطۂ ماسکہ ہے یعنی یہ کہ مسلمان ایک الگ قوم نہیں بلکہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا جزو لاینفک ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں۔ جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں۔ کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

"ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور پھر ایک کے بعد دوسرا۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس وسیع سرزمین نے سب کا استقبال کرتی رہی۔ اور اس کی فیاض گود نے سب کے لئے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک حجازی قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا۔ یہ پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ کے لئے یہاں بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے۔ لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا۔ اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔" (ص ۲۳-۲۴)

(۱) "کانگریس جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے۔ ہندوستانی قوم کے لئے اٹھانا چاہتی ہے۔" (ص ۲۴)

(۲) "یہ تخیل کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں۔ سرکاری دماغوں کا وضع کردہ ہے۔" (ص ۲۷-۲۸)

متحدہ قومیت" کے اس اصول کی وضاحت مندرجہ صدر الفاظ میں کی گئی ہے۔"

اس مرصع غزل کا آخری شعر بھی سنتے جائیے۔ فرماتے ہیں:۔

"ہماری اس ایک ہزار کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا۔ اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں۔ مگر اب ہم ایک ہندوستانی

قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کی کوئی بنیادی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہو جانا چاہیئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔" (ص۱۹)

اللہ اکبر! کفار اور مسلمان ایک ملک میں رہنے کی وجہ سے ایک ناقابل تقسیم قوم بن جاتے ہیں! کفر و اسلام ایک جگہ اکٹھے ہو کر ایک نئی تہذیب میں تحلیل ہو سکتے ہیں! یہ قدرت کا اٹل قانون ہے! یہ تقدیر کا فیصلہ ہے! اس پر قسمت کی مہر لگ چکی ہے اس متحدہ قومیت کو خود دست قدرت نے تیار کیا ہے! مسلم و کافر کی علیحدگی کا تخیل بنیادی ہے!!

یا اللہ! یہ ہم کیا سن رہے ہیں! اور کس سے سن رہے ہیں!

یہ وہ آواز سن رہے ہیں جس کے مٹانے کے لئے حضرات آدمؑ سے لے کر حضور خاتم النبیینؐ تک انبیاء کرام کا پورا سلسلہ پیغام خداوندی کو لے کر ظلمت کدہ عالم میں آتا رہا۔ اور سن رہے ہیں۔ اس شخص کی زبان سے جس کی ساری اسلامی ... کار میں گذر گئی۔ کہ یاد رکھو۔ قومیت پرستی کی یہ آواز بلا اشتباہ تشکیک شیطان کی آواز ہے۔ اس کے فریب میں نہ آجاؤ گے تو سیدھے جہنم کے عمیق گڑھوں میں جا گرو گے۔ اور ہاں! بدبختی یہ کہ یہ آواز اس کی زبان سے سن رہے ہیں۔ جو آج بھی دعویٰ کرتا ہے کہ

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔" (صفحہ)

ہم حیران ہیں کہ کفر و باطل کے اس اسلام سوز نظریہ کی تردید میں الہلال کے کتنے اقتباسات پیش کریں۔ اس کے تو پورے کے پورے مجلدات اس ایک دعوت کے نقیب ہیں۔

"مسلمانوں کی قومیتِ صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے۔" (خطبہ صدارت مولانا آزاد ۱۹۱۲ء)

اس کا تو ایک ایک ورق۔ ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ اس دجل و فریب کی دھجیاں بکھیرنے کے لئے تھا۔ دنیا نے جس قدر قومیتوں کی بنیادیں وضع کی ہیں۔ سب ابلیسانہ حیلہ کاریاں ہیں۔ مسلمانوں کی قومیت کا مدار صرف مذہب ہے اللہ کا قانون ابدی ہے۔

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

ہم فی الواقعہ متحیر ہیں کہ کون کون سے اقتباسات پیش کریں۔ اور کہاں کہاں کے حوالے دیں۔ چند ایک اقتباسات ملاحظہ کیجئے ——— ہم نے اوپر لکھا ہے۔ کہ انبیاء کرام کا سلسلۂ رشد و ہدایت اسی دعوت نے نشر و اشاعت کے لئے دنیا میں قائم ہوتا رہا ہے۔ کہ وہ انسانی رشتہ قومیت کے ان تمام غیر فطری معیاروں کو منہدم کر دے۔ جو رنگ نسل، وطن کی بولیں تصورات سے وضع ہوتے ہیں۔ اور ان کی جگہ صرف ایک معیار قومیت کو باقی رکھے۔ جو اللہ کا متعین فرمودہ ہے۔ اور وہ معیار حقہ ہے۔ اشتراک عقائد۔ یعنی مذہب۔ عہد اسلامی کے مولانا آزاد اس باب میں فرماتے ہیں۔

"قرآن حکیم میں اگرچہ نبوت کے عام اشتراک جنسی کی بنا پر تمام انبیاء کرام کا نام ایک ساتھ اور ایک حیثیت سے آیا ہے۔ لیکن بعض خصوصیاتِ نوعی کے لحاظ سے اس نے انبیاء کے جو مختلف طبقات قائم کر دیئے ہیں۔ ان میں دو سلسلے عام طور پر ممتاز نظر آتے ہیں:-

ایک سلسلہ ان انبیاء موسسین کا ہے۔ جنھوں نے اپنی دعوت کے ذریعہ نئی قومیتوں کی بنیاد

ڈالی اور جو قدیم عمارتوں کی اصلاح کے لئے نہیں بلکہ از سرِ نو ایک نئی قومی عمارت بنانے کے لئے آئے تھے ۔ دوسرا سلسلہ انبیاء و مجددین و محدثین (بالفتح) کا ہے جنہوں نے کسی نئی امت کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ کسی پیشتر کی قائم شدہ امتِ صالحہ کی مزید تکمیل و تبلیغ کی ۔ یا امتداد عہد کے نتائج مُضلہ و استیلائے بدعات و محدثات سے اسے نجات دلاکر فرض تجدید و احیاء ادا کیا ۔

پہلے سلسلہ کا وصف امتیازی یہ ہے کہ وہ تمام قدیم نظام ۔ قدیم عقائد اور قدیم اخلاق و معتقدات کو مٹا کر ایک جدید قومیتِ صالحہ کی بنیاد ڈالتا ہے ۔ اور اس کو آب و ہوا اور جغرافیانہ حدود و طبعیہ کے اثر سے الگ کر کے صرف تعلیم آب وہوا میں ترقی اور نشو ونما دیتا ہے ۔ قرآنِ حکیم میں خدائے تعالیٰ نے اس صنف کے ایک نمایاں سلسلے اور اس کی ممتاز کڑیوں کا ذکر متعدد موقعوں پر ایک ساتھ کیا ہے ۔"

اسی سلسلہ میں آگے چل کر فرماتے ہیں :۔

"انسان کی اجتماعی حیات یا قومیت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے ۔ جو نسل و وطن و توارث و متواصل علائقِ نسلی سے ترکیب پاتے ہیں ۔ انسان انبیائے کرام کا مشن یہ ہوتا ہے ۔ کہ ان تمام نسلی و قومی امتیازاتِ قدیمہ کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں ۔ پس اس بنا پر ان کی دعوت کا اولین اسوۂ حسنہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ خود بھی نسل و خاندان کے تمام رشتوں کو توڑ دیں ۔ اور اسی طرح نسل قربانی کا طاقتور حربہ تیار کریں ۔ اس قربانی کا اثر ان کے تمام کاروبارِ دعوت میں سب سے زیادہ کارگر ہوتا ہے ۔ قوم دیکھتی ہے ۔ کہ کس طرح داعیِ الی الحق نے اپنے تمام رشتوں کے گھر کو اجاڑ دیا ۔ اور اس عمارت کا ایک گوشہ بن گیا ۔ جس کی چھت کے نیچے ہمیں جگہ دے رہا ہے ۔

چنانچہ انبیاء کرام و رسلِ عظام کے اس سلسلہ میں جنہوں نے نئی قومیتوں کی بنیاد رکھی ہے ۔ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا مقام ہے اور چونکہ ان کی دعوت اسی پہلی قسم کی دعوت تھی ۔ اس لئے ضرور تھا کہ اس اولین قربانی کا بھی وہ اسوۂ حسنہ قائم کرتے ۔ پس آیۂ کریمہ مندرجہ صدر میں جب انہوں نے بیٹے کے لئے خدا کو پکارا تو ارشاد ہوا کہ یہاں جسمانی رشتہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ۔ اگر تمہارا [illegible] کے اس نئے گھرانے میں داخل ہو جاتا جس کی تم نے بنیاد رکھی ہے تو وہ تمہارا عزیز تھا ۔ لیکن [illegible] صالح کی جگہ عمل غیر صالح سے رشتہ جوڑا ۔ پس اب اس کا ذکر بیکار ہے اور یہ نیا [illegible] الٰہی ہے جس کا تمہیں علم ہونا چاہیے ۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ۔ حضرت نوح نے عرض کیا میں اپنے ضعفِ بشری کا اعتراف کرتا ہوں ۔ اور تیری رحمت و مغفرت میں پناہ لیتا ہوں درحقیقت یہ میری لغزش تھی ۔ میں نے اس کی نسبت تجھ سے سوال کیا ۔"

پھر ارشاد ہے :۔

"حضرت نوح علیہ السلام نے جس نئی امت کی بنیاد رکھنی چاہی تھی۔ اگرچہ یکسر ضلالت عصر اور جہل انسانیت اس سے دست و گریباں رہا۔ اور اس لئے مَا اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ (۱۱ - ۱۶) ان پر ایمان لانے کی سعادت نہیں ملی۔ مگر ایک چھوٹی جماعت کو تاہم جس امت صالحہ کی اس عہد آدلیں میں بنیاد پڑی تھی۔ وہ ضائع نہ گئی اور خدا کا کوئی حکم دعوت ضائع نہیں جا سکتا۔ اگرچہ خود حضرت نوح پر بہت کم لوگ ایمان لائے کیونکہ انسانی صلاحیت و عرفان کا بالکل عہد طفولیت بلکہ اس سے بھی مقدم ترقدور تھا۔ اور مذہب کا سلسلۂ ارتقا راہ علم اپنی ابتدائی کڑیوں سے ایک دو قدم آگے بڑھا تھا۔ لیکن جب حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے معتقدین و متبعین کی اولاد زمین کے مختلف گوشوں میں پھیلی تو وہ اپنے ساتھ اس نئی قومیت کے عقائد و اعمال بھی لے گئی یہ دراصل اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت نوح کی دعوت کسی خاص نسل اور قوم کو پیدا کر دینے کے لئے نہ تھی۔ بلکہ وہ اس قسم کی دعوت میں داخل تھی۔ جو موجودہ نسلوں اور قوموں سے بالاتر ہو کر خود ایک نئی قوم پیدا کرتی ہے اور اس کی بنیاد محض اخوت دینی پر قائم ہوتی ہے پس وہ جغرافیہ و نسل سے مادر رہ کر ایک عالمگیر برادری بن جاتی ہے۔ اور زمین کا ہر ٹکڑا نوع انسانی کا ہر حصہ۔ اقوام و ملل کی ہر نسل اس کے دامن میں پناہ لے سکتی ہے"۔۔۔۔ البلاغ ۱۲ $\frac{11}{1915}$

یہ حقائق کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔ آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ خود انبیاء کرام علیہم السلام جس قومیت کی تاسیس کے لئے تشریف لاتے رہے کیا وہ وہی قومیت ہے۔ جو اشتراک وطن سے تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ اور مولانا صاحب جس کے آج اس فخر و مسرت سے لاینفک عنصر بننے کا اعلان فرماتے ہیں۔ یا یہ وہ قومیت ہے جسے مٹانے کے لئے یہ سلسلۂ رشد و ہدایت جاری رہا تھا۔

اب کوئی کفر کو اسلام کہنے لگ جائے تو اس کا کیا علاج۔

یہ الہلال کے مولانا آزاد تھے اور آج کے مولانا آزاد قومیت کا معیار وطن کی چار دیواری قرار دے رہے ہیں۔

(باقی دارد)

رُباعیات

ایک مفلس ہندی یہ کہتا تھا خدا سے
میں کر نہیں سکتا گلہ درد فقیری
لیکن یہ بتا تیری اجازت سے فرشتے
کرتے ہیں عطا مرد فرومایہ کو میری

اقبال

بیگانہ جب سے بنے بوں سے سب سرگرد
فطرت کو زبوں ایمان کی طرف [illegible]
کھنچتا ہے [illegible] ہو تو کافر
زنار سے کہ سلسلہ [illegible]

رجب

طاہرہ بیگم

پھوپی شمسی

میں ابھی بستر پر پڑی کروٹیں ہی لے رہی تھی کہ ناگہانی زوحی نے آکر جھنجوڑ ڈالا۔ بھئی تمہیں خدا کی قسم آج تو کہیں سیر کو چلو۔ ہم تو پڑھتے پڑھتے تنگ آگئے آخر کوئی کب تک پڑھے۔

میں نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔ مگر پھوپی شمسی وہ بھی خوف زدہ ہو کر چلائی —— واقعی پھوپی شمسی

پھوپی شمسی میری حقیقی پھوپی نہ تھیں۔ مگر دو سال سے ہمارے گھر میں رہتی تھیں۔ اس لئے چھوٹے بڑے تمام انھیں پھوپی شمسی کہتے تھے۔ پرانی وضع کی آدمی تھیں مگر تن و توش کے اعتبار سے بالکل نان پاؤ معلوم ہوتی تھیں۔ کوئی کہیں جانے کا نام لے یہ اسکے ساتھ ہیں۔ کوئی چپکے سے اپنے دوستوں کے لئے کوئی چیز تیار کرنی چاہے یہ آدھمکیں گی۔ اگر دعوت میں شریک نہ کریں تو ناراض اور اگر شریک کر لیا جائے تو آدھے سے زیادہ غائب۔ پچھلے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں جب میں گھر گئی تو چھوٹی تیری بہن نے یہ عذاب اپنے سر سے اتار کر میرے سر منڈھ دیا۔ اور اب پھوپی شمسی میری حفاظت کے ساتھ بورڈنگ میں مقیم تھیں۔

جب سے پھوپی شمسی نے میرے حال پر کرم شروع کیا تھا۔ مجھے کمبخت کو ڈھنگ کا ناشتہ ملتا تھا نہ پیٹ بھر کھانا۔ ملازم نے ناشتہ لا کر رکھا اور یہ بلائے ناگہانی کی طرح آدھمکیں بعض اوقات میرے بستر سے اٹھنے سے پہلے ہی تشریف لے آتیں۔ اور جب تک میں غسل کر کے آؤں سب چیزیں صاف —— ویسے بھی ذرا میں نے انڈے کو چھوا اور وہ چلائیں —— ہے ہے گرمی کے مارے پھٹ جاؤ گی۔ پنیر کو ہاتھ لگایا اور انھوں نے میرے آگے سے پلیٹ اٹھائی —— قبض کی تم پہلے ہی مریض ہو میرے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگواؤ گی کہ پھوپی ذرا کھانے کی دیکھ بھال بھی نہ کر سکیں۔

غرض اس ہی طرح وہ تمام ناشتہ صاف کر لیتیں اور میں منہ دیکھتی رہ جاتی —— ایک مرتبہ تنگ آکر میں نے کچھ بسکٹ اور انڈوں کا حلوا الماری میں چھپا دیا —— کالج سے واپسی میں دیکھتی ہوں کہ الماری کھلی پڑی ہے۔ اور پھوپی شمسی اطمینان سے بسکٹ اور حلوا کھا رہی ہیں، مجھے دیکھتے ہی غرائیں —— اے میں کیا تم کو کھانے سے منع کرتی ہوں تم شوق سے جو چاہو کھاؤ۔ میں تو تمہارے ہی بھلے کو کہتی ہوں۔ یہ موٹے میدے کے بسکٹ کھانے سے فائدہ؟ حلق سے اترتے ہی آنتوں میں چپک جاتے ہیں——

ایک مرتبہ چند سہیلیوں کے ساتھ پکنک پر جاتے کے لئے چند کھانے تیار کئے لیکن پھوپی شمسی نے ایک بھی نہ لیجانے دیا—— اس ہی خطرے کے پیش نظر میں نے روحی کو بہت سمجھایا۔ بہت ڈرایا لیکن آج وہ اس لال جھنڈی سے بھی خوف زدہ نہ تھی۔ اس نے پھوپی

شمسی سے بدلہ لینے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ وہ برابر ہنس رہی تھی میں نے تنگ آکر اسے جھنجوڑ ڈالا ـــــ خدا کے واسطے روحی ہم کہیں نہیں جا سکتے

وا یات مت نیلو نیلوفر ـــــ اس نے غصہ سے کہا میں ابھی پھوپی شمسی کو یہاں سے ٹالے دیتی ہوں۔ اس نے جلدی سے فون اٹھا لیا ـــ ہیلو منصور دیکھو آج گھٹا ئیں بدمست رقاصہ کی طرح ناچ رہی ہیں چلو آج دوپہر کا کھانا شالیمار میں رہے گا

۔ منصور کی آواز صاف سمجھ میں آ گئی۔

اور سنو تو ـــــ پھوپی شمسی کے بیٹے کا کیا نام ہے۔ اوہ ہاں مختار ـــــ تم کو اس کی آواز بنانے میں کمال حاصل ہے تم فوراً مختار کی جانب سے پھوپی شمسی کو فون کردو کہ صبح چار بجے سے ہیضہ میں سخت مبتلا ہو۔ پھوپی شمسی جلدی پہنچیں ـــــ

اور سنو ـــ اس نیک کام کے بعد اپنی گاڑی لیکر کچھ فروٹ لیتے ہوئے جلد بورڈنگ پہنچ جاؤ

پھوپی شمسی کے جانے کے بعد ہم نے اطمینان اور آزادی کا ملا جلا سانس لیا اور کمرے کے دروازے بند کر کے برقی چولہے پر پکانا شروع کر دیا۔ میں نے اخروٹ کی مٹھائی بنائی اور کچھ انڈے تلے۔۔۔ روحی نے جلدی سے مچھلی کے کباب بنائے۔ اب میں آلو کے قتلے کڑھائی میں ڈالنا ہی چاہتی تھی کہ پھوپی شمسی کی آواز آئی ـــــ نہ معلوم آج صبح ہی صبح کسی کو کیا سوجھی مجھے ناشتہ بھی نہ کرنے دیا ـــــ اور ایسا معلوم ہوا کہ دنیا تاریک ہو کر ہمارے سامنے ناچ رہی ہے۔ ہم لوگ کام میں اس طرح مشغول تھے کہ پھوپی شمسی کا یقین نہ ہوتا تھا۔ لیکن پھوپی شمسی تو دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں ـــــ نیلوفر بیٹیا نیلوفر

میرا چہرہ فق ہو گیا۔ اور میں گھبرا کر روحی سے لپٹ گئی ـــــ لیکن روحی نے جیسے پھوپی شمسی کو شکست دینے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا اس نے آخری کوشش کی اور جلدی جلدی تمام سامان اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔

آہ پھوپی شمسی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی ناک کو جنبش دی میں گھبرا کر غسل خانہ کے دروازے سے باہر نکل گئی اور اچانک پھوپی شمسی کی آواز گونجی ـــــ ایں دیکھو بخت نیلوفر کتنی اچھی لڑکی ہے۔ تمہارے لئے کتنی عمدہ چیزیں تیار کر کے رکھی ہیں

میں نے مڑ کر دیکھا۔ پھوپی شمسی الماری میں سے پلیٹیں نکال نکال کر میز پر رکھ رہی تھیں۔

یارب! مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے مجھ کو کچھ ہو گیا ہے۔

مونس شبیر

شادی خانہ بربادی

مجھے افسوس ہے کہ جب بھی مجھ سے کچھ لکھنے کے لئے کہا جاتا ہے تب چن چن کر قوم کی برائیاں ہی لکھتی ہوں لیکن اس قول پر عمل کرتے ہوئے کہ سچا دوست وہی ہے جو ہمارے عیب ہمیں بتائے میرا موضوع ہمیشہ قوم کی تباہ کن رسومات کے متعلق ہوتا ہے اور یہی سبب ہے کہ تاوقتیکہ قوم میں اتنی بیداری پیدا ہوجائے کہ وہ اپنی گرتی ہوئی حالت کو سنبھال سکے۔

آج میں اپنی شادی خانہ بربادی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں جس کا تماشہ تقریباً ہر گھرانہ دیکھ چکا ہے اور دیکھ رہا ہے بچپن میں ہم جس طرح گڈے گڑیا کا بیاہ رچایا کرتے تھے اور دن میں کئی بار ایک ہی گڑیا مختلف گڈوں سے بیاہی جاتی تھی۔ یا ایک گڈے کی چار چار شادیاں کی جاتی تھیں ہو بہو یہی نقشہ ہمارے ماحول میں ایک تلخ حقیقت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

قوم پنجابیان ایک مالدار جماعت ہے لیکن جتنی دولت موجود ہے اس سے کہیں زیادہ جہالت بھی پائی جاتی ہے مجھے یہ دیکھکر سخت رنج ہوتا ہے کہ قوم اپنا روپیہ ہر طرح کی فضول رسومات پر بے دریغ خرچ کرتی ہے لیکن تعلیم پر خرچ کرنا فضول خرچی سمجھا جاتا ہے کتنے افسوس کی بات ہے کہ قومی بچے بہت چھوٹی عمر میں ہی قرآن پاک حفظ کر لیتے ہیں لیکن ایک لفظ کے معنی بھی وہ نہیں جانتے تاہم وہ حافظ قرآن کہلاتے ہیں یہاں پر تعلیم ختم ہوجاتی ہے اور تعلیم ختم ہونے کے بعد والدین کو اپنے نونہال کی شادی کی فکر ہوتی ہے عام طور پر لڑکی کی عمر تیرہ سال اور لڑکے کی عمر اٹھارہ سال ہوتے ہی شادی کردی جاتی ہے اور ایسے ننھے منے دولہا دلہن کو دیکھ دیکھ کر والدین پھولے نہیں سماتے اور ان دو معصوم بچوں سے امید کی جاتی ہے کہ وہ نہایت خوش اسلوبی سے اپنے فرائض سرانجام دیں گے لیکن وہ اپنی کم سنی ناتجربہ کاری کے باعث اور بزرگوں کے غیر ہمدردانہ رویے کی وجہ سے ناکام ثابت ہوتے ہیں مایوسی اور بیزاری پیدا ہوتی ہے بلکہ اس میں بہت کچھ ہاتھ ان کے بزرگوں کا بھی ہوتا ہے اور نتیجہ یہ کہ لڑکی کو طلاق دلوائی جاتی ہے اور اکثر شادی کے ایک یا دو سال کے عرصے میں وہ ایک بچے کی ماں بھی بن چکی ہوتی ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکے والے محض سزا کے طور پر طلاق نہیں دیتے بلکہ لڑکی کو عمر بھر کے لئے میکے میں سڑنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے بیٹے کی ایک چھوڑ دو دو اور بعض اوقات تین تین شادیاں کروا دیتے ہیں۔ مقدمے بازی ہوتی ہے دونوں طرف سے روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اور برسوں کے جھگڑے کے بعد کچھ نتیجہ نکلتا ہے۔

میں ایسے واقعات بھی جانتی ہوں جہاں میاں بیوی دونوں اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوجاتے

ہیں اور ان کے دلوں میں محبت کا پاکیزہ جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے لیکن بے کار اس کے باوجود ان دونوں کے بزرگ نہایت چھوٹی قسم کی باتوں پر مثلاً زیور کپڑے وغیرہ کی وجہ سے آپس میں سخت دشمنی پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اس باعث محبت بھرے دلوں کو زبردستی جدا کر دیا جاتا ہے اور چونکہ لڑکا اپنے والدین کا دست نگر ہوتا ہے خود اس کی کوئی مالی حیثیت نہیں ہوتی مجبوراً بڑوں کی ضد کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ میاں بیوی جدا ہونے کے بعد بھی ایک دوسرے کے لئے ایک عرصہ تک تڑپتے رہے لیکن بزرگوں کے خوف سے اپنے جذبات اور اپنی محبت کا گلا گھونٹ دینے پر مجبور ہو گئے اور ایسے واقعات بھی سامنے ہیں کہ اپنی پہلی محبت کو وہ کبھی نہ بھلا سکے ایک باوفا اور شوہر کی محبت سے سرشار نوعمر لڑکی کو مجبور کرنا کہ وہ اپنی پہلی محبت کو بھول جائے اور اپنے شکستہ دل میں ایک نئے مرد کے لئے ویسی ہی محبت پیدا کرے کس قدر مضحکہ خیز بات ہے!

اب ہمیں سمجھنا یہ ہے کہ آخر اس نت نئی شادی اور نت نئی طلاق کی وجوہات کیا ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں ہماری قوم میں جہالت کی بڑھتی ہوئی وبا ہے جس قوم میں والدین جاہل ہوں گے ان کے بچوں کی تربیت کیا ہو سکتی ہے۔ ان کو ایسے موقع مہیا کئے جاتے ہیں کہ وہ خود اپنی عقل و سمجھ کو استعمال کر سکیں تعلیم یافتہ طبقے میں اولاد کی تعلیم و تربیت پر ہزاروں روپے صرف کر دیئے جاتے ہیں لیکن ایک جاہل طبقہ وہی روپیہ بلکہ اس سے کئی گناہ زیادہ چھٹی۔ عقیقہ، منگنی۔ شادی ناچ تماشوں اور طلاق کے مقدمات لڑنے میں خرچ کر دیتا ہے تعلیم یافتہ والدین بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کی تعلیم و تربیت کے منصوبے باندھنے لگتے ہیں لیکن ہماری قوم کے جاہل والدین طرح طرح کی احمقانہ رسومات میں شروع سے ہی روپیہ برباد کرنے لگتے ہیں ان کے پیش نظر بچے کی صحیح تربیت یا تعلیم نہیں ہوتی۔ انہیں تو بس یہی شوق ہوتا ہے کہ ہر بہانے سے کوئی نہ کوئی تقریب کی جائے خوشیاں منائی جائیں اور روپیہ لٹایا جائے چھ سات سال کی عمر میں بچوں کی منگنیاں ہو جاتی ہیں کیونکہ والدین کو رشتے جوڑنے کا شوق ہوتا ہے طرح طرح کے تحفے تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے سبھی سجائی سنبیاں چلی آرہی ہیں ہر موقع پر دعوتیں ہو رہی ہیں اور ہر بار ننھی بچی کو دلہن بنایا جاتا ہے اور غضب تو یہ ہے کہ اس معصوم کو بالکل جھک کر گھنٹوں بیٹھنا پڑتا ہے وہ کبھی سدھائی ہوئی مینا ریا کی طرح گڑیا گی بن جاتی ہے

ایک بار ایک شادی میں شریک ہوئی تھی وہاں یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اصل دلہن کونسی ہے چند سال سے بارہ سال کی عمر کی چھ سات لڑکیاں کمرے کے مختلف کونوں میں دلہنوں کے لباس میں بالکل جھکی ہوئی بیٹھی تھیں اس چھ سال کی دلہن کو دیکھ دیکھ کر مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ اتنی سخت گرمی میں نہ جانے وہ پھول سی بچی کس طرح عورتوں میں گھری ہوئی گھنٹوں وہاں بیٹھ سکی ہو گی اس کے علاوہ میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ ان شرمیلی لڑکیوں کو سالوں پہلے سے دلہن بننے کا شوق کیوں دلایا جاتا ہے کہاں تو شرم کا یہ حال کہ لڑکی اپنی پسند کے متعلق ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکال سکتی یا یہ حالت کہ شادی سے پہلے ہی دلہن بن کر سسرال کی تقریبوں میں بھی شریک ہو جاتی ہیں نہ معلوم ہمارے یہاں کی شرم و حیا کا معیار کیا ہے؟ لیکن جس ماحول میں ایک شریف لڑکی کو بار بار شادی اور طلاق کے ذریعے مختلف مردوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے اس کے لئے شرم و حیا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس مول تول اور سودا بازی ایک شریف گھرانے
۱ کی لڑکی اور طوائف میں فرق ہی کیا رہجاتا ہے؟ طوائف بھی پیٹ کی خاطر نت نیا رشتۂ محبت جوڑتی ہے اور ایک معصوم لڑکی کو بار بار نئی محبت رچانے پر مجبور کیا جاتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ طوائف کے لئے دلال اور شریف گھرانوں کے لئے قاضی وہی کام سرانجام دیتا ہے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ نکاح ایسے پاکیزہ رشتے کو اپنے ناپاک مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے افسوس کہ انسان اپنی حرص وہوس اور لالچ میں اندھا ہو کر مذہب کو بھی توڑ موڑ دیتا ہے۔

دوسری وجہ ہے کمسنی کی شادی بارہ تیرہ سال کی عمر کی لڑکیوں کی جسمانی ساخت شادی کا بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتی یہ عمر جسم کے صحیح نشوونما پانے کی ہوتی ہے شادی ہونے سے یہ نشوونما یکلخت رک جاتی ہے ایسی حالت میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ نہایت کمزور اور پیدائشی مریض ہوتے ہیں ماں کی صحت تو بالکل گر جاتی ہے لیکن ماں باپ کا اندھا شوق بھلا یہ باتیں کہاں سوچ سکتا ہے مذہب اور ۱ قانون نے بھی شادی کی عمر مقرر کر دی ہے لیکن جہالت کے سامنے کا بس نہیں چلتا دھوم دھام سے شادی رچائی جاتی ہے ننھی سی دلہن دیکھنے میں بہت پیاری معلوم ہوتی ہے لیکن اکثر شادی کے سال بھر بعد وہ ایک بچے کی ماں بن جاتی ہے صحت گرنے لگتی ہے چہرے پر زردی چھا جاتی ہے اور یہ معصوم کلی کھلنے سے پہلے ہی کمہلا جاتی ہے کیا کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ قوم میں آئے دن لڑکیاں کیوں مرتی ہیں؟
۱ وہ دق ایسے موذی مرض میں کیوں گرفتار ہو جاتی ہیں؟ قوم کے اسی فیصدی نوزائیدہ بچے کیوں مر جاتے ہیں؟ زچگی میں اموات کیوں زیادہ ہوتی ہیں؟ کیا یہ کمسنی کی شادی کے نتائج

نہیں ہیں؟ اگر کسی بھائی یا بہن کو اس سے اختلاف ہے تو جواب دیں اور اگر نہیں ہے (اور ہو بھی نہیں سکتا) تو بتائیں کہ انھوں نے اس کی روک تھام کے لئے آج تک کیا کیا؟ کمسنی کی شادی کا اثر لڑکی کی صحت پر ہی نہیں بلکہ لڑکے پر بھی پڑتا ہے اور نتیجہ یہ کہ دونوں عجب کشمکش کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں اکثر اسی وجہ سے چڑچڑاپن اور ایک دوسرے سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے دائم المریض بیوی اور بچوں سے گھبرا کر اور ماں بہنوں کے اکسانے پر وہ اکثر دوسری شادی پر تیار ہو جاتا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ مصائب میں گھر جاتا ہے۔

تیسری وجہ مالی پریشانی ہے ایک مالی طبقے میں مالی پریشانی درحقیقت یہی سب سے بڑی وجہ ہے یعنی نوعمر لڑکا والدین کا دست نگر ہوتا ہے تیسرے اٹھارہ سال کی عمر میں شادی ہو جاتی ہے نہ تو وہ تعلیم یافتہ ہوتا ہے کہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے نہ ہی اس کے پاس اتنا سرمایہ ہوتا ہے کہ وہ علیحدہ کوئی کام کر سکے وہ اپنے باپ کے کاروبار میں مدد دیتا ہے اور گھر سے روٹی کپڑا ملجاتا ہے اس کے علاوہ پانچ روپے جیب خرچ جو شادی ہونے کے بعد بھی اتنا ہی رہتا ہے اگر سسر صاحب کی بڑی عنایت ہوئی تو بہو کا بھی پانچ روپے مہینہ باندھ دیا ورنہ اللہ اللہ خیر سلا۔ کسقدر بے رحمانہ حرکت ہے یہ کہ نئی شادی شدہ جوڑے کی ضروریات وخواہشات کو اس قدر محدود تصور کر لینا اور ان کو اس قدر لاچار کر دینا کہ وہ اپنی حسب خواہش کچھ بھی خرچ نہ کر سکیں اس پر ساس نندوں کی کڑی نگرانی زندگی اجیرن کر دیتی ہے ... نوعمر دلہن کی یہ فطرتی خواہش ہوتی ہے کہ شوہر اس کے لئے کوئی چھوٹا موٹا تحفہ لائے یا خود وہ شوہر کے لئے کوئی چیز تیار کرے یا دیگر چھوٹی چھوٹی باتوں سے دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے لیکن دونوں مجبور ہیں افسوس کہ ہمنے

۱؎ قبل از جنگ

بوسے اوڑھنے پہننے کی عمر میں میاں بیوی بیچارگی سے بزرگوں کا منہ تکتے رہتے ہیں اور پھر بھی کچھ حاصل نہیں کر سکتے اس جوانی کی عمر میں وہ دل مسوس کر رہ جاتے ہیں نئی امنگوں اور نئی خواہشات کو کچل کر صبر کر لیتے ہیں اس عمر میں تو ان کی جسمانی نشو نما بھی پوری نہیں ہوتی ان کے شباب کو پروان چڑھنے کے لئے اچھی غذا اور آزادی کی سخت ضرورت ہوتی ہے لیکن معاملہ برعکس پیش آتا ہے۔ تو وہ کہیں آزادی سے جا آ سکتے ہیں نہ ہی گھر والوں سے چھپ کر کچھ کھا پی سکتے ہیں لڑکی باورچی خانے میں اور لڑکا باپ کی دوکان پر اپنی بساط سے کہیں زیادہ محنت کرتے ہیں اور معاوضہ پانچ روپے ماہوار قوم کے لئے کس قدر باعث شرم ہے نہ معلوم والدین اپنے معصوم بے کس بچوں پر یہ ظلم کیوں روا رکھتے ہیں کیا ان کی آنکھوں کا نور دل کا سرور بدنصیب بیٹا اس ذلیل چھوکرے سے بھی گیا گذرا ہو گیا جو پانچ روپے تنخواہ کو حقارت سے ٹھکرا کر چلا جائے۔ کیا جو والدین اپنے فرزند ارجمند کی شادی خانہ آبادی پر رنڈیوں کو سنچ سکتے ہیں ہزاروں روپے دعوت ولیمہ میں برباد کر سکتے ہیں وہ اپنے نور نظر کی تنخواہ پانچ روپے سے بڑھا کر پچاس کبھی نہیں کر سکتے؟ لعنت ہے ایسی دولت پر جو محض نام و نمود کے واسطے استعمال کی جائے لیکن اپنی اولاد کے آرام و آسائش کے لئے حرام کر دی جائے۔ اگر کوئی نوجوان اپنی اس پریشانی کا دبی زبان سے بھی اظہار کرے تو ناخلف کہلاتا ہے اس سے کہا جاتا ہے کہ نالائق آخر تمہارے واسطے ہی یہ ساری دولت جمع ہو رہی ہے اور کیا ہم اپنی قبر میں ساتھ لے جائیں گے؟ لیکن کیا یہ نوجوان اپنی عمر کا بیشتر حصہ کڑھ کڑھ کر بے بسی کے عالم میں گزار دیں اور اسی انتظار میں در حین کھر بچوں کے باپ بن جائیں کہ کب باپ مرے اور کب دولت ہاتھ آئے اور پانچ روپے

کی نوکری سے چھٹکارا حاصل ہو؟ کیا وہ بیٹا اپنے باپ سے محبت کر سکتا ہے؟ کیا اس کے دل میں ذرہ بھر بھی اس کے باپ کے لئے احترام ہو سکتا ہے جو اس کی عمر کا بہترین حصہ یوں برباد کر دے اور دنیا کی نعمتیں اس پر حرام کر دے؟ ایک مشین کی طرح اس سے کام لے اور معاوضے میں پانچ روپے ہاتھ میں تھمائے کہ جاؤ بیٹا موج کرو؟ میرے سامنے ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جہاں نوجوانوں کی اپنی خداداد صلاحیت اور تجارتی قابلیت محض والد کی زیادتیوں کے باعث ختم ہو کر رہ گئیں۔ اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جہاں باپ اپنے بیٹے سے وہی کام پانچ روپے ماہوار دیکر حاصل کر لیتا ہے جو کہ ایک اچھا تجربہ کار منیجر سات آٹھ سو روپے ماہوار تنخواہ لیکر کر سکتا ہے۔ کسی انسان کی ذہانت اور قابلیت سے اتنا سخت ناجائز فائدہ اٹھانا میرے نزدیک ایک ناقابل معافی جرم ہے اور گناہ عظیم ہے دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ حصے میں انسانی محنت کو اس طرح ناجائز طور پر استعمال نہیں کیا جاتا مذہب بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ ہمارے رسول پاک تو اپنے غلام سے بھی بیٹے جیسا برتاؤ کرتے تھے نہ یہ کہ بیٹے کو غلام سمجھ لیا جائے

اس مالی پریشانی کو نوعمر جوڑا بڑی سختی سے محسوس کرتا ہے کمسن لڑکی شوہر کی اس مجبوری کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتی۔ ادھر لڑکا بیوی کے آرام و آسائش کے لئے کچھ نہیں کر سکتا اس پر نوعمر لڑکیاں ساس نندوں کے طعن تشنیع اور لڑائی جھگڑوں کو برداشت نہیں کر سکتیں شوہر اپنا خون پسینہ ایک کر کے بھی بیوی کو خوش نہیں رکھ سکتا نہ ہی اس میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی شریک حیات کو اپنے حالات سے باخبر کر سکے اور اس کی ہمدردی حاصل کر سکے رفتہ رفتہ دلوں میں شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں آپس میں ناچاقی پیدا ہوتی ہے اور پھر سسرال والے لڑکی کے زیورات وغیرہ چھین کر اسے میکے بھیج دیتے ہیں دونوں

طرف سے آمدورفت بند ہوجاتی ہے لڑکے والے نئی دلھن کی تلاش میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ درلڑکی والے طلاق کی فکر کرتے ہیں درتھوڑے ہی عرصہ میں دونوں کی نئی شادیاں رچائی جاتی ہیں

کس قدر شرم کی بات ہے کہ نکاح ایسے پاکیزہ فرض کو اپنے غلط مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اسلام نے نکاح اور طلاق کی سہولتیں مہیا کرکے جو احسان ہم پر کیا ہے ہمارا فرض تھا کہ اسے ناپاک ، ورناجائز طریقے سے کام میں نہ لاتے لیکن جہالت نے ہماری آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال رکھا ہے کہ ہم ان اختیارا کو شرمناک طور پر استعمال کرکے اپنے مقاصد حل کئے جاتے ہیں خدا تعالیٰ ایسے فعل کو ناپسند کرتا ہے ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں بارہا اسی طرح مذہبی احکامات کو توڑتے ہیں اور پھر بھی اپنے کو ایک سچا مسلمان سمجھ لیتے ہیں۔ درحقیقت اگر سوچا جائے تو جس طرح ہمارے یہاں نکاح عمل میں لایا جاتا ہے وہ شرعاً جائز قرار نہیں دیا جاسکتا اول تو عام طور پر لڑکا لڑکی دونوں نابالغ ہوتے ہیں وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ شادی ہے کیا بلا نہ ہی وہ ازدواجی زندگی کے فرائض کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں چنانچہ وہ نکاح کے عہد کو نبھانے کے ذمہ دار نہیں ہوسکتے دوئم شرعاً لڑکے اور لڑکی کی رضامندی لینا ضروری ہے ورنہ نکاح نہیں ہوسکتا لیکن شریعت کے اس اصول کو سو فیصدی رد کردیا جاتا ہے دونوں یہ نہیں جانتے کہ ہماری شادی کس سے ہو رہی ہے محض رسماً بوقت نکاح لڑکی سے اجازت حاصل کیجاتی ہے اور آنکھوں دیکھی بات ہے کہ خود دلہن کا سر پکڑ کر ہلا دیا جاتا ہے کیا یہ نکاح جائز ہوسکتا ہے؟ ہماری قوم کی ایک لڑکی کی منگنی ایک آوارہ بدچلن لڑکے سے کردی گئی وہ بیچاری مہینوں چھپ چھپ کر روتی رہی صحت بھی گرنے لگی والدین نے سب کچھ جانتے ہوتے بھی لڑکی کا شرعی حق اسے نہ دیا اور زبردستی اس کی شادی کردی گئی کیا اسلام اس نکاح کو جائز قرار دیتا ہے؟ ایک عورت کو اس کی مرضی کے خلاف اپنا جسم کسی مرد کے حوالے کردینے پر مجبور کردینا نکاح نہیں حرامکاری ہے اس ناجائز عمل کو نکاح کا پاکیزہ نام دینا اسلام کی توہین کرنا ہے۔

اختصار سے کام لیتے ہوئے میں اپنے بزرگوں اپنے بھائیوں بہنوں سے درخواست کرتی ہوں کہ قوم کی پیشانی پر سے ذلت کے اس سیاہ داغ کو مٹانے کی کوشش کریں آپ کے پاس دولت بھی ہے ذہانت بھی اپنی عقل کو استعمال کریں اور اپنی دولت کو صحیح طور پر خرچ کرکے اپنی قوم کو ایک ترقی یافتہ اعلیٰ طبقہ بنانے کی جدوجہد شروع کردیں اور خدارا جلد از جلد اس ناجائز طوائف بازی یا بازیچہ شادی و طلاق کی لعنت سے نجات حاصل کریں لیکن

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر!

زبان میں رکھنے کے لئے الفاظ

بے جوڑ شادیاں

پیش کرتی۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

عزیزی یہ صدر کی دکانیں اور کوٹھے کی چہل پہل کندھے پر رومال ڈالکر پہنچیگا نہ نماز ادا کرنے والوں کا انعام ہے جن کا نعرہ تھا "سوئیاں پیچکیں بہت باریک" اگر وہ بھی ان الجھنوں میں الجھ جاتے اور علمی اور ادبی رسائل میں دینوی اور دینوی فلاح ڈھونڈھنے لگتے تو ہم تو چھاپے کی مشینیں چلاتے یا کتابت کرتے۔

نیک مشورہ اپنے فاضل دوست کو میرا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ اگر آپ کو علم تعلقات مرد و زن سے دلچسپی ہے اور چاہتے ہو کہ اس پر لکھو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ تعلقات میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر خوب لکھا جاسکتا ہے جو سبق آموز بھی ہوگا اور جس میں اظہار علم بھی ہوگا

قتیل شفائی

یہاں ہر چیز بکتی ہے

جوانی، حسن، شہرت، عہد، پیماں، قہقہے، نغمے
رسیلے ہونٹ، شرمیلی نگاہیں، مرمریں باہیں

یہاں ہر چیز بکتی ہے
خریدارو! بتاؤ کیا خریدو گے؟

بھرے بازو، گٹھیلے جسم، چوڑے آہنی سینے
سسکتے پیٹ، روتی غیرتیں، تکتی ہوئیں آہیں

یہاں ہر چیز بکتی ہے
خریدارو! بتاؤ کیا خریدو گے؟

زبانیں، دل، ارادے، فیصلے، جانبازیاں، نعرے
یہ آئے دن کے ہنگامے، یہ روز و شب کی تقریریں

یہاں ہر چیز بکتی ہے
خریدارو! بتاؤ کیا خریدو گے؟

صحافت، شاعری، تنقید، علم و فن، کتب خانے
قلم کے معجزے، فکر و نظر کی شوخ تصویریں

یہاں ہر چیز بکتی ہے
خریدارو! بتاؤ کیا خریدو گے؟

اذانیں، سنکھ، حجرے، پاٹھ شالے، داڑھیاں، قشقے
یہ لمبی لمبی تسبیحیں، یہ موٹی موٹی مالائیں

یہاں ہر چیز بکتی ہے۔
خریدارو! بتاؤ کیا خریدو گے؟

علی الاعلان ہوتے ہیں یہاں سودے ضمیروں کے
یہ وہ بازار ہے جس میں فرشتے آ کے بک جائیں

یہاں ہر چیز بکتی ہے
خریدارو! بتاؤ کیا خریدو گے؟

سائنس کا حیرت انگیز کرشمہ

سائنٹفک طریقہ پر تیار کیا ہوا بال کیش ہیر ٹانک ان چار شکایتوں کیلئے اکسیر ثابت ہوا ہے (۱) بال گرتے ہوں۔ (۲) بال بڑھتے نہ ہوں (۳) سر میں گنج ہو (۴) کسی بیماری سے بال اڑ گئے ہوں۔ بال کیش ہیر ٹانک گرتے ہوئے بالوں کو تین ہی دن میں فائدہ دینا شروع کر دیتا ہے۔ بال کیش ہیر ٹانک سے بال بہت گھنے اور چمکیلے پیدا ہوتے ہیں۔ بیشمار عورتیں اور مرد جن کے بال اڑ گئے تھے بال کیش ہیر ٹانک کے استعمال سے اپنے لمبے لمبے بالوں پر فخر کرتے ہیں۔ قیمت:۔ فی شیشی تین روپے، نمونہ کی شیشی ایک روپیہ، محصول ڈاک نو آنے علاوہ ہے۔

دی گلوریس پرفیومری۔ پی۔ ڈی۔ صدر بازار دہلی

ہمارے علاوہ صرف دہلی کے لئے

الیس محمد اسحاق اینڈ سنز دواتی والے بلیماران دہلی۔ شیخ شمس العارفین دواتی والے فتح پوری دہلی

نیشنل اسٹور جنرل مرچنٹ شوارہ دہلی سے خریدیے

ہر ہفتہ

دیہات سے تازہ بتازہ خالص دیسی گھی

منگانے کا ہم نے مستقل بندوبست کیا ہے

اطمینان بخش چیز کے لئے پتہ نوٹ کر لیجئے

(پتہ یہ ہے)

روئی کی منڈی کی قدیمی مشہور دوکان

حافظ محمد صالحین عبدالستار اینڈ کو

گھی والے منڈی روئی دہلی

چہرے کی رونق کا راز

بالوں کی سیاہی میں پوشیدہ ہے اور بالوں کی سیاہی کیلئے اچھے اور مفید خضاب کی ضرورت

جہاز مارکہ خضاب

لاکھوں کا آزمودہ ہے اور استعمال کرنیوالوں کا خیال ہے کہ یہ بہترین خضاب ہے

سول اسٹاکسٹ

جمال الدین کمپنی سرائے حافظ ...

مشتاق احمد چاندنہ

ایک جنگ عظیم سنہ ۱۹۱۹ء سے دوسری جنگ عظیم سنہ ۱۹۳۹ء تک

مسئلہ اقلیت

یہ اقلیت اور اکثریت کا جھگڑا صرف ہندوستان میں ہی نہیں ہے۔ بلکہ باہر کے ممالک میں بھی ہے۔ چنانچہ جب پریسیڈنٹ ولسن کے حق خود اختیاری کے سوال کو سامنے رکھ کر یورپ میں نئی نئی سلطنتیں بنیں اور ان کی نئی سرحدیں مقرر کر دی گئیں تو یہ مسئلہ پھر ایک دفعہ اپنی بھیانک صورت لے کر دنیا کے سامنے آیا۔ کیونکہ اتنی ساری سلطنتیں بنانے کے باوجود بھی۔ لاکھوں لوگ ایسے رہ گئے تھے۔ جن پر غیر قومیں حکمران تھیں۔ لیکن شاطروں کے دماغ میں کوئی ایسی چال نہیں آسکی۔ جس سے وہ اس دشمن کو مات کر سکتے۔ کیونکہ اس طرح تقسیم کرنی کہ ایک قوم کی سلطنت الگ ہو۔ اور دوسری الگ۔ بالکل ناممکن تھی اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ ہر قوم کا ایک حصہ اپنی قوم کی سلطنت سے دور کسی اور قوم کے علاقہ میں آباد تھا۔ اور اس طرح آباد تھا کہ وہ درحقیقت اس دوسری قوم میں خلط ملط ہو چکا تھا۔ اور اگر اس قوم کی سلطنت وہاں قائم کی جاتی۔ تو اول تو وہ اپنی سلطنت سے دور ہوتی۔ اس لئے اس کا زندہ رہنا تقریباً مشکل ہوتا۔ اور دوسرے یہ کہ ایسا کرنے میں دوسری قوم کے لوگوں کا حق مارا جاتا۔ اور وہ اس کی غلامی میں ہو جاتے۔

مثلاً ہنگری کا جو علاقہ رومانیہ کو دیا گیا۔ اس میں ہر سو شخصوں میں سے ۳۴ رومانیہ کے، ۲۵ ہنگری کے اور باقی سیکسن قوم کے افراد تھے اور وہ علاقہ جس میں یہ کھچڑی پکی ہوئی تھی۔ ہنگری سے بہت دور تھا۔

کبھی کبھی ماہرین سیاست مدافعت یا اقتصادیت پر قوم کو قربان کرنا عین عقلمندی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ٹرینٹینو کا علاقہ اٹلی کو محض اس لئے دیا گیا۔ کہ وہ برنر کے درے پر اپنا قبضہ قائم کر سکے۔ حالانکہ ٹرینٹینو کی آبادی تقریباً سب کی سب آسٹروی تھی یہ تو تھی۔ جنگ کی مورچہ بندی کی بات اب اقتصادی حیثیت دیکھئے۔ پولینڈ کو وسٹولا دریا کے پاس کا ایک علاقہ اس لئے دیا گیا۔ کہ وہ سمندر کے قریب ہو جائے حالانکہ اس علاقہ میں اکثریت جرمنوں کی تھی اور پھر لطف سب سے زیادہ یہ کہ یہ علاقہ پولینڈ کو ملا تو اس کو سمندری تجارت کے لئے بندرگاہیں مل گئیں اور بے حد مفید ثابت ہوا۔ لیکن جرمنوں کے لئے یہ بہت بڑا ظلم تھا کیونکہ یہ علاقہ پولینڈ کو مل جانے کی وجہ سے مشرقی جرمنی باقی جرمنی سے الگ ہو گیا۔

آسٹریا چونکہ مفتوح ملک تھا۔ اس لئے اس کو سمندر سے ملانے کیلئے کوئی علاقہ نہیں دیا گیا۔

وہ تمام ممالک جو لڑائی ہار گئے تھے۔ انہوں نے اس بندر بانٹ کو بری طرح محسوس کیا۔ کیونکہ ہارے ہوئے ممالک کی سلطنتوں میں سے کچھ نہ کچھ کر سلطنت مضبوط کی گئی تھی۔ انہوں نے دیکھا۔ کہ اپنی حکومت کا تختہ پلٹ کر بعد اتحادیوں سے صلح کر کے انہوں نے کتنی بڑی غلطی کی ہے اب انہوں نے سمجھا کہ باعث صلح دو بڑی طاقتوں

کے درمیان ہوا کرتی ہے کمزور اور طاقتور ملکوں کے درمیان نہیں کیونکہ اتحادی گروہ اس وقت اپنی طاقت کے بل بوتے پر وہ کچھ کر رہا تھا۔ جو صرف فاتح گروہ کیا کرتا ہے حالانکہ لڑائی فتح و شکست پر ختم ہوئی نہیں تھی بلکہ صلح پر ختم ہوئی تھی۔ لیکن اتحادی گروہ نے دوسرے گروہ کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو ایک ہارے ہوئے دشمن سے کیا جاتا ہے چنانچہ ان کے علاقوں کو فاتح گروہ نے آپس میں بانٹ لیا اور یہی وہ چیز تھی۔ جو دوسرے گروہ کو بدلا لینے کے لئے اکسا رہی تھی۔

اس طرح اس نئے نقشہ نے پرانی گتھیاں سلجھانے کے بجائے کچھ اور نئی گتھیاں الجھا کر رکھ دیں۔ جو مستقبل میں لڑائی ہونے کے بہت سے اسباب میں سے ایک ثابت ہوئیں

آئندہ کے امن کے لئے بہت ضروری تھا کہ یہی دوستی اور ہمدردی ہمسایہ ممالک کے درمیان پیدا ہو لیکن اس کے برخلاف ہوا کیا۔ یہ ہوا کہ اتحادی گروہ نے اس صلح نامہ کا فائدہ اٹھانے والا واحد گروہ تھا۔ ان غیر ملکی لوگوں پر جو اس صلح نامہ کی شرطوں کے مطابق اپنی پرانی حکومت کی رعایا ہونے کے بجائے اتحادی گروہ کے کسی ملک کی رعایا بننے پر مجبور تھے کافی مظالم کئے حتیٰ کہ ان پر یہ دباؤ بھی ڈالا گیا کہ وہ اپنی زبان چھوڑ کر اس حکومت کی زبان بولنے لگیں اس کے سوا وہ بھی ان پر سختی اس لئے روا رکھی گئی کہ وہ اپنے ادب اپنی قومیت سب کو بھول جائیں۔ درحالیکہ یہ طریقہ اقلیتوں کو اپنی حالت پر مگن رکھنے کا نہیں تھا چنانچہ غاصب گروہ کی ان سختیوں نے ان لوگوں کو جن کی سلطنتوں کی سرحدیں اس علاقہ سے ملی ہوئی تھیں۔ جہاں وہ مظالم کا شکار ہو رہے تھے۔ اور ان سلطنتوں کے باشندوں کو بھی ایک بہانہ دیدیا جس سے انھوں نے بعد میں کام لیا۔ اور مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ ان کے بھائی جس علاقہ میں آباد ہیں۔ وہ علاقہ ان کو دیدیا جائے۔ تاکہ وہ سب ایک وطن میں ہو جائیں مثلاً جرمنی کے چاروں طرف کی نئی سلطنتوں میں جرمنی آباد تھے اور ہٹلر چاہتا تھا۔ کہ وہ سب علاقے جرمنی میں شامل کر دیئے جائیں۔ تاکہ دوسری سلطنتوں کی جرمن زبان بولنے والی آبادی جرمنی سے مل جائے۔ یہ ہی وہ نظریہ ہے کہ جس کو اس نے اپنی کتاب "میری جدوجہد" میں بیان کیا تھا۔ اور اسی نظریہ کی خاطر اس نے آسٹریا "زیکوسلواکیہ" اور پولینڈ پر قبضہ کرنا چاہا یہ کہدینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس نظریہ پر عمل کرنے کی جو کوشش کی گئی۔ تو دنیا کو ۱۹۳۹ء میں پھر لڑائی کی بھٹی میں جھونکنا پڑا۔

جرمنی کی سزائیں

صلح نامہ ورسائے کی شرطوں کی رو سے جرمنی کو سزائیں دی گئیں تھیں۔ دنیا کو جنگ میں دھکیلنے کی یا ہار جانے کی۔ ان میں سے بعض ایسی تھی جن سے جرمنی کو بہت ہی زیادہ نقصان پہنچا۔ مثلاً۔

۱۔ جرمنی کو اپنی تمام نوآبادیوں سے جو افریقہ کے چار خطے بڑے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہاتھ دھونے پڑے اور وجہ اس کی یہ بتائی گئی کہ جرمن اس قابل نہیں ہیں۔ کہ نوآبادیات پر مناسب طریقہ سے حکومت کر سکیں۔ حالانکہ دو وجہیں درحقیقت بہت اہم ہیں لیکن وہ بتائی نہیں گئیں۔ اول تو یہ کہ نوآبادیات پر برطانیہ اور فرانس کے دانت مدت سے لگے ہوئے تھے۔ اور دوسرے اس طریقہ سے جرمنی کو اتنا کمزور بنا دینا مقصود تھا کہ وہ سر نہ اٹھا سکے چنانچہ ان علاقوں کو برطانیہ، فرانس، بلجیم کی ولایت میں دیدیا گیا۔ کاغذی طور پر یہ علاقہ ان کی ملکیت نہیں تھا۔ اور وہ ہر سال قوموں کی جماعت کے سامنے ان علاقوں کے حالات اور واقعات بیان کرنے کے پابند تھے لیکن عملی طور سے وہ ان کی ہی ملکیت ہو کر رہ گئے تھے۔

۲۔ جرمنی کو اس نقصان کی تلافی کرنے کے لئے۔ جو اس کی لڑائی میں شریک ہونے کی وجہ سے دنیا کو برداشت کرنا پڑا تھا تاوان جنگ ادا کرنا پڑا جو رقم بعد میں طے کی گئی وہ چھ ارب ساٹھ

کروڑ پونڈ تھی۔ یعنی تقریباً اٹھاسی ارب روپے تھی۔

سے جرمنی کو رائین لینڈ کی مغربی سرحدوں پر جو فرانس، ہولینڈ، اور بلجیم سے ملتی تھی۔ کسی قسم کی قلعہ بندی کی اجازت نہیں تھی۔ اور دریائے رائین دریا سے تقریباً چالیس میل مشرق تک وہ کسی قسم کے حملے سے بچاؤ کے لیئے قلعہ بندی کر سکتا تھا۔ یورپ کے نقشہ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہو جائیگا کہ اس ممانعت کا مقصد کیا تھا۔ صاف ظاہر ہو جائیگا کہ اس کا مقصد یہ تھا۔ کہ جرمنی کی طرف سے ذرا بھی لڑائی کے آثار ظاہر ہوں اور اتحادی فوجیں بہت آسانی سے دریائے رائین اور اس طرح جرمنی کی مغربی سرحدیں محافظ فرانس کو دعوت حملہ دیتی رہیں۔

ملک اس علاقہ رائین لینڈ میں صلح ہونے کے بعد بھی اتحادی فوج کا قبضہ کافی مدت رہا۔ یہ دیکھنے کے لیئے کہ صلح نامہ کی شرطوں پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔

۵ اس عہدنامہ پر دستخط کر کے جرمنی نے اپنے کو جنگی مجرم تسلیم کیا۔ اور یہ بھی کہ یہ لڑائی اس کی وجہ سے چھڑی گئی۔

قوموں کی جماعت

برہمن از بیر بہشتی و دانسم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند
(اقبال)

معاہدات ورسائے کے تمام عہدنامے قوموں کی جماعت کی رضامندی سے کیئے گئے اور یہ رضامندی اس لیئے حاصل کی گئی تھی۔ کہ اگر کل کو کوئی اونچ نیچ ہو۔ تو ذمہ داری سب کی ہو۔ اب میں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ یہ قوموں کی جماعت تھی۔ کیا اور اس کا طریقہ کار کیا تھا۔ یہ کیا تھی اس کا اندازہ کچھ تو آپ کو اقبال مرحوم کے شعر سے ہو گیا ہوگا اور کچھ یہ حاضر ہے۔

قوموں کی جماعت اس لیئے قائم کی گئی تھی۔ کہ آئیندہ مختلف ممالک کے درمیان جو جھگڑے ہوں۔ ان کا فیصلہ تلوار کے ذریعہ نہ ہو۔ بلکہ زبان اور قلم کے ذریعہ ہی ہو جائے۔ اس جماعت کی ایک اسمبلی تھی۔ جس میں ہر ملک کو ایک ایک ووٹ حاصل تھا اور ایک کونسل تھی۔ جس میں بڑی بڑی طاقتوں کا نمائندہ تو ہمیشہ رہتا تھا۔ اور چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کا نمائندہ اپنی باری پر آتا تھا۔ ایک اس کا دفتر تھا۔ سوئیٹزرلینڈ کے شہر جینوا میں جس کو سکریٹریٹ کہتے ہیں اور ہالینڈ کے شہر ہیگ میں اس کی ایک عدالت تھی۔ جس کا کام تمام دنیا کے لیئے انصاف کرنا تھا۔ اسمبلی ہر سال ستمبر کے مہینہ میں جینوا میں بیٹھتی تھی۔ کچھ کچھ باتوں میں یہ اسمبلی اور ملکوں کی اسمبلیوں اور پارلیمانٹوں سے ملتی جلتی تھی۔ لیکن ایسے قوانین بنانا جس پر ہر ملک پابندی کے ساتھ عمل کرے۔ اس کے بس سے باہر تھا۔ بلکہ یہ صرف سفارشات کرتی تھی کہ ایسا کر لو۔ ایسا کر لو۔ اب یہ ہر ملک کی اپنی مرضی پر ہوتا تھا کہ وہ اس پر عمل کرے یا نہ کرے۔

کونسل سال میں کم از کم تین دفعہ بیٹھتی تھی۔ اور اس کا کام زیادہ تر یہ تھا کہ اگر دو ملکوں میں جھگڑا ہو یا ہونے کا امکان ہو تو اس کو آپس میں ختم کرا دیں اور لڑائی کے میدان تک نہ جانے دیں گویا پنچ بن کر ایسا حل تلاش کرنے تھے جس کو دونوں فریق تسلیم کریں۔

سکریٹریٹ کا کام یہ تھا کہ تمام ان معاملات کی اطلاع رکھے جو ممبر ممالک میں سے کسی کے لیئے کارآمد ثابت ہو سکے یہ دفتر صرف ان معاملات کی ہی خبر نہ رکھتا تھا۔ جن سے آیندہ لڑائی کا خطرہ ہو۔ بلکہ بہت سے عام بین الاقوامی معاملات کی بھی خبر رکھتا تھا۔ مثلاً صحت عامہ، بار برداری وغیرہ

کبھی کبھی مختلف قوموں کے درمیان جھگڑوں کی بنیاد انہیں بین الاقوامی قوانین پر ہوتی تھیں۔ جو گذشتہ کانفرنسوں میں اسی قوموں کی جماعت نے منظور کیئے تھے۔ اس قسم کے جھگڑے "عدالت دنیا" میں چکائے جاتے ہیں جو جیسا میں نے پہلے عرض کیا۔ ہالینڈ کے شہر ہیگ میں قائم تھی۔ یہ خاص قسم کی بین الاقوامی عدالت قانون

تھی۔ اور اس میں مختلف قوموں کے دائر کئے ہوئے مقدمات پر اسی طرح غور کیا جاتا تھا جیسے کہ ہماری عدالتیں عام شہریوں کے مقدمات پر غور کرتی ہیں۔

جماعت ۱۹۲۰ء کے جنوری میں پریسیڈنٹ ولسن کی بدولت عالم وجود میں آئی کیونکہ وہی ایک واحد شخص تھے۔ جن کی کوششوں سے یہ عہدنامہ کی شرائط ہی میں داخل کر لی گئی۔ ورنہ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ایسا ہونا ناممکن تھا۔ لیکن اس کے باوجود امریکہ کی مجلس اعلیٰ نے اس سے کسی قسم کا تعلق قائم کرنا منظور نہیں کیا۔ اور اس طرح قوموں کی اس جماعت کو اپنا کام بغیر امریکہ کے شروع کرنا پڑا۔ جو اس وقت سب سے زیادہ مالدار اور سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ با اثر سلطنت تھی۔ گمان غالب ہے کہ جو کچھ خلاف ورزیاں معاہدوں کی دونوں فریقوں نے کیں وہ بالکل نہ ہوتیں۔ اگر قوموں کی جماعت کو امریکہ کی امداد اور پشت پناہی حاصل ہوتی۔

جرمنی کو شروع میں اس جماعت میں شامل نہیں کیا گیا تھا اور روس کی حیثیت تو ایک اچھوت کی سی تھی۔ کیونکہ وہ بالشویک تھے۔ اور ان کے ہاں مزدوروں کی اور کسانوں کی حکومت تھی۔ جو مہذب دنیا میں سب سے نچلے طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔

جرمنی کو ۱۹۲۶ء میں اس جماعت میں شریک کر لیا گیا۔ لیکن امریکہ پھر بھی شریک نہیں ہوا۔ گو اس نے اتنا ضرور کیا کہ لیگ سے کئی طریقوں سے تعاون برتتا رہا۔

"مزدوروں کی بین الاقوامی جمعیت"

یہ جماعت بھی انہیں بنیادوں پر قائم کی گئی تھی۔ جن پر لیگ قائم ہوئی تھی۔ اور صحیح معنوں میں یہ لیگ اوف نیشنز (قوموں کی جماعت) کی ہی ایک شاخ تھی۔ اس کی حیثیت ایک مرکز کی سی تھی جہاں پر تمام دنیا کے مزدوروں کے بارے میں انسان سے متعلق اقتصادی شعبوں کی معلومات جمع ہوتی تھیں اس کے جلسوں میں دنیا بھر کی حکومتوں کے "مزدوروں کے اور کارخانہ داروں کے نمائندے شریک ہوتے تھے۔ اور اس قسم کی تجویزیں طے کرتے تھے اور قانون بناتے تھے جو ساری دنیا کے مزدوروں اور کارخانہ داروں کے معیار زندگی کو بلند کرنے میں مدد دیں۔ کچھ مختلف ملکوں نے اس جماعت کی طے کی ہوئی تجویزوں پر عمل کیا۔ اور اس کے نتیجہ کے طور پر ان کے ہاں کے مزدوروں کی حالت کافی بہتر ہو گئی۔

امن قائم رکھنے کی کوشش ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک

"دنیا ابھی پستی میں ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد حالت بہتر ہو گی اور اس کے بہت تھوڑے عرصہ کے بعد ہی شیطان ساری دنیا پر چھا جائے گا" یہ پیشین گوئی صلح کانفرنس میں امریکہ کے ایک نمائندہ جنرل بلس نے عہدنامہ ورسائیے کی شرطوں کو دیکھ کر کی تھی اور وقت آنے پر یہ پیشین گوئی حرف بحرف سچ ثابت ہوئی پستی کی حالت اس وقت تک ختم نہ ہوئی۔ جب تک کہ اسٹریسمین نے جرمنی حکومت کی باگیں نہ سنبھال لیں۔ اور عہدنامہ کی شرطوں پر تندہی سے عمل کرنا شروع نہ کر دیا (آگے ملاحظہ کریں)

۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۹ء تک جب کہ اسٹریسمین مدبر جاری رہا۔ وہ بہتر حالت کا زمانہ تھا۔ جس کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ اب دنیا کی حالت بہتر ہو گئی ہے۔ لیکن یہ بات بالکل ویسی ہی تھی۔ جیسے ریگستان میں دور سے چمکتی ہوئی ریت پانی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۱۹۲۹ء سے ایک سلسلہ سیاسی اور اقتصادی بحران کا ایسا شروع ہو گیا جس کی ایک کڑی دوسری سے زیادہ خطرناک تھی۔ اور اتنی سخت ثابت ہوئی۔ کہ اس کو توڑنا مشکل ہو گیا۔ یہاں تک کہ دس برس کے بعد اس کی ہی بدولت دنیا نے اپنے کو پھر ایک دفعہ میدان جنگ میں پایا۔

"نیا جرمنی"

نومبر ۱۹۱۸ء میں لڑائی ختم ہو گئی۔ اور ۱۹۱۹ء میں سرکاری طور پر لڑائی ختم ہو گئی لیکن جرمنی میں امن کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ عارضی صلحنامہ پر دستخط ہونے سے دو دن پہلے ہی قیصر جرمنی سے فرار ہو کر ہالینڈ میں جا چھپا تھا۔ چنانچہ پرانی حکومت دم توڑ چکی تھی۔ اور ایک عارضی حکومت ایک شخص ایبرٹ کو صدر بنا کر جمہوریت کے طرز کی قائم کر لی گئی تھی۔ یہ شخص پہلے ہائیڈل برگ میں زین ساز تھا۔ ایبرٹ طبعاً درمیانہ مذہب کا اشتراکی تھا۔ چنانچہ اس کی خواہش تھی۔ کہ جرمنی میں جمہوری حکومت ہو۔ لیکن جمہوری حکومت قائم کر دینا تو آسان ہوتا ہے مگر اس کو قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہ نسبت اور دوسرے طرز حکومت کے۔ کیونکہ یہ کام ہر شخص کے ساتھ مساوات چاہتا ہے ہر شخص کی رضامندی چاہتا ہے کہ وہ اپنی رائے پر اکثریت کی رائے کو فضیلت دے۔ اور اکثریت کے فیصلہ کے سامنے سر جھکا دے۔ اور اگر کسی قانون کو بدلنا چاہے تو یہ کام پر امن طریقے اور قومی مجلس کے ذریعہ کرے۔ یہ کام چاہتا ہے کہ سربرآوردہ گروہ اقلیت کے حقوق کو سمجھیں۔ اور اپنے کو ان سے بلند نہ سمجھیں۔ اور اگر وہ حکومت پر اپنی پارٹی کا قبضہ چاہتے ہوں۔ تو خود کو منظم کریں اور اگر وہ اکثریت کی تائید و حمایت حاصل کر سکیں۔ تو بے شک پرانے لیڈروں کی جگہ لے لیں۔

اس کے برخلاف جرمنی میں مساوات کا کہیں پتہ بھی نہیں تھا۔ جرمنوں کو جمہوری طرز حکومت کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا کیونکہ اب تک وہ بادشاہوں کے ماتحت رہتے تھے۔ اور اس سب کے علاوہ یہ بھی کہ جرمنوں کو اس طرز حکومت پر اعتقاد بھی نہیں تھا۔ چنانچہ مساوات ہوتی تو کہاں اور ایسے لوگوں سے مساوات کی امید بھی کیسے کی جا سکتی ہے جن کو جنگ نے فاقہ کش اور امن نے ذلیل کر رکھا تھا۔ جو عہد نامہ ورسائی کے

تحفظ تھا۔

ایک طرف کمیونسٹ تھے جو حکومت میں ایسا ہی انقلاب لانا چاہتے تھے جیسا کہ روس میں آیا تھا۔ اور اسی طرح مزدوروں اور کسانوں کی حکومت چاہتے تھے۔ دوسری طرف وہی پرانے خیالات کے لوگوں کی جماعت تھی۔ جس میں فوج کے عہدیدار اور جاگیردار وغیرہ شامل تھے۔ یہ لوگ اسی شہنشاہیت کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جس کو کچھ ہی دن پہلے خود ان میں سے بعض لوگوں نے اوروں کے ساتھ مل کر ختم کیا تھا۔ ایک بات دونوں گروہ کے درمیان ایک سی تھی۔ وہ یہ کہ دونوں کے دونوں تشدد کے ذریعہ طاقت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایک دفعہ کمیونسٹ گروہ نے جنوری ۱۹۱۹ء میں طاقت حاصل کرنے کی کوشش کی تو بچی کچھی شاہی فوج کی مدد سے اس کو دبا دیا گیا۔ اور کمیونسٹ لیڈر کارل لیبنخت اور روزا لکسمبرگ کو پکڑ لیا گیا۔ جن کو پولیس نے جیل خانہ لے جاتے ہوئے مار ڈالا۔ سوا سال کے بعد شہنشاہیت پسند گروہ نے ایبرٹ کی حکومت کو برلن سے نکال دیا۔ اور اپنے سرکردہ شخص فان کاپ کو جمہوریت کا صدر مقرر کر دیا لیکن برلن کے عام لوگوں کو یہ چیز پسند نہ آئی اور چنانچہ برلن کے مزدوروں نے عام ہڑتال کر دی اور نتیجہ کے طور پر شہر والوں کو نہ پانی ملا۔ نہ گیس اور نہ بجلی اور کرایہ کی گاڑیاں موٹریں بھی بند ہو گئیں۔ اس طرح نقل و حرکت بھی ختم ہو گئی اور وہ تو خیریت ہوئی کہ فان کاپ اپنی جان سلامت لے کر سویڈن بھاگ گیا۔ ورنہ خدا جانے یہ علم تشدد تشدد کی کون سی صورت اختیار کرتا۔ غرض یہ ہے کہ اس طرح اس جماعت کی حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش ناکام ہو کر رہ گئی۔

اس عرصہ میں جرمنی کے لوگوں نے ایک جماعت کا انتخاب کیا۔ جو جرمنی کے قانون بناتے یہ جماعت ویمر کے مقام

پر ۱۹۱۹ء میں قانون بنانے کے لئے بیٹھی۔ چناؤ کے نتیجہ سے معلوم ہوا کہ اکثریت درمیانہ درجہ کی جمہوری حکومت چاہتی ہے۔ امریکہ کی حکومت کی طرح کی چنانچہ جمہوری طرز حکومت کے جو قوانین بنائے گئے وہ قریب قریب ایسے ہی تھے۔ جیسے کہ برطانیہ امریکہ یا فرانس میں رائج تھے۔ لیکن سوال صرف یہ رہ گیا تھا کہ کیا یہ قوانین کام دیں گے کیا ان پر عمل ہوگا یا نہیں؟ خود ملاحظہ کیجئے

لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ اور اس نعرے کے ساتھ ختم ہوئی تھی کہ اب سب کے ساتھ انصاف ہوگا۔ کیونکہ یہ جنگ دنیا کی جمہوریت پسند آبادی کے بچاؤ کیلئے لڑی گئی تھی۔ لیکن ورسائے کے حکم نامہ نے جرمنی کی اس نئی جمہوریت کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس عہد نامے نے اس نومولود جمہوریت کے کفن دفن کا سامان مہیا کر دیا کیونکہ اس وقت جب کہ جرمنی کی منتخب جماعت ویمر میں قانون بنا رہی تھی۔ اتحادیوں نے اسی عارضی حکومت کے نمائندوں کو ورسائے میں ایسے عہد نامہ پر دستخط کرنے کیلئے طلب کیا جسکی شرائط جرمنی کے لئے اتنی سخت اور تباہ کن ہوں گی اس کا خواب میں بھی ان کو خیال نہیں آیا تھا گو جرمن نمائندوں نے اس پر مجبوری دستخط کر ہی دیئے کیونکہ اس کے سوائے ان کے پاس کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ لیکن جرمنی کی نئی جمہوریت کے لئے بسم اللہ ہی غلط معاملہ ثابت ہوا۔ کیونکہ اس پر جرمن عوام نے عہد نامہ کی سخت شرائط قبول کر لینے کا نامناسب الزام لگایا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر اس حکومت کو عوام کی ہمدردی نہ مل سکی۔ اور اس کو ہمیشہ ناکامی اور تکالیف کا ہی سامنا کرنا پڑا۔ بخلاف اس کے اگر عہد نامہ کی شرائط میں کچھ نرمی کر دی جاتی ہے۔ تو یہ اس جمہوریت کی کامیابی سمجھی جاتی۔ اور جرمن عوام کو اس سے ہمدردی ہو جاتی۔ اور نتیجہ شاید وہ نہ نکلتا۔ جو بیس برس بعد نکلا۔

فرانس نے پیچ کسنے شروع کر دیے

موسیو کلیمنسو

فرانس کے وزیراعظم کی ہی مہربانیوں سے عہدنامہ ورسائے کی شرائط منظور ہوئی تھیں۔ لیکن فرانس کے عام لوگوں کی ذہنیت کتنی انتقام کی پیاسی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے خیال میں موسیو کلیمنسو نے اتنی سخت شرطیں پیش نہیں کیں۔ جتنی کہ ان کو پیش کرنی چاہیے تھیں۔ اور اس کی سزا ان کو یہ ملی کہ ۱۹۲۰ء میں جب وہ فرانس کی جمہوریت کی صدارت کیلئے کھڑے ہوئے تو بری طرح ہارے کیونکہ فرانسیسیوں کے خیال میں ان کا یہ جرم اتنا ہی بڑا تھا کہ سخت شرطیں کیوں نہ حاصل کیں

یہاں پر یہ یاد دلانا بیجا نہیں ہوگا۔ کہ فرانس نے اس لڑائی میں برطانیہ اور امریکہ سے زیادہ وسیع اور مہلک زخم کھائے تھے۔ کیونکہ پورے چار برس تک یہ لڑائی فرانس کی سرزمین پر لڑی گئی تھی۔ اور اس کے شمالی صوبوں کے تمام شہر اور گاؤں کھنڈر بن چکے تھے۔ جنگلات میں سوائے جھلسے ہوئے جھاڑ جھنکار کے کچھ نہیں بچا تھا۔ پانچ برس کے بعد جب کھیت دوبارہ جوتے جانے لگے تو ان میں پچھلی تباہی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ہل چلاتے وقت ماضی کا کوئی ہولناک نشان کب تک نکل آئیگا۔ چنانچہ یہ خیال ہر فرانسیسی کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ کہ یہ بات دوبارہ نہیں ہونی چاہیئے اور اس کی ہمارے پاس پکی ضمانت ہونی چاہیئے۔ کہ اب ایسا نہ ہوگا

وہ اس لڑائی کا ذمہ دار صرف جرمنی کو ٹھہراتے تھے۔ اور ان کو ڈر تھا۔ کہ جرمنی اپنی اس ذلت کا بدلا لینے کے لئے کبھی نہ کبھی پھر سر اٹھائیگا۔ اور یہی ان کو منظور نہیں تھا۔ کیونکہ اس لڑائی کی تباہی نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ اور وہ پھر اس تباہی سے گلے ملنے کو تیار نہیں تھے۔ چنانچہ اس چیز کی ضمانت کا کہ جرمنی پھر حملہ نہیں کرے گا۔

ان کے خیال میں ایک ہی طریقہ تھا۔ وہ یہ کہ جرمنی کو بالکل پیس ڈالا جائے اتنا کچلا جائے کہ وہ حملہ کا خیال چھوڑ دے۔ کچھ لوگ اس کے جواب میں قوموں کی جماعت کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ کہ یہ ہے تمہاری ضمانت۔ پچاس سے زیادہ قومیں اس نئے اور بہتر راستہ پر چلنے کی پابند ہیں۔ اور اس بات پر متفق ہیں کہ اب پھر لڑائیاں نہیں لڑی جائیں گی لیکن فرانسیسیوں کے لیے صرف یہی بات کافی نہیں تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ ممکن ہے کہ یہ نئی جماعت کامیاب ہو جائے اور آئندہ لڑائی نہ ہو۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ ناکام ہو جائے اور اگر ایسا ہو تو کیا ہوگا وہ اس خیال سے ہی کانپ اٹھتے تھے۔ اسی لئے وہ اس سے بھی زیادہ پکی ضمانت چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جرمنی کو ہرگز ہرگز اس امر کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ دوبارہ قوت حاصل کرے اور حملہ کرے۔ اور اگر یہ بفرض محال اتنی قوت حاصل کر بھی لے اور حملہ کر دے۔ تو دوسرے ممالک اس کی حامی بھر لیں کہ وہ فرانس کی مدد کریں گے۔

فرانس کی اس خواہش ضمانت کو شروع میں ہی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کیونکہ صلح کانفرنس میں تو امریکہ اور برطانیہ نے فرانس کو اطمینان دلا دیا کہ اس کی مشرقی سرحدوں پر حملہ ہوا تو وہ دونوں اس کی مدد کو پہنچ جائیں گے۔ اور اسی وعدے سے مطمئن ہو کر موسیو کلیمنسو نے اتنی ہی شرطوں پر صبر کر لیا اور اس سے زیادہ سخت شرطوں پر اصرار نہیں کیا۔ اور عہد نامے پر دستخط کر دیئے لیکن ان کو یہ خیال نہ آیا کہ تمام عہد نامے منظوری کے لئے اس ملک کی پارلیمنٹ میں بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ جس کے نام پر اس پر دستخط کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ جب یہ عہد نامہ منظوری کے لئے امریکہ کی مجلس اعلیٰ کے سامنے پیش ہوا تو اس کے ممبروں نے فرانس کو ایسی ضمانت دینے سے صاف انکار کر دیا اب رہا برطانیہ تو اس کا مدد کا وعدہ ہی یہ تھا۔ کہ اگر امریکہ نے ضمانت دی تو برطانیہ بھی منظور کرے گا۔ چنانچہ جب امریکہ نے انکار کر دیا۔ تو برطانیہ نے بھی انکار کر دیا۔ ماہرین سیاست کی رائے ہے کہ اگر امریکہ کے مکر جانے کے بعد بھی برطانیہ اپنے وعدہ پر قائم رہتا۔ تو اس جنگ کے بعد کے واقعات کی تاریخ بہت کچھ بدلی ہوئی ہوتی

فرانس کو ایک اور دھکا اس صورت سے لگا۔ کہ امریکہ نے قوموں کی جماعت کی مجلس اعلیٰ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور یہ فیصلہ کیا۔ وہ قوموں کی جماعت سے الگ رہے گا۔ اس اعلان نے فرانس کی رہی سہی امیدیں خاک میں ملا دیں۔ چنانچہ اس کے بعد فرانس نے اپنا اطمینان کرنے کے لئے دوسرے داؤ پیچ کھیلنے شروع کئے اور وہ کچھ کیا۔ جو اسے نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اور جو وہ یقیناً نہ کرتا۔ اگر امریکہ نے یہ اعلان نہ کیا ہوتا۔

پہلا داؤ جو فرانس نے کیا وہ یہ تھا۔ کہ اس نے مطالبہ کرنا شروع کیا کہ تاوان جنگ کی رقم جو بعد میں مقرر کرنے کے لئے چھوڑ دی گئی تھی۔ اب طے کی جائے۔ اور یہ رقم اتنی زیادہ مقرر کی جانی چاہیئے کہ جرمنی بالکل کچل کر رہ جائے اور اس کی ادائیگی اس کو اتنا کمزور کر دے کہ وہ کم از کم ایک نسل تک تو سر نہ اٹھا سکے۔ چنانچہ اتحادیوں کی ایک کمیٹی بیٹھی۔ تاکہ تاوان جنگ مقرر کرے۔ برطانیہ کے ماہرین مالیات نے بہت غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا۔ کہ جرمنی زیادہ سے زیادہ جو رقم ایک سال میں ادا کر سکتا ہے۔ وہ دو ارب پونڈ (۲،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰) ہے (یعنی تقریباً ستائیس ارب روپے) لیکن فرانس نہ راضی ہوا۔ چنانچہ یہ اضافہ اور کیا گیا کہ جرمنی نہ صرف اس مالی نقصان کا تاوان ادا کرے۔ جو اس کی وجہ سے تمام دنیا کو برداشت کرنا پڑا ہے بلکہ وہ تمام پنشنیں بھی وہی ادا کرے جو ہلاک شدہ سپاہیوں کے وارثوں کو اور ایسے لوگوں کو دی جانے والی تھیں۔ جو اس لڑائی کی بدولت اپاہج ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ برطانیہ اور فرانس کے ماہرین مالیات اور ماہرین سیاست کے درمیان بہت سی کانفرنسوں میں بڑی رد و قدح اور کٹ حجتی کے بعد اس رقم کا فیصلہ ۶،۶۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ (چھ ارب ساٹھ کروڑ پونڈ)

یعنی تقریباً اٹھاسی ارب روپے) پر ہوا

برطانیہ چونکہ اپنے کو زیادہ محفوظ سمجھ رہا تھا۔ اس لئے وہ ماضی کے واقعات کو درگذر کرنے کو تیار تھا۔ اس لئے اور بھی کہ اس کو اتنا زیادہ نقصان ہوا تھا۔ اور نہ ہی اس کو جرمنی سے کوئی فوری خطرہ تھا۔ اس لئے وہ دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک باعزت اور مغرور قوم کو ایک لامحدود عرصہ کے لئے دبا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ چنانچہ اس کا خیال تھا۔ کہ دوستانہ تعلقات ضمانت کا زیادہ بہتر طریقہ ہیں۔ لیکن فرانس کا تو دل جلا ہوا تھا۔ اس لئے اس آنکھیں بالکل بند تھیں۔ اور اس کو سوائے اس کے کچھ خیال نہیں تھا۔ کہ جرمنی کو کچل ڈالو۔ ختم کر ڈالو۔ تاکہ یہ خطرہ ختم ہو جائے۔ اس کا کہنا یہ تھا۔ کہ برطانیہ کی باتیں تو پیٹ بھرے ساہوکار کی باتیں ہیں اس نے لڑائی میں کھویا تو کچھ نہیں۔ البتہ حاصل بہت کچھ کر لیا ہے جس کو وہ اپنے قبضہ میں رکھنے کے لئے جرمنی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس سے یہ سب واپس لے لے۔ اور اس سب سے زیادہ یہ ہے کہ برطانیہ کی تو زندگی کا دارومدار ہی بیرونی تجارت پر ہے۔ جو فرانس کی تجارت سے کہیں زیادہ ہے اور اس کو تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ دیوالیہ جرمنی سے تجارت ناممکن ہے۔ چنانچہ وہ اپنی بات پر اڑا رہا کہ صلح نامہ کی شرطوں کی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جائے کیونکہ اس کا یہ ایمان تھا کہ جرمنی تاوان جنگ کی اتنی بڑی رقم کبھی ادا نہ کر سکے گا اور تاوان کی ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں فرانس کو موقع مل جائے گا۔ کہ وہ جرمنی کو اور زیادہ اپنے چنگل میں پھنسا لے۔ اور یقیناً یہی نظریہ لیکر جرمنی کا سب سے بڑا دشمن پوانکارے ۱۹۲۲ء میں فرانس کا وزیر اعظم مقرر ہوا۔

یہ آنسوؤں کی جھڑی اور سکون موت

تیرے خیال کو جھوٹا جھٹلا رہا ہوں میں

آئندہ شمارہ کی ایک جھلک

خطبہ صدارت مولانا ابوالکلام آزاد (طلوع اسلام)
جدید ادب کی چند اصطلاحات (عبدالرحمٰن صدیقی)
ایک جنگ عظیم سے (مشتاق احمد سید چاندنہ)
مسلم لیگ کی ممبر سازی اور میرے تجربات (آفتاب بیگم)
پھپھی ...... (فاطمہ سلطان)
اچھی سہیلی ..... (انعام الرحمٰن چاندنہ)
؟ .... (طاہرہ بیگم)
؟ ...... (مونس شبیر)

(مینیجر)

شادی دو روحوں کے اس عزم کا نام ہے کہ وہ اپنے سے بہتر روح کی تخلیق کر سکیں۔ (نطشے)

احمد سعید

بے جوڑ شادیاں

"بے جوڑ شادیوں" کے عنوان پر میرے کرم فرما اور دوست انوار الحق صاحب حقی بہت کچھ سپرد قلم فرما چکے ہیں آپ نے مسئلہ کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالی ہے ماہ گذشتہ کی نظم اور موجودہ مضمون اس سلسلہ کی کڑیاں ہیں ان کی اشاعت کا مقصد تنقید نہیں بلکہ سمجھنا اور سمجھانا ہے ادارہ انوار، حسب کی آرا کا منتظر ہے تاکہ ہر قسم کے خیالات گزٹ کے صفحات پر پیش کر سکے۔

ادارہ کی اپنی رائے محفوظ ہے اور انشاء اللہ جلد ہی برادری کے افراد کے سامنے پیش کیجائے گی۔ امید ہے مضمون نگار علمی بحث کی حدود میں رہینگے اور ناظرین گزٹ خاطر خواہ استفادہ حاصل کریں گے۔ (مدیر)

عرصہ چند ماہ سے محترم عزیزی میاں انوار الحق صاحب حقی اڈیٹر رسالہ قوم" زیر عنوان گھر کی باتیں" بے جوڑ شادیوں پر لکھ رہے ہیں مگر ہنوز دونوں صنفوں کی تناسب عمر کی جدول تیار نہیں کی کہ جلسہ عام قوم پنجابیان میں پیش ہو کر منظوری حاصل کرتی اور یوتھ لیگ کے دستور العمل میں منسلک ہو کر قانونی صورت اختیار کرتی اور قوم اس پر عمل کر کے اس سے فائدہ اٹھاتی امید ہے کہ محترم دوست اس کام میں جلدی کر کے قوم کو شکریہ کا موقع دیں گے۔

قوم کے نومبر کے پرچے میں صاحب موصوف نے اس موضوع پر اپنے خیالات بلند کا اظہار شروع کیا ہے تمہید میں آپ نے قوم کے سامنے تین واقعات پیش کئے ہیں (۱) قوم کی چند دختران کا اپنے والدین و عزیز و اقارب کی محبت کو اپنی نفسانی خواہش پر قربان کر کے گھر سے فرار ہونا (۲) برادری کی ایک دلیر دختر نے تبتی شادی کر کے قوم میں ایک نئی مثال پیش کی (ملک تبت میں دستور ہے کہ ایک عورت ایک وقت میں بارہ خاوند کر سکتی ہے اسکو کثرت ازدواج کہتے ہیں) اس طرح کہ موصوفہ علیہا ما علیہا نے اپنے نابینا خاوند کو جو کہ ایک متوسط درجے کا آدمی تھا ایک دم کوٹھی میں رہنے والے مالدار آدمی سے بدل لیا اس تبدیلی کو عیسائیت کی چادر کی آڑ میں کیا کہ قانون انگریزی کی زد سے دونوں بچے رہیں۔ (۳) کسی صاحب نے معمر ہو کر

اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور دوسری کر لی اس کو انور صاحب "عیاشی" کے الفاظ سے موسوم کرتے ہیں مگر دسمبر کے پرچے میں آپ اول الذکر دونوں باتوں کو چھوڑ کر صرف تیسری کی طرف ہاتھ لیکر پڑ گئے اور اپنا تمام زور ختم کر دیا حالانکہ [illegible] ترک کردہ دونوں باتیں تیسری کی نسبت بہت زیادہ اہم ہیں کیونکہ جرائم سنگین ہیں اس سلسلہ میں میں نے انور صاحب سے ملاقات کی اور ان کو بتایا کہ آپ جس چیز کو وہ بُرا سمجھ رہے ہیں وہ اللہ نے جس کو عیب بتا رہے ہیں وہ حسن ہے۔ اسلام کا کوئی حکم آج تک غلط ثابت نہ ہو سکا آقائے نامدار کا فعل و قول استمام تحت ہے منکرین کو اس کا اقرار ہے مگر خدا جانے حقی صاحب کو کوئی ذاتی تجربہ تلخ ایسا ہوا ہے یا کسی کمبخت دوا فروش نے ان کو اس قدر خوف زدہ کیا ہے کہ وہ برابر یہی فرماتے رہتے ہیں کہ پیری میں قوت مردی باقی ہی نہیں رہتی میں نے خیال کیا کہ مخلص قومی خادم [illegible] کتب خانہ بھی ہے کوئی فن طب کی کتاب دیکھ لے گا سمجھ لے گا مگر دسمبر کے پرچے سے معلوم ہوا کہ برخود ایک جماعت بھی آپ کے پیچھے ہے اور آپ اس مصلح جماعت کے قائد ہیں یہ جماعت ان بزرگوں کا جو بڑھاپے میں شادی کے خواہشمند ہوں گلا گھونٹ کر خاتمہ کرنے کا تہیہ کر چکی ہے اور یہ قدم بڑھایا گیا ہے پیچھے نہیں ہٹایا جائے گا مجھے اس نقصان رساں تجویز اور گمراہ کن دعوے کا بہت رنج ہوا گذشتہ ماہ کی میری نظم اسی سے متاثر ہو کر لکھنی شروع کی گئی ارادہ تھا کہ بصورت قطعہ محترم دوست کی خدمت میں پیش کروں مگر مضمون طویل ہونے کے باعث قافیہ نہ نبھ سکا اس لئے ترکیب بند میں بدل دیا مگر افسوس ترکیب بند بھی ابتک پورا نہ کر سکا اور یہ ترکیب بند بھی ابھی تک نامکمل ہے اس وجہ سے وہ حصہ کہ جو خاص معزز دوست سے متعلق تھا پیش کر دیا اور خدا سے امید کرتا ہوں کہ بقیہ بھی جلد پیش کر سکوں گا۔

آپ کو اس جماعت میں سب سے زیادہ حیرت انگیز جو چیز دیکھنے میں آئی وہ یہ ہے کہ صنف نازک ہی آپ کا اس معاملے میں ٹانگ اڑانا آپ کے باپ اور خاندان کے لئے باعث ننگ ہے اگر واقعی علمی مذاق ہے تو انگریزی کی وہ کتابیں مطالعہ کیجئے جن میں ان پر علمی بحث تفصیل سے ہو پھر آپ جب پچاس کے سن سے تجاوز کر جائیں تو نہایت بے باکی سے اس موضوع پر قلم اٹھائیں۔ آپ کے لئے زیبا نہیں کہ [illegible] ایک مسئلے پر کسی کی مخالفت یا تائید بھی کریں۔

میرے محترم دوست میاں انور الحق صاحب حقی نے مذکورہ بالا عنوان پر جس [illegible] لکھا ہے اس میں [illegible] قدم پر سرمایہ داری وغیرہ سرمایہ داری کے سوال سے [illegible] کے متعلق علامہ اقبال مرحوم فرما گئے ہیں۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

. . . .

اصلیت وہ سامنے ہے [illegible]
کہ یہ ہتھیار ناکارہ ثابت ہو چکا ہے اور [illegible]
میں کمزور امیدوار اپنے حریف کے مقابلے میں [illegible]
کے لئے کبھی کبھی استعمال کرتا ہے یا حکومت [illegible]
مگر کمزور ملک کی دولت پر قبضہ کرنے کے [illegible]
اور کر رہی ہے پہلے وہاں کے مزدوروں [illegible]
سوال پر چلا ان طبقے کے اور [illegible]
جاتا ہے پھر ان کو دولت کی [illegible]
گرمیاں کر دیا جاتا ہے جب [illegible]

کافی کمزوری آجاتی ہے تو یہی روسی مزدور جس کی نجوا کست ہے کے
دارالخلافہ لنڈن کی شنشینیں ادھا پر ان کا تیل ہے کہ ... کی حفاظت
کے بہانے وہاں پہنچ جاتا ہے پھر بزدو فریق کے افراد پر ... اتفاقاً
کے لشکر پاکی طرح سوار ہو جاتا ہے اور اپنی لغایہ بانشہ بلا کر ... سمجھ
لینا ہے یقین نہ ہو تو ملاحظہ ہو مصطفےٰ کمال اور روس کا معاہدہ اور
جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد روس دنیا میں اکثر ... دہان وغیرہ
کا مطالبہ اتحادیوں اور ایران کا معاہدہ ایران اور ... میں
روسی افواج ... ۱۹۴۲ء ... کے آخری
سال کی تاریخ ... جنگ عظیم ختم ... ہندوستان مجبور ہو کے ...
لنڈن میں جاپان ... نصب کردہ کی جاوا کی حمیتوں کا ...
میں ... آذربائیجان میں ... حکومت اور ... کی حیثیت
وغیرہ اگر بہ نظر غور مطالعہ فرمائینگے تو آپ کو ...
ہوشیار تجربہ ہے تعمیری نہیں اصلاح کے لئے قوم کو ایک مرکز پر لانے
کی ضرورت ہوتی ہے اب پر قوم دو طائفوں میں بٹ جاتی ہے
جب دو طائفوں میں پھوٹ گئی تو ایک مرکز پر کیسے جمع ہو سکتی ہے
پس اصلاح ناممکن آپ کا مقصد نوٹ ماشاء اللہ آپ بھی تو تاجر
قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور تجارت بغیر سرمایہ کے ہو نہیں سکتی
پھر شیش محل میں بیٹھ کر دوسروں کی طرف پتھر پھینکنا عقلمندوں کا
شیوہ نہیں۔

میرے محترم دوست کی تحریر اکثر مقامات پر اس قدر
مبہم ہو جاتی ہے کہ مسند الیہ کا پتہ نہیں چلتا میرے خیال میں وہ تیزی
تحریر اور نئے نئے الفاظ اپنی محاورے گھڑنے میں اس قدر منہمک
ہو جاتا ہے کہ دوران تحریر خود بھی بھول جاتا ہے کہ وہ کیا لکھ رہا
ہے اور کس کس ... مثلاً "شیر کے منہ میں کنکریاں ڈالنا"
جامع اللغات، نور اللغات۔ فرہنگ آصفیہ اور دیگر اردو لغات
کو ... نہیں نہیں ملا۔ مجبوراً عریضہ کالج اجمیری دفاتر

کی (انجمن ترقی اردو) کی طرف سے اردو زبان کی تعلیم کے لئے جو
جماعتیں رات کو تعلیم پاتی ہیں) کی طرف رجوع کیا جملہ اساتذہ
نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اخلاق صاحب رئیس المعلمین نے
فرمایا کہ مولوی عبدالحق صاحب سے عقدہ وا ہوگا۔ چنانچہ
ان کی خدمت میں حاضر ہوا معلوم ہوا کہ شاید کوئی نیا محاورہ ہوا
تازہ تازہ حیدرآباد دکن میں وضع کیا گیا ہو مگر چونکہ اس کا
استعمال آپ کی کسی کتاب میں نہیں ہے اس لئے حضرت
مولوی صاحب قبلہ کو علم نہیں پس مجھکو جناب برج ذہن صاحب
کیفی سے استفسار کرنا پڑا۔ پس ان کے در دولت پر حاضر ہوا
آپ نے سنکر نہایت غصہ میں فرمایا "ارے تو پنجابی ہے تجھ کبھی نہیں آئے"
ناچار رسالہ جیتہ المعلمین کے دفتر پہنچا کہ شاید یہ کام کسی مہاسبھائی
سورما کا ہو۔ وہاں پہنچا تو سب یک زبان ہو کر بولے "ہم کا
... نہیں معلوم" آخر کار یہ کیفیت ہے کہ خود بھی فیصلہ
نہ کر سکا ایک طرف دل گواہی دیتا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ مدیر رسالہ
ماہانہ "قوم" ناظم قومی کتب خانہ مصلح قوم (خصوصاً بزرگان قوم کا)
کے قلم زرنگارہ سے نکلا ہوا ہے غلط نہیں ہو سکتا۔ شاید لکھنؤ کے
اساتذہ میں کسی نے اس کو کسی مصرع میں باندھا ہو جو ان تمام
بزرگوں کی نظر سے نہیں گذرا ہو یا یہ بھول گئے دوسری طرف خیال
یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیر کے منہ میں کنکریاں کون ڈالے گا اور ڈالیگا
تو کیوں اور کس طرح۔ شکار کا تو سنتے آئے ہیں۔ اچھا اگر شیر کے
منہ میں کسی نے ڈال بھی دیں تو کہاں ڈالے گا۔ جنگل میں۔
سرکس میں یا بھس بھرے ہوئے کے منہ میں جو اکثر دکانوں اور
مکانوں کی زینت ہوتے ہیں۔ جنگل میں انوار صاحب کا معجزہ ہو تو
ہو اور کسی کا تو دل گردہ نہیں ہو سکتا سرکس یا کسی دوکان وغیرہ
پر کوشش کی گئی تو ہر دو کے مالک مار لٹھوں کے سر پھلا
دیں گے۔ رہا چڑیا گھر کا سوال تو وہاں کے جنگلے مانع ہوتے ہیں

اگر کسی نے ایسا کرنے کی ٹھان لی ہے تو کون سا تعجب کا مقام ہے۔ "ڈوب مرو چلو بھر پانی میں" اسی طرح ایک محاورہ ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو چلو بھر پانی سے کلیاں کرنا ظاہر ہے یہ کام دیوانوں کا ہے اور دیوانوں کے اقوال و افعال قلمبند نہیں کیئے جاتے اس لئے یہ محاورہ تو قطعی نہیں ہو سکتا آپ جگہ جگہ شعر اور غزلیں لکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس سلسلے میں اتنا لکھیں کہ کتنے گرانبہا موتی لگنے والے اپنی زندگی سے کھیلنے لگیں . . . .

قوم کے بزرگوں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اس وقت تک جو ایسے شیٹ بوڑھے ہیں ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا ان کو نظر انداز کیا جائے . . .

لہذا آج ہم قوم کے بزرگوں اور بہی خواہوں کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے کچھ نہیں لکھتے وغیرہ" ملاحظہ ہو "زندگی سے کھیلنا" جان پر کھیلنا تو لغت میں ملتا ہے مگر زندگی سے کھیلنا نہیں اول الذکر کے معنی ہیں نہایت خطرناک کام کرنا جس میں جان جانے کا خطرہ ہو کھیلنا ایک فعل ہے اور اس میں قید فاعل کے زندہ ہونے کی ہے کیونکہ مردہ سے فعل سرزد ہو نہیں سکتا پس جب آدمی مرگیا اور اس کی زندگی اس کے ہاتھ میں نہ ہوئی تو وہ کھیل ہی نہیں سکتا فرض کیا مضمون نگار کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے خلاف اس قدر برا لکھے گا کہ اس کو زندگی بری معلوم ہونے لگے گی اور یہ دل چاہیگا کہ مر جائے مگر موت کا صادر ہونا جب بھی لازم نہیں آتا کیونکہ اس کے لیئے شرط ہے کہ وہ اس لکھے کو سمجھے اور وہ لکھا اس کے کانوں تک نہ پہنچ جا کر اس کو روحانی اذیت پہنچی گی، موت جب بھی نہیں آئے گی اگر ایسا ممکن ہوتا تو ہماری سرکار انگریزی سنڈے سٹنڈرڈ نوجوانوں کی بجائے بچڑے فوج میں بھرتی کرتی کہ مغلظات سنانے میں اس فرقے سے زیادہ دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

حقی صاحب کہاں ہیں آپ اور آپ کی جماعت بزرگوں کی پگڑی میں دھوں جھونکنے کے لیئے آپ کھڑے ہوئے ہیں۔ بزرگوں کی اصلاح تو آپ کے مدنظر ہے ان بزرگوں سے بزرگ تر اور کون سے بزرگ پیدا ہو گئے جنہوں نے آپ کو اس نیک کام سے باز رکھا پڑتے مجھے شک ہے کہ یہ مصلح بزرگ خواہ واحد ہوں یا جمع اپنا ذاتی ارادہ اس فعل کے کرنے کا تو نہیں رکھتے اور اسی مصلحت سے ہی وہ ناصح بنے ہوں اور یہ بزرگ دو ہی ہو سکتے ہیں یا تو جن کے خلاف آپ نے تحریر کیا ہے ان کے بزرگ سو وہ اس وقت سکان شہر خموشاں میں ہیں دوسرے جناب عزرائیل علیہ السلام البتہ ان سے یہ ممکن ہے خدارا یہ تو بتا دیجئے کہ موخرالذکر کس صورت میں جلوہ گر ہو کر ناصح بنے مگر سہ

آسنے دواُسے جس کے لئے چاک کیا ہے
ناصح سے گریباں کو سلانے کے نہیں ہم

اب سمجھ میں آیا "شیر کے منہ میں کنکریاں ڈالنا" اس کو کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ سب کام حضرت عزرائیل علیہ ما علیہ کا ہے یہی حضرت آپ کو اصلاح کا پیغام دے گئے پھر جماعت کی شکل آپ کی ہمت بندھا گئے اور جب کوئی فتنہ پیدا ہوتا نظر نہ آیا تو مذکورہ شکل میں آپ کو ڈرا گئے۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے "اگر نہیں اور یقین نہیں تو ہم پھر کیوں مان لیں کہ بیوی بھی اسی ساٹھے پاٹھے کی ہے اور بچے بھی اور جب کہ ہم بیٹھک اور کوٹھوں کے چرچے برابر سن رہے ہوں" اس جملے سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ جملہ تام ہے ناقص نہیں۔ مگر یہ نہیں معلوم کس خاص شخص کی طرف اشارہ ہے ہاں البتہ یہ ظاہر ہے کہ کسی فرد واحد کی طرف ضرور ہے اگر آپ کے بیان کو تسلیم بھی کرلیا جائے کہ سچا ہے اور یہ کہ کسی کی مرغی پڑوس کے مرغ سے انڈے دے رہی ہے تو اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ جملہ بزرگان قوم مذکورہ بالا شخص کی طرح ہوتے ہیں یہ عارضہ ایک نوجوان کو بھی ہو سکتا ہے۔ حوالے کے لئے دیکھو علم امراض انسانی اور جسٹر فرمائش ہمدرد دواخانہ دہلی پس معلوم ہوا کہ مستثنیات کلیات میں داخل نہیں ہوتیں دیگر ایک

رسالے کے اڈیٹر کو زیبا نہیں کہ اس قسم کے واقعات صرف سن سنا کر تشہیر کریں کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ قوم کی عورتیں ——— کی ناز یکیں جناب کے ہاں درج کرایا کریں کہ آپ حلال حرام کا فیصلہ کر سکیں۔ ہر قسم کے واقعات اس طرح سنی سنائی پر لکھنا دیانت و شرافت کے منافی ہے۔ اس قسم کے الزامات میں اکثر عداوت کو بھی دخل ہوتا ہے۔

ملاحظہ ہو "کیوں چاہتے ہیں کہ ان کی میت پر چوڑیاں توڑنے والی ایک نوخیز لڑکی ہو۔ ان بہوؤں اور بیٹیوں سے بھی چھوٹی ان کی ایک بیوہ بھی دنیا میں باقی رہ جائے"۔ اس لئے کہ اسلام نے بیوہ کا نکاح اور مرد کے چار نکاح جائز کئے ہیں۔

ارشاد ہے "کہ ایسے ہوس پرستی کے ہر مریض کو قلم کی نشتری نوک سے انجکشن دسوئی لگا یعنی مریض کے جسم میں بذریعہ سوئی دوا داخل کرنا) دیا جائیگا اور کوشش کیجائے گی کہ ایسے شکاری سے معصوم ہرنی کو بچا لیا جائے جس کے ہاتھ بندوق چلانے میں مرتعش ہوں" اگر بندوق مرتعش ہاتھوں سے چلائی جائے گی نشانہ خطا ہو جائیگا معصوم ہرنی خود بخود بچ جائے گی۔ چلو چھٹی ہوئی جھگڑا ختم بڑھاپے کی دوا فاؤنٹین قلم اٹھایا اور گھسیڑ دی، دیر سے کھٹکا دبایا۔ علاج ہو گیا دماغ میں قوت آئے گی۔ بڑھا لکھا روشن ہو کر حافظہ تیز ہو گا۔ خون میں سیاہی پھیلے گی جلد کا رنگ پکا ہو گا برص کے مریض کے لئے اکسیر کا کام دیگا۔ دل سیاہ ہو کر مضبوط ہو گا۔ بزرگ صاحب ایک ہی رات میں چار نکاح کریں گے اب بندر کے غدود لعاب کے پیوند کی ضرورت باقی نہیں رہی کیوں نہ ہو ماشاء اللہ الشیائی ایجاد کر جاپانی تو کھلونے بناتے تھے مگر ہندوستان نے بھی ہر اردو ابنائی ہے کہ پنسلیں بنانے والے اہل یورپ اور امریکہ کیوں نہ ہو قومی کتب خانہ اور اس کی کتابوں "مطالعہ اور بعیر کی عمارت کا جائے وقوع لب نہر سعادت خاں بالمقابل پل محلہ کشن گنج اللہ اللہ کیا مقام ہے باسفورس کے کنارے رشک کو شرماتا ہے نہر میں پانی جس وقت ہلورے لیتا ہے اس وقت اگر باسفورس کا پانی دیکھ پائے تو آب آب ہو جائے اگر فاضل دوست کی سرا زنا کنندہ لڑکی سے ہے تو شب زفاف میں جناب کو ہمراہ کون سلائیگا کہ فاؤنٹین قلم اپنا کام کر سکے کیا کوئی اس تجویز پر غور کریگا؟

ملاحظہ ہو" یہاں میں ان صاحب دل سے جنہوں نے آقائے نامدار نبی کریم کی شادیوں میں تفاوت عمر تلاش کرتے ہوئے ہمارے بزرگوں کی حمایت کی ہے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا شرعی نقطہ نگاہ سے یہ بات بھی صحیح ہے کہ جب قدرت کی ودیعت کی ہوئی قدرت آپ میں باقی نہ رہے تو آپ دوایات سے استفادہ کریں۔ ہڈی کے دانت ہڈی توڑ سکتے ہیں"؟ یہ صاحب دل میں ہوں کہ میں نے بھی تحقیق کی ہے۔ یہاں میں حقی صاحب سے ایک سوال کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر چالیس سالہ ادھیڑ عورت ایک ۲۵ سالہ جوان سے نکاح کر لے تو اس جوڑ کو کیا کہینگے؟ نبی اکرم صلعم نے دونوں صورتیں عملاً کر کے ثابت کر دیا کہ جوڑ کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ بھی فرمایا ہے کہ میں تمہارے جیسا انسان ہوں صرف مجھ میں اور تم میں یہ فرق ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے اور تم پر نہیں آتی جب آپ نے بڑی عمر میں ایک چھوٹی عمر کی کنواری عمر کی لڑکی سے شادی کی تو ثابت ہوا کہ یہ قوت باقی رہتی ہے اگر کسی شخص کی آنکھ جاتی رہے تو یہ نہیں کہا جائیگا کہ فلاں عمر میں کمزوری جاتی رہتی ہے۔ یا یہ نوع انسان کا فانی ہوتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اتنی تشریح آپ کے سمجھانے کو کافی ہو گی مگر چونکہ آپ قومی کتب خانے کے ناظم ہونے کے بجائے نیشنل پبلک لائبریری کے سیکرٹری ہیں جن کے متعلق علامہ اقبال فرما گئے ہیں ؎

ہم یہ سمجھے تھے کہ لائیگی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشہ فرہاد بھی ساتھ

حیرت کا مقام ہے اتنے بڑے کتب خانے میں کوئی کتاب ایسی مہیا نہ ہو سکی کہ جس منتظمہ کتب خانے کو کتب خانے کا نام اردو

عصمت جہاں تیموری

مصوّر

ایک اجڑے ہوئے آشیانے کی طرح جس کو بجلیوں کی پیہم یورشوں نے برباد کر دیا ہو۔ ٹوٹے ہوئے برج میں جس کے قریب ایک بڑ کا درخت تھا۔ جو زمانے کی نیرنگیوں اور فلک کج رفتار کی بے التفاتیوں سے تنگ آ چکا تھا۔ جس کا بچپن شاہان مغلیہ کے آخری دور کی گود میں گذرا تھا۔ نہ صرف اس کی آغوش طمانیت کو آسمان کی گردشوں نے کچل کر درہم کر لیا تھا۔ بلکہ جلا کر خاک کر دیا تھا۔ اسے اکثر وہ مسرت آگیں ایام یاد آتے تھے۔ جب لوگ اس کی پوجا کرتے تھے اور جب اس کے پرستار و عقیدت مند اس پر چڑھانے کی خاطر بڑے بڑے خوان سجا کر لایا کرتے تھے، وہ ہنستا اور قہقہے لگاتا اور اس بھولے ہوئے زمانہ پر ناز کرتا۔ اس کی یاد اب بھی اس کے دل کو مسرت سے لبریز کرتی اور دماغ کو خاطر خواہ فرحت بخشتی اس کا ایک زمانہ وہ بھی گذرا تھا جب وہ اپنے بیش بہا نذرانے فقیروں اور حاجتمندوں میں اس طرح تقسیم کر دیتا تھا۔ کہ حاتم کی سخاوت اس کے سامنے مات تھی۔

اسے کیا معلوم تھا کہ ایک وہ بھی دن آئے گا کہ لوگ اس پر ہنسیں گے، اس کا مضحکہ اڑائیں گے۔ اس پر آوازیں کسیں گے اور یہی بھولا زمانہ اس کی سخاوت کو نوچ لے گا۔ اسے کیا معلوم تھا وہی پرندے جن کی خوش آئند چہکار سے سارا جنگل گونج اٹھتا تھا۔ اور جن کے آشیانوں کا وہ مرکز تھا۔ آج اس کے پاس آنے سے گریز کریں گے، اسے معلوم نہ تھا کہ وہ مسافر جو لو کے تھپیڑوں اور بارش کے طوفان سے پناہ لینے کے لئے اکثر اس کے گوشہ عافیت میں آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ اب اس سے چھوت کریں گے۔ وہ چیختا چلاتا مگر آہ کوئی اس کی پیری اور تنہائی میں اس کا یاور نہ ہوتا۔

مگر وہ جہاندیدہ تھا اور اس پرفریب زمانے کی رفتار کو تاڑ لینا اس کے لئے کوئی مشکل امر نہ تھا۔ ایسی صورت میں بھلا کوئی کیونکر اس کی دلبستگی کر سکتا تھا کیونکہ زمانے کے نشیب و فراز اور زندگی کے تلخ انقلاب کے دلنشیں تجربوں نے اسے ظاہریت سے بہت دور کر دیا تھا اور اس کی حقیقت بیں نظریں اصلیت کی جویا تھیں، اگر کوئی بھولا بھٹکا پرندہ بھی اس کے قریب آ بیٹھتا اور کوئی سوز بھرا گیت الاپنے لگتا تو وہ ایسی طنز آمیز داد دیتا کہ پرند اڑ جاتا کیونکہ وہ اس کی ظاہری اظہار سوز و خلش کی رٹ سے اکتا چکا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی داد میں بجائے خود کہیں زیادہ سوز تھا۔ جسے کاش کوئی سمجھنے کی اہلیت رکھتا وہ تڑپ کر خود اپنی دکھ بھری کہانی کا اظہار کرتا ورنہ بھلا کون ایسا مضطرب تھا۔ جو اس کے تمناؤں سے لبریز ساز کو چھیڑتا۔

مصور ـــ مصور ـــ مصور۔ جو شہر سے دور بیٹھے پرانے کپڑے پہنے دیوانہ وار ویرانوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا صحراؤں کی خاک چھانتا اور پرانے سے پرانے درختوں کا اپنے خاص انداز میں مطالعہ و مشاہدہ کرتا پھرتا تھا آرام و آسائش سے دور خانہ

بربادی کا وہ مجسمہ بالآخر تھک کر کبھی کبھی اجڑے اور ویران رہے ہوئے درختوں کے نیچے بیٹھکر پناہ لیتا۔ وہ ایسے درختوں کا متلاشی تھا جنہوں نے اس کے آباد و اجداد کو دیکھا ہو اور جو اُسے حقیقی سکون و اطمینان دے سکتے ہوں۔

سکون۔ ہاں سکون۔ مصور کو سکون کہاں۔ وہ اپنے دل کو دلاسا دیتا اور پھر دشت نوردی میں سمت کہیں دور نکل جاتا۔ اپنے مایوس و غمگین دل کو جو زمانے کی پُر فریب نیرنگیوں کا شکار ہو کر پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ بہلانے کی کوشش کرتا۔ وہ ایسے ہمنوا کا متلاشی تھا جو اس کے جنون کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کا راز سمجھ سکتا۔

لق و دق میدانوں کی خاک چھانتا۔ ویرانوں اور کھنڈروں میں بگولا گھومتا پھرتا بیشمار بوسیدہ درختوں کی جڑیں کریدتا آخر کار وہ اُس بڑ کے درخت کے پاس پہنچا۔ جس کو وہ عرصہ سے ڈھونڈ رہا تھا۔

مصور نے نہایت متین لہجہ میں آغاز گفتگو کرتے ہوئے اس بڑ کے درخت کو مخاطب کیا اور کہا "کیا تم مجھے جانتے ہو۔ میں کون ہوں؟"

بڑ کی داڑھیاں تھرائیں اور اس کے استقبال کے لئے اس طرح ہلنے لگیں گویا اس کو عرصے سے جانتی ہیں۔

مصور یہ دیکھکر ہنسا اور کہا کہ میں اسی خاک کا ایک ذرہ ہوں۔ میں اُس شمع کی ایک شعاع ہوں جس کی آغوش میں تم پروان چڑھے۔ کیا تم مجھے جانتے ہو؟

بڑ کی داڑھیاں زور زور سے ہلنے لگیں گویا اُسے اس بات کا پورا اعتراف ہے کہ وہ اُسے جانتا ہے کہ کون ہو۔

مصور دیوانہ وار اس کی ایک ایک شاخ کو پکڑتا اور غور سے دیکھتا کہ گویا ان پر کہیں لکھا ہوا اپنے آباد و اجداد کا نام پڑھ رہا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ جوشِ مسرت سے چلاتا "ہاں تم جانتے ہو۔ ہاں تم مجھے جانتے ہو۔ اُس بڑ کے ریشے بہت بڑے تھے، اور وہ کم از کم سو برس کا پرانا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا ایک ایک ریشہ گواہی دیتا تھا کہ وہ شاہان مغلیہ کا نمک حلال ہے۔

ہوائے تیز بہت تیز جھونکوں نے مصور کے جنون کو سکون سے بدل دیا۔ مصور نے اُس بڑ کے درخت کے نیچے رہنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی لو کے جھونکوں اور بارش سے بچنے کے لئے کسی ٹوٹے برج میں چلا جاتا اور گاہے بگاہے بھوک اور پیاس سے پریشان ہو کر شہر کی جانب جا نکلتا۔ لڑکے اسے دیوانہ سمجھکر اسے پتھر مارتے، وہ ان پتھروں کو چن چن کر جھولی میں بھر لیتا اور ٹوٹے برج اور بڑ کے درخت کے نیچے اُن سے محل بناتا اور خیال ہی خیال میں خود کو ان کا ذی شان مالک و مکیں سمجھتا۔ بڑے بڑے مصور اس کے خیالی دربار میں آکر عقیدتمندی کا اظہار کرتے۔ مگر وہ اس شاہی مصور کی کہاں تاب لا سکتے۔ کبھی کبھی وہ قرب و جوار جنگلوں میں گھومتا اور درختوں کے تنوں اور سطح زمین پر تصویریں بنایا کرتا۔

وہ بہت دلیر تھا۔ بارش کے طوفان۔ بجلی کی گرج۔ دھوپ کی تپش۔ ساون کی کالی گھٹا اور اندھیری رات کی کسی چیز سے بھی اس کو ڈر نہیں لگتا۔ وہ مصور تھا۔ اور مصوری میں کھو چکا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اُسے کس نے ٹھکرایا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کیوں دیوانہ ہو گیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کیوں عجیب و غریب مصور ہو گیا ہے۔ معلوم تھا کہ اس نے شہر اور اس کی نیرنگیوں کو کیوں خیرباد کہا۔ ان تمام باتوں سے بخوبی واقف ہوتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ اسی کی تصویر بنایا کرتا جس نے اس کی زمین میں ایک تلاطم برپا کر دیا تھا۔

اُسے یاد تھا کہ اس کی بیوہ و بیکس ماں مزدوری کرکے

اُس کا پیٹ پالتی اور جب کبھی وہ کھلونوں کے لئے ضد کرتا تو وہ اُسے تنکوں اور پتوں کے کھلونے بنا کر دے دیتی، وہ انہیں لے جا کر اپنی نگار کو دے آتا۔ نگار انہیں پا کر خوش ہوتی اور انہیں اپنے کمرے میں سجاتی۔ اُسے یاد تھا کہ جب وہ جنگلی پھولوں کا گلدستہ بنا کر نگار کو دیتا تو وہ ہنس کر اُسے لے لیتی اور کہتی کہ تم پورے مصور ہو۔

اُسے یہ بھی یاد تھا کہ اس کی ماں اکثر اس سے کہتی کہ تو بڑی حویلی کے چکر مت لگایا کر۔ اگر بیگم کو خبر ہو گئی تو میری نوکری پر بن آئے گی۔ اسے وہ دن یاد تھے جب اس کی ماں کہتی تو نوکری کیوں نہیں کرتا۔ میں اس بڑھاپے میں کب تک ماری ماری پھروں دنیا کے بیٹے ہوتے ہیں، ماؤں کی خدمت کرتے اور انہیں آرام پہونچاتے ہیں، تو ہے کہ ہر وقت تصویریں بنایا کرتا ہے، وہ اس میں کیا دھرا ہے کمبخت۔ تو جسکی تصویر بناتا ہے بھلا وہ تیری ہو سکتی ہے، وہ بیٹی ہے پیسے کی ہے۔ جا نوکری تلاش کر مگر وہ ہنس کر کہہ دیتا میں نے نوکری کر لی۔ کس کی؟ نگار کی . . . . . مصوری۔ بس یہی میرا کام ہے۔

اس غریب بوڑھی ماں کا کب تک سہارا رہتا۔ مصور اپنی مصوری ہی میں مست رہا اور اس کی ماں کس مپرسی کے عالم میں ایکدن دنیا سے چل بسی۔ مگر ماں کے مرتے وقت کے الفاظ کہ "تم دہلی کی آخری شمع کی ایک شعاع ہو" ہلکشر اس کے کانوں میں گونجتے رہتے۔

لیکن . . . . جب اس نے نگار کو یہ کہتے سنا۔ "تو بدمعاش ہے لفنگا ہے!" تو اس کا جسم تھرا گیا۔ وہ کانپ اٹھا۔ "تجھے میری تصویر بنانے کا کوئی حق نہیں۔ حق ــــ" وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور چیخ کر بولا "یہ حویلی کس کی ہے؟ یہ زمین کس کی ہے؟ تم کیا جانو میں کیوں ہوں؟" گھڑی گھڑی اس کے کانوں میں وہ الفاظ چکر لگاتے۔ بدمعاش۔ لفنگا۔ "شمع شعاع" وہ بھر بھر کر بولا۔ بناؤنگا۔ ضرور بناؤں گا۔ دیکھوں مجھے کون روکتا ہے؟ یونہی چیختا ہوا وہ جنگل کی طرف نکل گیا۔

پرانے اور جہاندیدہ درختوں کی چھاؤں میں پناہ گزیں ہوا۔ بڑ کی ایک ایک شاخ پر نگار کی تصویریں بناتا اور اپنا نام نقش کرتا۔ بس یہی اب اس کا دلچسپ ترین مشغلہ تھا۔

مصور ــــ مصور نے بڑ کے درخت کے ہر حصے میں نگار کی تصویر بنا رکھی تھیں۔ آہ۔ مصور۔

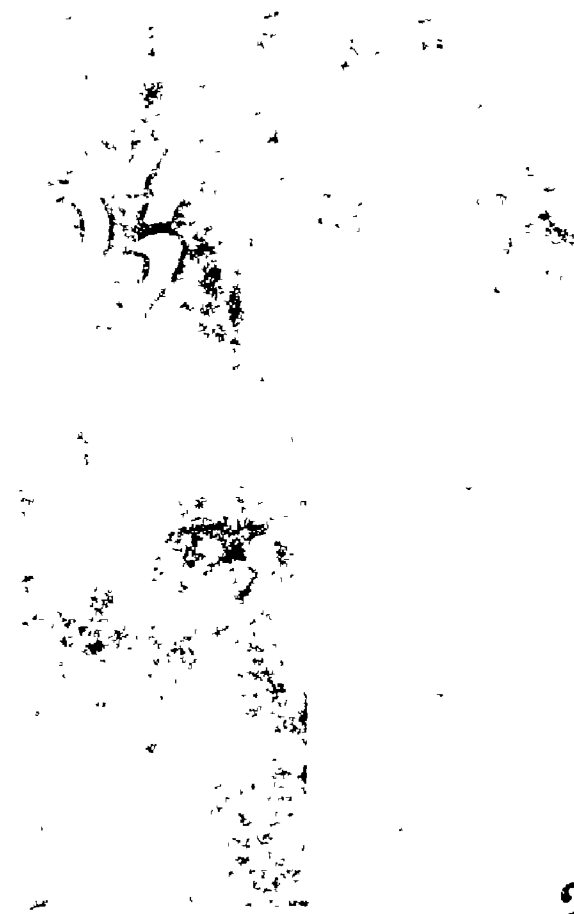
ایک دن بازار میں ایک اودھم مچا اور بجلی گری بجلی گری کی آوازوں سے فضا گونج اٹھی۔ بعد ازاں لوگوں کی توجہ اس بات کی طرف ہوئی کہ بجلی آخر کہاں گری۔ لوگ شہر سے باہر چاروں طرف میدان میں نظر دوڑانے لگے، چنانچہ دور سے وہ بڑ کا درخت جھلسا نظر آیا۔ جب وہاں پہونچے تو دیکھا کہ بجلی کے گرنے سے مصور ختم ہو گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کا عزیز درخت بھی راکھ کا ایک ڈھیر ہو کر رہ گیا۔

انجم

منظور احمد

(۱) زندگی حزن نہیں یاس نہیں ہے انجم
اپنے جینے کا یہ انداز نہیں ہے انجم
دوری منزل مقصود سے اس درجہ ملول
تجھ میں کیا طاقت پرواز نہیں ہے انجم

(۲) میں ہوں اظہار محبت سے گریزاں سچ ہے
شعلہ عشق شرربار نہیں ہے سچ ہے
ہچکیاں سوز میں لپٹی ہوئی آنکھیں پُرنم
تجھ میں کیا طاقت گفتار نہیں ہے انجم



TASTELESS
HARMLESS

Infants,
Invalids
and Adults

2
Tablets

بے ذائقہ ، بے ضرر ، دو ٹبلیٹ کا سرخ لفافہ ، قیمت ایک آنہ

قوم پنجابیان کا واحد ترجمان

پنجابی گزٹ دہلی

YOU YOUNG MEN

OF

PUNJABI COMMUNITY

Prepare, Organise and Train Yourself

FOR

DIRECT ACTION

Sacrifice All That You Possess to Save
The Glory, Liberty and Respect

OF

MUSLIM NATION

زیر سرپرستیِ انجمن وکیل قوم پنجابیان دھلی

زیر اہتمام پنجابی یوتھ لیگ دھلی

ماھنامہ

پنجابی گزٹ دھلی

قوم پنجابیان کا واحد ترجمان

سرپرستانِ خصوصی

(۱) شیخ فیروز الدین صاحب جاپان والے
(۲) محمد زکی صاحب معرفت پیرجی محمد یوسف صاحب
(۳) الیس نور الٰہی صاحب اینڈ کو ہرسین روڈ
(۴) خان بہادر شیخ محمد جان صاحب
(۵) شیخ محمد صدیق صاحب تار والے
(۶) حاجی ابوالحسن تار والے
(۷) محمد یونس صاحب بارٹی
(۸) محمد صدیق صاحب رئیس اعظم کانپور
(۹) حاجی محمد سعید صاحب ملکہ
(۱۰) مقبول الٰہی صاحب جاپان والے معرفت الیس نور الٰہی اینڈ کو
(۱۱) عبد المالک صاحب ہیر کریٹ والے
(۱۲) حافظ مقصود احمد صاحب معرفت الیس اکرام الٰہی اینڈ سنز
(۱۳) الیس ایم حنیف صاحب
(۱۴) میسرز رحیم الدین اینڈ عبد الکریم
(۱۵) شیخ عبد الستار صاحب گھڑی والے
(۱۶) حاجی رحمت الٰہی صاحب گھڑی والے صدر بازار
(۱۷) شیخ محمد یوسف صاحب گھڑی والے رادھا بازار
(۱۸) شیخ محمد الیاس صاحب گھڑی والے رادھا بازار
(۱۹) شیخ سراج الدین صاحب گھڑی والے
(۲۰) شیخ محمد سعید صاحب گھڑی والے رادھا بازار
(۲۱) شیخ محمد عمر صاحب گھڑی والے
(۲۲) شیخ ممتاز الدین صاحب ملک۔

قیمت فی پرچہ ۱۲ ر آنے

شیخ جمیل الرحمٰن صاحب پرنٹر و پبلشر نے دیال پریس میں چھپوا کر دفتر پنجابی گزٹ دہلی سے شائع کیا۔

معاونین خصوصی

۱۔ جناب شیخ اعجاز احمد صاحب ... — دہلی
۲۔ پیرزی عبدالخالق صاحب — 〃
۳۔ شیخ محمد سعید صاحب مالک فرم کرشل آپٹیکل کمپنی — 〃
۴۔ محترمہ پیرجی عبدالخالق صاحب — دہلی
۵۔ جناب شیخ محمد اسمٰعیل دوائی والے — کلکتہ
۶۔ جناب حاجی رحمت الٰہی صاحب ... — دہلی
۷۔ جناب محمد سعید صاحب ... — کلکتہ
۸۔ جناب سراج العارفین صاحب ... والے — دہلی
۹۔ محمد اقبال صاحب ولد شیخ احسان الٰہی صاحب دوائی والے — دہلی
۱۰۔ جناب گرونانک واچ کمپنی — کلکتہ
۱۱۔ جناب محمد ... رفیع صاحب — 〃
۱۲۔ جناب حاجی کرم الٰہی و رحمت الٰہی صاحبان گھڑی والے — دہلی
۱۳۔ جناب محمد تقی صاحب باڑی - بی اے — کلکتہ
۱۴۔ جناب مقبول برادرس — 〃
۱۵۔ جلال الدین اینڈ کو — 〃
۱۶۔ جناب محمد اسمٰعیل صاحب دوائی والے — 〃
۱۷۔ جناب غیاث الدین صاحب اینڈ کو — کانپور
۱۸۔ جنابہ محترمہ مسرت کلام صاحبہ معرفت اسلام احمد صاحب اینڈ سنز کانپور
۱۹۔ حاجی رحمت الٰہی صاحب ... والے — کلکتہ
۲۰۔ جناب عبدالرشید صاحب کلکتہ والے — 〃
۲۱۔ جنابہ المحترمہ بیگم محمد شبیر صاحب معرفت حاجی الٰہی بخش اینڈ کو — دہلی
۲۲۔ جناب ... ایس ایم سعید دہلی والے — کرنول
۲۳۔ جناب چودھری ... اللہ صاحب کپڑے والے — دہلی
۲۴۔ جناب عبدالرحیم صاحب ... والے
۲۵۔ جناب ضیاء الحق صاحب ... والے — کلکتہ
۲۶۔ جناب ... صاحب ... — 〃
۲۷۔ جناب ... حق صاحب خضاب والے — دہلی
۲۸۔ جناب محمد یوسف صاحب ... معرفت محسن آپٹیکل کمپنی — کلکتہ
۲۹۔ جناب محمد الیاس صاحب نیولیمپ اسٹور — 〃
۳۰۔ جناب محمد یونس صاحب گھڑی والے — دہلی
۳۱۔ جناب حافظ محمد عمر صاحب — کلکتہ
۳۲۔ جناب محمد عثمان صاحب چاندنہ — 〃
۳۳۔ جناب محمد ... صاحب مالک فرم عاشق کمپنی — 〃
۳۴۔ فضل احمد صاحب معرفت شفیع کمپنی — کلکتہ
۳۵۔ محمد احمد صاحب معرفت ایس ایم احمد اینڈ کو — 〃
۳۶۔ محمد ابراہیم صاحب معرفت برٹش ہاؤس — 〃
۳۷۔ محمد اشفاق صاحب چاندنہ — 〃
۳۸۔ عزیز شیخ محمد ادریس صاحب ملتانی — دہلی
۳۹۔ عبدالحمید صاحب دوائی والے — 〃
۴۰۔ محمد اسمٰعیل صاحب ... والے — کلکتہ
۴۱۔ عزیز محمد عمر صاحب محمد شفیع صاحب — 〃
۴۲۔ محمد تقی صاحب باڑی — دہلی
۴۳۔ محمد صادق صاحب بریلوی — دہلی
۴۴۔ شاہد احمد صاحب بریلوی — بریلی
۴۵۔ ایس ایم نور احمد صاحب بریلوی — کلکتہ
۴۶۔ انور سعید صاحب بریلوی — بریلی
۴۷۔ عبدالحمید صاحب چوڑی والے — کلکتہ
۴۸۔ عبدالاحد صاحب منیجنگ پروپرائٹر کامریڈ آپٹیکل کمپنی (دہلی)
۴۹۔ انوارالحق صاحب ... والے — دہلی
۵۰۔ ایس سلیم الدین صاحب — کلکتہ
۵۱۔ محمد شفیع صاحب — دہلی
۵۲۔ محمد رفیع صاحب ملتانی آنریری مجسٹریٹ
۵۳۔ ایس رحمان گھڑی والے — کلکتہ
۵۴۔ اے رحمان گھڑی والے — 〃
۵۵۔ شیخ حافظ محمد شفیع ... والے — 〃
۵۶۔ حاجی احمد حسن ... والے مرحوم
۵۷۔ شیخ محمد توفیق صاحب
۵۸۔ ایک با اصول
۶۰۔ عبدالستار صاحب
۶۱۔ این ایچ عبدالٰہی اینڈ سنز
۶۲۔ ایم آر ذکی
۶۳۔ صالحین برادرز
۶۴۔ ایس ایم تقی
۶۵۔ شیخ جمیل احمد صاحب
۶۶۔ نواب محمد جان گھڑی والے

شمارہ ۵-۶ جلد ۱۰

خاص نمبر ماہنامہ پنجابی گزٹ دہلی

بابت ماہ اگست و ستمبر ۱۹۴۶ء

ادارہ تحریر

منظور احمد ایم اے سلطان احمد

ناظم :- آفتاب احمد چشمے والے مدیر شمع کلب :- انیس الرحمٰن کالیسر

ترتیب

شمع کلب

منظومہ

گردوپیش

ایک سوال

دنیا کیا تھی؟ — محقق نے دماغ کی تیز روشنی ہزاروں سال پرانی زمین کی خاکی چادر پر ڈالی اور چند حالات معلوم کر لئے لیکن علم میں اتنی وسعت، صحت اور پختگی اب تک معدوم ہے کہ تنقید کی کڑی نگاہیں تاریخ کے صفحات سے ایسے پھسل جاتی ہیں جس طرح کسی سنسان گوشہ میں گھومنے والے رومانس کے متلاشی نوجوان کی آنکھیں کسی شگفتہ رخ لڑکی کی ریشمی ساڑھی کے پلو سے الجھ کر پھسلتی ہیں اور اٹھنے کا نام نہیں لیتیں — کیا ہو جائے گی؟ — کون جانے، انقلاب کی رفتار اس قدر خاموش اور اتنی تیز ہوتی ہے کہ کچھ نہ کہا جا سکتا ہے نہ بتایا — دنیا کیا ہے؟ —

یہ ایک واحد سوال ہے جس پر دنیا غور کر رہی ہے اور جس پر غور کرنے کی ضرورت تمام فروریات سے اہم اور بامقصد نظر آتی ہے۔

ہندوستان — بلکہ دنیا کے بسنے والے خواہ وہ عصمت چغتائی کے زمین پر رینگنے والے بال کچھے ہوں یا فضا میں پر پھڑپھڑاتے جگر گدہ اس سوال اس عقدہ کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں میں ایک بیّن فرق ہے۔ ظاہر ہے ان کے اندازوں اور نقطۂ نگاہ میں بعد المشرقین ہوگا۔ ایک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے جو تمام چہرے کو شگفتہ کئے ہوئے ہو لیکن قہقہہ بنتی نظر نہیں آتی۔ ایک کے خشک لبوں پر تبسم ہے، نیم شگفتہ — اداس، لیکن تیور بتاتے ہیں کہ یہ تبسم جس میں اداسی کی آمیزش ہے جس میں دبی ہوئی آرزوؤں کی پامال سسکی ہے — قہقہہ نہیں ایک آواز، ایک پیام، ایک کہربائی قوت بن کر رہے گا۔ اور یہ مسکراہٹ جو آج تبسم معلوم ہوتی ہے ان پھیلے ہوئے ہونٹوں کو اس طرح میٹ دے گی جس طرح بیرونی قوت کے بٹتے ہی ایک پھیلا ہوا، تنا ہوا، فیتہ سکڑ جاتا ہے۔

طبقاتی کشمکش کوئی نئی چیز یا نیا سوال نہیں لیکن وقت کے بدلے ہوئے دھاروں نے جو نئی شکل اس مسئلہ کو دی ہے اس کے سبب یہ کشمکش کا تصور ذہن انسانی کی قوتوں کو جاذب کی طرح چوس رہا ہے — دنیا کیا ہے؟ — آج کی دنیا طبقاتی مفاد کی کشمکش میں پھنسا ہوا ایک سفینہ ہے جسے مختلف قوتوں کے ریلوں نے شکستہ اور کمزور بنا دیا ہے۔ ایک طبقہ کا مقصد حیات اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو آغوش ساحل کی حفاظت میں پہنچا دینا ہے۔ دوسرے طبقہ کو ساحل کی تمنا نہیں اس نے ساحل حیات پر ناچتے ہوئے حقیقت کے وہ بھوت دیکھے ہیں جس سے دوچار ہونا اس کی توانائی اور قوت سے باہر ہے ان تند، بے باک، اور بپھری ہوئی موجوں سے بچنے کے لئے چند سالم تختے ان کو مل گئے ہیں باقی ان کی روبرو پانی کی تہہ میں بیٹھ گئے ہیں، بیٹھ رہے ہیں لیکن ان کے سینے میں ہمدردی کا جذبہ بیدار نہیں ہوتا۔ کیونکہ ساحل حیات کے ان عفریتوں سے دست و گریباں ہونا جن کا حسن جرا کر یہ لوگ بھاگے ہیں کوئی آسان کام نہیں — اور پھر ڈوبتے ہوئے لوگ آخر پانی کا کفن اوڑھ کر، کیچڑ کی غلیظ قبر میں کیوں سو جائیں؟ — زندگی کس کو عزیز نہیں ہوتی، لیکن اگر ڈوب جائیں، مر جائیں، اور مچھلیاں ان کو نگل کر ختم بھی کر دیں تب بھی یہ سوال یہ کشمکش تو ختم ہونے والی نہیں، یہ جتنے ڈوب جائیں گے، مر جائیں گے ان کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ ان کی تعداد بڑھے گی اور یہ اسی طرح ڈوبتے رہیں گے پیدا ہوتے رہیں گے۔ پیدا ہوں گے اور ڈوبیں گے —

خاص نمبر ماہنامہ پنجابی گزٹ ۱۹۴۶ء

کیونکہ "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات" اسی لئے یہ "دل پیونٹے" چاہتے ہیں کہ آج اس مسئلہ کو حل کر لیا جائے خواہ اس آگ کو گذرنے میں ایک نسل کی مدتِ حیات ہی کیوں نہ درکار ہو تاکہ زندگی میں کچھ نئی قوتیں پیدا ہو سکیں ، زندگی پھر آگے بڑھ سکے ، پھر پھیل سکے اور پھر افق جمود و تعطل پر چھا جائے ۔

اندھے ، بہرے ، گونگے دنیا کے ہر گوشے اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں جب سے دنیا نے آنکھ کھولی ہے ان کی پوجا ہو رہی ہے ان کے قدموں میں پھول چڑھائے جا رہے ہیں ، سجدے ہو رہے ہیں ، سنکھ بج رہے ہیں ۔ جس قدر دنیا اس راستہ پر آگے بڑھتی گئی وہ پیچھے ہٹتے گئے ۔ لوگوں کے گیان ، دھیان ، عقیدت اور پرستش میں جتنا خلوص راہ پا گیا ان کی محبت کو نیند آتی گئی اور اس کی جگہ نفرت اور استبداد نے کروٹ لینی شروع کی لیکن آج آہستہ آہستہ ، بتدریج یہ سنکھ ، یہ گھنٹے اور ان کا شور اس منظر میں ڈوب رہا ہے یہ عبادت سرکشی سے گلے مل رہی ہے ۔ اور اس کی جگہ ایک عزم ایک آہنی ارادہ لے رہا ہے جس کا مقصد ہے کہ ان اندھے ، بہرے اور گونگے مجسموں کے چہرے سے دیبا و حریر کے وہ پردے نوچ لے جو اس نے اندھی عقیدت کی سوئی کے تلے نیچے کھال دھنک کر تیار کئے تھے ۔ سرخ سونے کی وہ زنجیریں اتار لے جو ایک دن بیاہی دلہن کی مانگ کے سیندور اور سہاگ رات سے لوٹی ہوئی نو عروس کے ہاتھوں کی سرخی سے چھین کر فراہم کی گئی تھیں ۔۔۔ ایک آواز ہے ۔۔۔ بہت ہلکی ایک شور ہے ۔ بہت دھیما ایک جاپ ہے بہت خاموش ، ایک دھڑکن ہے مہر بلب ۔ کیا ہوگا ؟ کیا ہونے والا ہے ؟ کون جانے ۔

یہ اندھے بہرے اور گونگے لوگ جو چاند میں رہنے والی مخلوق کی طرح اس سخت اور میلی زمین پر پاؤں نہیں رکھتے جو اس بدبودار لیکن سونا اگلنے والی زمین پر بسنے والوں کے صحیح حالات سے ناواقف ہیں دنیا کے ہر گوشے اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں اور یہ جاپ ، یہ آواز ، یہ دھڑکن یہ شعور جو ترقی پسند قوتوں کے آگے بڑھنے سے پیدا ہو رہا ہے ۔ اس کی بازگشت بھی آج دنیا کے ہر گوشہ میں ہے وہ دبے ان اندھے ، بہرے اور گونگے لوگوں کی خاصی تعداد پنجابی برادری کے دامن سے بھی وابستہ ہے اور پنجابی برادری کا وہ طبقہ ، وہ مجید وہ نوجوان جو ترقی پسند قوتوں کو دھکیل کر منظر عام پر لانے میں کوشاں ہیں ، منظم ہو کر اس مفلوج طبقہ کے لئے ایک مستقل خطرہ بن رہا ہے اور کافی حد تک بن چکا ہے ۔

کچھ پنجابی برادری سے | نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی

برادری کے متعلق ایک سوال بار بار میرے ذہن میں چکر لگاتا ہے

پنجابی برادری کی تنظیم اور تشکیل کن بنیادوں پر ہے ؟ ۔ یہ صحیح ہے کہ پنجابی برادری کے افراد ایک علیحدہ قوم ہونے کے مدعی نہیں ہیں ۔ لیکن اس برادری کی گروہ بندی کس بنیاد پر ہے اس کا پتہ آج تک نہ مل سکا ۔ برادریوں کی تاریخ بتاتی ہے (خواہ وہ فرضی اور مصنوعی ہی کیوں نہ ہو) کہ ان کے کلچر ، تمدن ، پیشے ، زبان ، رسومات غرض کسی چیز میں دوسری برادری سے ایک واضح مغائرت اور آپس کی ہم آہنگی ہوتی ہے ۔ اور اسی ہی اساس پر وہ گروہ بندی کر کے اپنے حلقہ میں ایسی اصلاحات نافذ کرتے ہیں جو انسانیت کے بلوغ میں معاون ہو سکیں لیکن اس برادری کی کسی چیز میں (جو قابل فخر ہوں) مجھے دوسروں سے مغائرت اور آپس کی ہم آہنگی نظر نہیں آتی ۔۔۔ برادری کیا ہے ؟ اس بارے میں یقیناً کوئی نئی چیز نہیں بتا سکوں گا ۔ لیکن اگر آپ کے سینہ میں حساس دل اور دماغ میں غیر متعصبانہ انداز سے سوچنے کی قوت باقی ہے تو اتنا غور فرمائیے کہ کیا برادری کی تشکیل کے

ہے یہ تہا عنصر فساد کا کام دیتے ہیں ۔ پنجابی برادری کے ترقی پسند اور وسیع النظر نوجوانوں سے برادری کے متعلق گفتگو کرنے کا اکثر موقع ملا ہے اور میں نے متعدد بار برادری کے متعلق اُن کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن کسی نے بھی امید افزا رائے کا اظہار نہیں کیا۔ شیخ محمد یامین صاحب برادری کے ہونہار ترین فرزندوں میں سے ہیں۔ لیکن انہوں نے فرمایا۔

" میں اس برادری سے منسلک ہوں۔ میں کچھ فخر محسوس نہیں کرتا بلکہ میں نے اس سے تمام رشتے توڑ لیے ہیں میں اس کا فرد نہیں ہوں " شبیر صاحب کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی ۔ ایس۔ ایم یوسف صاحب باغپتی کا خیال ہے " برادری سرمایہ داروں کا اڈہ ہے ۔ یونس باغپتی صاحب کی دانست میں " برادری بے دلیوں کی جماعت ہے " سمجھدار اور ترقی پسند نوجوانوں میں صرف عمر الہی ایسے ہیں جو سوال کے جواب میں اقبال کا یہ شعر دہراتے ہیں ۔ نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے ۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی لیکن سوال ہے یہ نم کیسے ہو؟ دنیا نے بار بار یہ سبق دہرایا ہے کہ کسی قوم جماعت یا برادری کی ترقی میں نوجوانوں کا حصہ سب سے زیادہ ہوتا ہے اور نوجوان اسی وقت آگے بڑھتے ہیں جب موجودہ قوتیں ان کی معاونت سے گریز نہ کریں یہ درست ہے کہ اصلاح اور ترقی کی لگن سے جو روح منسلک ہے وہ ان وقتی اور عارضی دشواریوں سے پریشان نہیں ہوتی لیکن جب قومی کے جسد مردہ میں کیڑے پڑ رہے ہوں، جب دنیا دو طبقوں میں تقسیم ہو چکی ہو اور ایک عالمگیر تبدیلی کروٹیں لیتی ہوئی نظروں کے سامنے ہو اس وقت نوجوانوں کے ذہن اس محدود دائرہ میں رہ سکتے ہیں؟ ان حالات میں نوجوانوں کے ذہن کو مفید کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ کم از کم اس گروہ میں سے موجودہ عالمگیر بے چینی کی بیخ کنی کر دی جائے تاکہ ان کے ذہن سے اس بوجھ کی شدت کم ہو جائے جس نے دنیا کو بے چین کر رکھا ہے ۔

لیکن جس برادری کا نیم شکستہ مقبرہ اس تقسیم پر کھڑا ہو وہ کیوں کر برداشت کر سکتی ہے کہ ان نوجوانوں کو جو ہر انداز اور ہر عنوان ان سے کمتر نظر آتے ہیں اپنے برابر جگہ دیدے یہاں صرف ایک چیز کی پوجا ہوتی ہے ــــ پیسہ ــــ پیسہ، دانگ، تانبہ، کانسی اور کاغذ کا وہ ٹکڑا جس پر برٹش شہنشاہیت کے سرپرستوں کی چھاپ موجود ہو ــــ یہاں عزت کی نگاہ سے وہ شخص دیکھا جاتا ہے جس کے تصرف میں سیمنٹ اور چونے کے ان گنت گھروندے ہوں، یہ سوال نہیں کہ حصول کے لئے کون سے ذرائع استعمال کئے گئے ، کوئین فروشی پر احتساب نہیں، دیوالیہ نکلنے قابل گرفت نہیں، یتیم اور بیوہ کا مال مار لینا پر اعتراض ، حماقت ، قومی جماعتوں سے ذاتی منفعت کے لئے استفادہ کرنا درست لیکن دولت کے بغیر تم اور تمہاری صلاحیت ناقابل اعتبار ، ناقابل اعتبار ، اور اخلاق ایک اضافی چیز ہے ، مذہب کی ضرورت اس لئے ہے کہ چند کنووں اور مسجدوں کی تعمیر سے فراغت پاکر معترضین پر ان ترقی پسندوں پر جو زبان بے زبانی کی اپیلوں سے اکتاکر مرلیہ پرستوں کے لئے گور و کفن کا بندوبست کر رہے ہیں مذہب دشمنی کا الزام عائد کر سکیں۔

سرمایہ کی مرکزیت نے متوسط طبقہ کو جنم دیا جو مستقلاً روحانی عذاب سے ہمکنار رہتا ہے ، یوتھ لیگ کی بنیاد پڑی کہ بیاہ شادی کی رسموں کو ختم کرکے برادری کے افراد کی عزت کو برقرار رکھ سکے ۔ متمول حضرات اس پابندی کو نہ سہہ سکے ۔ کچھ حضرات کی کشادہ کوٹھیوں کے تنگ دروازوں پر یوتھ لیگ کے ممبران کو مجروح ہونا پڑا ، کچھ حضرات کے عالیشان مکانوں کے سامنے ان نوجوانوں کے جذبہ خدمت کو نخوت اور غرور کے شکنجے میں کسا گیا جو ان سے زیادہ ہوشیار تھے انہوں نے ان سرمایہ پرستوں کی بزدلی جوانی ہوشیاری کے سبب رند بھی اور جنت کے حقدار بھی وعدے اب تک باقی ہیں جرمانے وصول ہونے کا سوال ــــ سوال ہے جس کا جواب ایک طنزیہ مسکراہٹ سے ملتا ہے ــــ دیکھا کیا بیوقوف بنایا۔

خاص نمبر ماہنامہ پنجابی گزٹ ۱۹۴۶ء

جہلا کے ایسا گروہ میں اب تعلیم یافتہ طبقہ کی قدر ہونے لگی ہے، یہ لڑکا تعلیم یافتہ ہے، اس کا ذہن بیدار ہے، اپنی اولاد کے آرام کے لئے اس کی بولی لگائی جاتی ہے، ان مغرور اور بد دماغ لڑکیوں کے لئے انہیں خریدا جاتا ہے جنہیں گفتگو کا طریقہ تو کجا نشست و برخاست کا سلیقہ نہیں معلوم جو حکومت کرنا چاہتی ہیں کیونکہ ان میں خلاقی قوت نہیں کہ کسی کو جیت سکیں اولو جوان —— نوجوان بکتے ہیں کیونکہ ان کے معاشی مسئلہ ان کے سنہری خواب جوانی کی دستبرد سے باہر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پورے ہو جائیں گے اور قوم کا وہ متوسط طبقہ جو ضروریات زندگی کی قربانی دیکر اولاد میں جوہر قابل پیدا کرتا ہے پھر تہی دامن رہ جاتا ہے —— اور ہم کہتے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ قوم کا شیرازہ منتشر نہ ہو پراگندہ نہ ہو کیونکہ دولت اور شہرت کا یہ بلند آسمان آ پڑے گا جو متوسط طبقہ کے زخمی کاندھوں پر رکھا ہوا ہے

قوم کے ایسے ہی مغز و تہی پوست نوجوانوں کی شکایت فضول ہے۔ کمتر ہیں جنہوں نے اپنی روح اور خودداری کو نیلام ہونے سے بچا لیا کم ہوں گے جو غلط نہ ہوں کہ بے لگامی تو کہنے کی حماقت پر درسش کر سکتے ہیں —— سیلون ہے کہ ہم بیکتم لڑکی کے ہمنوا ہیں ہم روسو اور نٹشے کو سمجھتے ہیں۔ ہم انقلاب فرانس کی روح سے واقف ہیں۔ ہم صحیح راہ ہیں۔ ترقی پسند ہیں —— بامعنی ہیں اور بے معنی رہیں گے —— دولت کے لئے روح و جسم کی ہم آہنگی فروخت کرنے والے ایک ذہنی فروخت کو نہیں سمجھتے گورکی، لینن، روسو اور والٹیر کو مسنس نصاب تعلیم کی موجودگی میں سمجھنا تو یقیناً کار دشوار ہے۔ اسلامی تعلیمات جن کی ترویج کے لئے یہ مجسم گناہ انسان مسجدیں تعمیر کرکے گوشت و پوست کے مجسمے پر ورش کرتے ہیں آج ہمارے سینوں کو منور نہیں کرتیں کیونکہ کالا پیسہ جو اس کی تعمیر میں صرف ہوا اور وہ ذلیل مقصد جو بس سے وابستہ ہے کسی بلند نتیجہ کا ماخذ نہیں بن سکتا۔ یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے کہ ہمارے سینوں میں الحاد کی تاریکی اور کفر رہا پوشیدہ رہے —

پھر دہراتا ہوں

یہ سب کچھ پڑھنے کے بعد (اگر مجھے بہت کم امید ہے کہ لوگ اسے پڑھنا پسند کریں گے) آپ ناراض ہو گئے ہیں لیکن میں اسی چیز کو پھر دہراتا ہوں۔ جو مئی اور جون کے شمارہ میں لکھی جا چکی ہے اگر آپ چاہتے ہیں کہ قوم میں حیات نو پیدا ہو اور اکابرین قوم کا وقار بڑھے تو اس کا واحد طریقہ یہی ہے کہ قوم کے جوان اور تازہ خون کو بڑھانے کی کوشش کیجئے۔ برادری کے اکثر حضرات بڑی بڑی فرموں، کارخانوں اور دفتروں کے مالک ہیں۔ ان کے ذہن ان سانچوں میں ڈھل کر پختہ ہو چکے ہیں ان راہوں پر وہ کہنہ مشق سوار کی طرح گھوڑے دوڑاتے ہیں اور راستہ کی تمام دقتوں پر عبور حاصل ہو چکا ہے۔ وہ چاہیں تو قوم کے یہی نوجوان جو آج دفاتر کا رخ کئے افتاں و خیزاں چل رہے ہیں، صنعت اور تجارت کے ذریعہ نہ صرف برادری بلکہ اسلامی ہندوستان کی زبردست خدمت انجام دے سکتے ہیں اور یہی اکابرین جواپنی خوں آلود نگاہیں دکھا کر مسکرانے پر مجبور کرتے ہیں کل وسعت خودی اور اظہار شخصیت کے لئے اس آمرانہ طریقہ سے نجات پا سکتے ہیں —— شکایت ہے کہ اکثر نوجوان کام سیکھ کر اور رازہائے سربستہ کے انکشاف کے بعد خود ان بزرگوں کے کاروبار پر رہزن بن کر بیٹھ گئے جن کی نظر عنایات نے خاک رہگذر کو فراز آسمان سے آگاہ کیا۔ ایسی اکثر مثالیں موجود ہیں۔ در حقیقت یہ الزام کسی عنوان دور نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی تمام تر ذمہ داری —— اگر معاف فرمایا جائے —— ان لوگوں پر نہیں جو محسن کش کہلاتے ہیں۔ ظاہر ہے قوم کے بڑے بڑے سرمایہ دار اور کاروبار کا لوگ صرف اس لائن اور اس ہی بزنس سے واقف نہیں ہوتے جس کا بوجھ ان کی دوکان پر آویزاں ہوتا ہے بلکہ وسیع تجربہ، تعلقات اور سرمایہ کی بدولت وہ ایسی متعدد لائنیں تجویز کر سکتے ہیں جن کی بدولت نہ صرف ایک برادری کا نوجوان برسر روزگار ہو سکتا ہے بلکہ ان کا سرمایہ جو تجوریوں میں مقفل ہے کمائی اور آمدنی کا ذریعہ بن سکتا

مثال کے طور پر شیخ منیر الرحمن صاحب چھڑی والے مدت دراز سے گھڑیوں کا کاروبار کر رہے ہیں لیکن آپ نے چند سال پیشتر ریشمی کپڑا بیچنے کو متفرق حاصل کیا کیونکہ آپ کا رسوخ اتنا وسیع تھا کہ آپ کو اس کا موقع حاصل ہو سکے۔ شیخ سراج الدین گھڑی والے بھی ہمیشہ سے گھڑیوں کی فروخت میں مصروف نہیں لیکن آپ نے بھی حال ہی میں چشمہ کا کاروبار شروع کیا اور اپنے تجربہ کی مدد سے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ شیخ محمد حنیف صاحب دوائی کا کام کر رہے تھے لیکن پچھلے چند سالوں میں مختلف کاروبار اپنانے کی کوشش کی اور خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ دتی میں ناقابل تردید مثال جناب انوار الحق چشمے والوں کی ہے کہ گو آپ بچے ہیں اسی کام کی طرف توجہ کی اور ملا صاحب ورثہ میں چشمے کی دوکان پائی لیکن آج آپ اس موروثی کاروبار کے ساتھ نئی لائن میں بھی پہنچ چکے ہیں اور آپ کا ہیڈ Commission Office (کمیشن) ڈسٹری بیوشن آفس دہلی میں موجود ہے چنانچہ برادری کے ان نوجوانوں کو جن کے دل میں آگے بڑھنے کی تڑپ ہے وہ کام سکھائے جائیں یا ان لائنوں میں انہیں مواقع دئے جائیں جن سے وہ واقف ہوں تو یہ شکایت کبھی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ انسان سمجھتا ہے کہ جو کام اسے آتا ہے وہ کرے اگر کام سیکھنے کے بعد ضروریات زندگی کی افزونی اسے مجبور کرے تو وہ سوائے اس کام کے دوسرا کام کر ہی نہیں سکتا۔

آج ہندو اپنی قوم کے ذہن فعال کو بیدار کرنے میں زبردست جانفشانی دکھا رہا ہے۔ قوم کے وہ نوجوان جو تعلیم سے فارغ ہو کر کسی کاروبار سے لگنا چاہتے ہیں اور کسی خاص لائن میں ان کے لئے دلچسپی اور کشش ہوتی ہے تو ہندو سرمایہ دار اپنے سرمائے اور دیگر چیزوں سے اس کی مدد کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے دس ہزار روپیہ لگانے کے بعد وہ صرف ایک ضرورتمند نوجوان کی مدد ہی نہیں کرتا بلکہ شریک کار کی حیثیت سے اپنی آمدنی میں اضافہ بھی کرتا ہے اور پھر سرمایہ اس کی اپنی نگاہوں کے سامنے اس کی اپنی منشا اور سوجھ بوجھ کے مطابق خرچ کیا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کاروبار میں نقصان ہوا اور دس ہزار روپے کی رقم کا نصف باقی رہ گیا لیکن ایک مکمل کاروباری کی طرح وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا کیونکہ اس کا اپنا کاروبار جس نے اسے لاکھوں کا مالک بنا دیا بدستور چل رہا ہے اور ایک نوجوان جس کی اس نے مدد کی تھی ایک کہنہ مشق تاجر بن گیا جس کی امداد سے اور سینکڑوں نوجوان تجارت اور صنعت سیکھ سکیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقتی نقصان کے بعد اس نوجوان نے کھوئی ہوئی رقم سے کئی گنا زیادہ کما دیا۔

میں پھر دہراتا ہوں کہ حیات قومی کے تخیل کو اگر زندہ کرنا مقصود ہے تو مستحق لوگوں کو محروم بنانے کی کوشش مت کرو۔ یہ درست ہے کہ موجودہ نظام حکومت اور موجودہ اقتصادی حالات ان کی روح کو کچل دیں ہاتھ پیر پابند رسن ہو جائیں لیکن بغاوت کا وہ جذبہ جو ان کے دماغ میں ہیجان پرورش پا رہا ہے ٹھنڈا نہیں ہو سکتا اس کو بجھانے کے لئے خون کے چھینٹوں کی ضرورت ہوگی —— وہ سفید خون جس نے یہ آگ لگائی اور شعلے بھڑکائے تھے۔

قوم کی اہم ترین درسگاہ مدرسہ اصلاح البنات

دور انحطاط کی ابتدا اور مغلیہ حکومت کے اختتام نے ہندوستان کے مسلمان کو چڑچڑا اور زود رنج بنا دیا تھا اس لئے مٹی ہوئی تہذیب کے نقوش پر نوحہ خوانی جاری رہی اور تعلیم و تربیت کی نئی شکل کی طرف توجہ نہیں دی جا سکی۔ سرسید احمد نے اس ضرورت کا احساس پیدا کیا اور مسلمانوں نے مسلم یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ یہ مسئلہ گو حل ہو گیا لیکن تعلیم نسواں کا مسئلہ جو اہم تھا دوسرا تھا فوراً نظروں کے سامنے آگیا۔ روایات کی غلط بندشوں کے سبب تمام ملک میں

اس کے خلاف ہنگامے شروع ہوئے یہ ایک نفسیاتی اور وقتی ضرورت تھی اس لئے جلد یا بدیر ملک نے اسے اپنا لیا اور طبقہ نسواں میں تعلیم شروع ہو گئی لیکن پنجابی برادری جو رجعت پسندوں کا سب سے بڑا گروہ ہے تمام اسلامی ہند کے فیصلے کے باوجود اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر کار برادری کے نوجوان تنگ آ کر برادری کے باہر لڑکیوں کے متلاشی نظر آنے لگے اگر کچھ شادیاں برادری میں ہوئیں بھی تو لڑکی کی زندگی [illegible] ہو گئی لڑکے اور لڑکی کے ذہنی تفاوت نے برادری کو مجبور کیا کہ وہ اس اہم ضرورت کی طرف توجہ دے۔

برادری کے نوجوان جو اس ضرورت کو مدت سے محسوس کر رہے تھے فوراً آگے بڑھے اور بزرگوں کے زیر سایہ اس کام میں مصروف ہو گئے یہ مدرسہ انجمن وکیل قوم پنجابیان (جو برادری کی سب سے بڑی انجمن ہے) کے زیر اہتمام کھولا گیا ہے۔ اور مالی امداد کے لئے گورنمنٹ کا محتاج نہیں۔ نصاب تعلیم جس کی کمزوری کے سبب تعلیم کا صحیح مقصد فوت ہو جاتا ہے گورنمنٹ کا مقرر کردہ ہونے کی بجائے خود برادری کے افراد نے بنایا ہے تاکہ قومی روایات کو برقرار رکھنے میں مدد مل سکے۔ عمر الٰہی صاحب نائب ناظم جو قومی کاموں میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں عرصہ دراز تک مختلف تعلیمی اداروں، طریقہ تعلیم اور نصاب کو بنظر غائر دیکھتے رہے اور اس کے بعد آپ نے متواتر کئی ماہ کی شبانہ روز محنت کے بعد اسکول کا نصاب بنایا۔ اور سربرآوردہ حضرات کے سامنے منظوری کے لئے پیش فرما دیا۔ فی الحال اس اسکول میں پانچ جماعت تک تعلیم دی جاتی ہے لیکن امید ہے کہ بہت جلد یہ تعلیمی ادارہ دسویں جماعت تک کام شروع کر دے گا۔ تعلیم نسواں کے لئے انجمن کے پیش نظر اور بھی اسکیمیں بھی ہیں اگر برادری کے افراد نے اسکول کی اعانت کی، وہ اپنی بچیوں کو داخل کرانے میں سرگرمی کا اظہار کیا تو امید ہے بہت جلد یہ تمام اسکیمیں منظر عام پر آ کر عملی جامہ اختیار کر لیں گی اگر اس سلسلہ میں برادری کے دوسرے اسکول جو مختلف افراد برادری کے اخراجات سے چل رہے ہیں مرکز کے تحت آنا منظور کر لیں تو تکمیل مقصد کے مراحل بہت تیزی سے طے کئے جا سکتے ہیں۔

آنے والی نسلیں تعلیم نسواں کے لئے عمر الٰہی کی ممنون ہوں گی جن کی توجہ اور ایثار نے اس اسکول کی ترقی کے لئے ان تھک جدوجہد شروع کر رکھی ہے۔

پنجابی اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول

کچھ باتیں کانوں سے سنی جاتی ہیں۔ کچھ چیزیں آنکھوں سے دیکھی جاتی ہیں کچھ کو دل محسوس کرتا ہے۔ پنجابی اسکول کی داستان کانوں سے سنی جا سکتی ہے آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہے اور دل محسوس کرتا ہے۔ پنجابی اسکول کا قیام صدیوں کی بات نہیں۔ ایسا کوئی نہیں جو اسکول سے وابستہ کسی راز کو سینہ میں چھپا کر شہر خاموشاں کا مکین ہو گیا۔ اسکول کے قیام کو اتنی مدت بھی نہیں گذری کہ کسی (Period) کو جن آنکھوں نے دیکھا تھا وہ آج پتھرا گئی ہیں اور ہم اس زمانہ کو صرف مورخ کی سیر بین سے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو اسکول کے خلاف تنقیدی انداز سے گفتگو کرتے ہیں۔ جن کے دماغ اسکول کی چہار دیواری کو برادری کی روایات پرورش کرنے کا Nursing Home بنائے جانے کی تجاویز سوچنے میں مشغول ہیں اور وہ جو اسکول کی موجودہ رفتار اور موجودہ نظام سے مطمئن ہیں دونوں گروہ کے تمام افراد نے اسکول کا عہد طفلی دیکھا ہے اور بعض حضرات نے اپنی تعلیمی گھتیاں یہاں ہی کھولنی شروع کی ہیں اور وہ لوگ بھی جو ان دونوں گروہ کے مخاطب ہیں اس تمام ارتقائی دور سے بخوبی واقف ہیں۔

اسکول جیسا کہ تمام پبلک ادارے شروع ہوتے ہیں بہت چھوٹے سرمایہ اور تعلیمی معیار سے شروع کیا گیا تھا۔ طلبا کے

لیے کوئی شاندار بلڈنگ یا عمدہ فرنیچر نہیں تھیں مگر کچھ عرصے بعد برادری کے افراد نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی اور اسکول نے تمام شعبوں میں وسعت پیدا ہونے لگی اور آج پنجابی اسکول ہائر سیکنڈری ہے - اس کی بلڈنگ کی قیمت دس لاکھ کے قریب اور اس میں کئی سو لڑکے تعلیم پاتے ہیں - برادری کے افراد کے حیرت انگیز ایثار نے اسکول کو بہت جلد ارتقائی منازل طے کرادیے اور آج یہ ہی اسکول جو اگر ہم مڑ کر دیکھیں ——— کھنڈر لگتا اور منہ لبورتا نظر آسکتا ہے بہت جلد آگے بڑھ گیا اور یہاں تک کہ آج ہم نتائج معلوم کریں دہلی کے تمام مسلم اسکولوں کو تعلیم اور کھیل کے میدانوں میں للکار رہا ہے - امسال کے نتائج بتاتے ہیں کہ طلبا کے ذوق اساتذہ کی محنت اور افراد برادری کی توجہ نے اسے اسلامی اسکولوں میں اول آنے کا اعزاز بخشا ہے -

لیکن ذاتی عناد اور شخصی مخالفت کی کمین گاہ سے نکل کر صرف اتنا سوچنا گوارا کیجئے کہ آخر افراد برادری کو جگانے والے وہ جنہوں نے اس ضرورت کا احساس پیدا کیا اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی خدمات کو سراہا جائے - دہلی میں مختلف پبلک ادارے موجود ہیں اور اگر دہلی کے پبلک اداروں کے نام اور ان کی مختصر تاریخ سے برادری کے پندار کو ٹھیس پہنچتی ہے تو کہ روایات کی نوزائیدہ بچی کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہے تو برادری کے پبلک اداروں پر نظر دوڑا لیجئے - کتنے ایسے ادارے ہیں جو ادارے کی ترقی کو برادری کے التفات کا ثمر سمجھتے ہیں - میں جانتا ہوں اور شاید دوسرے بھی انکار نہ کرسکیں کہ تمام ترقی صرف ایک ذات سے منسلک سمجھی جاتی ہے اور اس کا باقاعدہ پروپیگنڈہ ہوتا ہے لیکن اسکول کی تاریخ میں کبھی کسی فرد نے اپنی آمریت اور خود مختاری کا اعلان نہیں کیا - اسکول کا نظام وہ لوگ چلاتے ہیں جنہیں انجمن وکیل قوم پنجابیان مقرر کرتی ہے اور انجمن کے افراد براہ راست برادری کے جمہور کی رائے سے منتخب کیے جاتے ہیں اور اس طرح اسکول کا تمام نظام برادری کی مرضی سے اس کے اپنے مقرر کردہ لوگوں کے ہاتھ میں رہتا ہے اس کے باوجود شور مچتا ہے کیونکہ مچایا جاتا ہے یا تو وہ لوگ جو اسکول کی ترقی کے لئے اس قدر مضطرب ہیں آئین اور آئینی جدوجہد سے واقف نہیں اور اگر واقف ہونے کے باوجود وہ عوام کی معصومیت کو غلط اور گمراہ کن نشر و اشاعت کا ہدف بنانا چاہتے ہیں تو اسکول سے متعلق لوگوں کو اپنی زریں رائے سے فیضیاب کرنے سے پیشتر خود انہیں علم الاخلاق کا ابجد خواں ہونا ضروری ہے -

ایک نعرہ ہے بے معنی ایک شور ہے مہمل ——— غیر پنجابی طلبا کو اسکول سے نکال دو ——— کہنے والے کی نیت کیسی ہے نہیں معلوم نتائج کیا ہوں گے کوئی نہیں سوچتا - ایک رو ہے ایک لہر ہے جو چند ذہنوں میں پیدا ہوئی اور اتنی شدت اختیار کی کہ پاگل پن کی حدوں کو چھو لیا - غیر پنجابی طلبہ کو اسکول سے نکال دو ——— کیوں ؟ ——— کیونکہ اس کی بلڈنگ پنجابیوں نے بنوائی ہے - ظاہر ہے دہلی کے کسی تعلیمی ادارے کی عمارت گورنمنٹ کے پیسے سے نہیں بنی جس طرح آج ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم بلڈنگ کی وجہ سے دوسروں کو نکال دیں اس ہی طرح ہندو کالج کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ آپ کے طلبا کو کان پکڑ کر اپنے احاطے سے باہر کردے - اندرپرستھ آپ کی معدودے چند خواتین کو دھکے دے کر نکال دے - سینٹ اسٹیفن اپنے دروازے بند کردے اور آپ کے لئے ہر تعلیمی ادارے کا دروازہ بند کردیا جائے اور صرف یہی نہیں بلکہ نیشنل پبلک لائبریری جس کی بلڈنگ فنڈ کے لئے آج کل کافی کوششیں ہورہی ہیں اس کے دروازے پہ آویزاں ہو :- "یہ لائبریری صرف پنجابی برادری کے لیے ہے کیونکہ اس کی عمارت ان کے پیسے سے بنی ہے" - اور آج بھی اس میں غیر پنجابی مطالعہ کنندگان کا داخلہ ممنوع ہونا چاہیئے کیونکہ وہ تمام اخبارات و رسائل یا تو افراد برادری کے سرمایہ سے خریدے جاتے ہیں یا کمیٹی کا گرانٹ اس ضمن میں خرچ ہوتا ہے -

... لامیہ
جامعہ نگر (دہلی)

اسکول کو گورنمنٹ گرانٹ سے آزاد کرکے قومی سرمایہ کے بل پر چلانے کا فیصلہ کرنے سے پیشتر ہمیں یہ چیز پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ آیا ہندوستان کے کسی اور گوشے میں یہ تجربہ کیا گیا ہے؟ اس کے نتائج کیا ہیں؟ ہندوستان میں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دونوں موجود ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کو گورنمنٹ گرانٹ دیتی ہے۔ جامعہ ملیہ اس سے بے نیاز ہے دونوں عرصہ دراز سے ملک و ملت کے افراد کو ایک اچھے شہری اور کارآمد انسان بنانے میں مصروف ہیں ادارہ نے بہتر دماغ اور انسان پیدا کئے۔ ظاہر ہے مسلم یونیورسٹی کے مقابلہ میں جامعہ کی اہمیت کچھ بھی نہیں ہے لیکن یہ مسئلہ صرف ان دلائل سے فیصل نہیں ہوجاتا۔ ہم کو دیکھنا ہے آیا دیگر اقوام یا برادریاں ایسی ہیں جو اپنے ذاتی ادارے قائم کرنے کی ہمت رکھتی ہیں پھر انہوں نے ایسا کیا یا نہیں؟ ہندو کالج دہلی میں موجود ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہندو نہ صرف ایک کالج بلکہ تمام ہندو اداروں کو قومی بنانے کی سکت اور دولت رکھتے ہیں لیکن وہ ایسا نہیں کرتے کیونکہ ایسا کرنے سے آج کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ آج داعیات کو پورا کرنے کے لئے وہ جو قدم اٹھاتے ہیں اس کی مثال ہندو کالج ہے اور پھر وہ حضرات جو اعتراض کرتے کرتے خود اپنے اعتراض کا ہلکا پن محسوس کرنے لگے ہیں اگر گستاخی تصور نہ کریں تو اپنی معلومات کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ نصاب تعلیم بنانے مختلف طریقہ تعلیم چلانے اس کی جزوی ضروریات اور بنیادی عناصر کے متعلق ان کے کیسہ ذہن میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اگر وہ معزز افراد قوم اس بارے میں زیادہ وقعت نظر کا ثبوت دیتے تو یہ کہنے سے پہلے کہ برادری کے اس ادارے کو برادری کے نوجوانوں کے لئے مخصوص کرکے تجارتی اور صنعتی تعلیم کے لئے وقف کردو اپنی دلیل اور نقطہ نظر کا ہلکا پن محسوس کرلیتے

کسی بھی شعبہ زندگی میں جانے کے لئے کسی خاص برادری یا خاندان کا فرد ہونا کبھی ضروری نہیں ہوتا۔ وراثت اور ماحول کے بارے میں آج یورپ کے حکماء اور گروہ فلاسفہ کچھ نہ جاننے کے باوجود بہت کچھ معلوم کرچکے ہیں۔ انسان کا ذہنی رجحان اور طبعی میلان نہ صرف وراثت کا رہین منت ہے۔ نہ ماحول کا بلکہ بعض اوقات نوجوان کی مخصوص فطرت اپنے لئے عجیب وغریب راستے نکالتی ہے اور رکاوٹوں کے باوجود ان راستوں کی پیمائش کرتی ہے اور پھر آج کی دنیا میں جب کہ فرسودہ نظام دم توڑ رہا ہے اس قسم کی باتیں کرنا عروج وترقی کے لئے کارآمد نہیں ہے۔ تجارتی اور صنعتی اسکول کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں کئے جاسکتے اور اگر کئے جاسکتے ہیں تو صرف اس طبقہ کے لئے جو تجارتی اور صنعتی ذوق رکھتا ہو۔ اور وہ طبقہ ضروری نہیں کہ صرف پنجابی نوجوانوں پر مشتمل ہو۔

آج کے حالات میں ہمیں مل جل کر کام کرنا اور آگے بڑھنا ہے جو ہم دوسروں کے لئے کرسکتے ہیں اس سے دریغ کرنا نہ صرف انسانیت بلکہ آج کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ ہمیں وہ کرنا چاہیئے جو ہمارے گرد و پیش کی دنیا کا تقاضہ ہو فطرت کے مطابق عمل کرنا انسان کے لئے باعث ننگ ہے اور بقول علامہ اقبال "فطرت تو بس ہے اور دانش کا کام ہے انسانی ذہن کے ارتقا میں روڑے اٹکانا" میں افراد برادری سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ کسی مسئلہ کا حل تلاش کرنے سے پہلے ٹھنڈے دل اور سائنٹیفک نقطہ نظر سے غور کرنے کی عادت ڈالیں۔ زندگی میں کامیابی کا پہلا اصول ایک متوازن ذہن ہے۔

ہماری سیاست

آج سے پیشتر ہماری سیاست آسمان کی طرح ساکت وجامد اور آغوش فلاکت میں رہنے والے غریبوں کی ضروریات سے بے خبر تھی لیکن آج وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی خاک آلود سطح پر اتر آئی ہے اور اب اس میں تپش بھی ہے اور حرکت بھی سوز بھی ہے اور زندگی بھی۔ سیاست دان عوام کو پس پشت ڈال کر ذاتی مفاد کے لئے برٹش شہنشاہیت سے سودا بازی کرنے کے قابل نہیں رہا۔

کیونکہ عوام کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور آہنی عزم نے اُن پر واضح کر دیا ہے کہ ہر وہ قدم جو اُن کی خواہشات کے برخلاف اٹھایا جائیگا۔ رفتہ رفتہ اٹھ جانے سے پیشتر حرکت کے قابل نہیں رہے گا۔ اندھی عقیدت کا دور گذر چکا اب جمہور میں احتسابی شعور اور تنقید کی قوت جاگ گئی ہے۔ وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ دماغ سے سوچتا ہے اس کا اندازاب نتیجہ کی شکل اختیار کر چکا ہے اب نتیجہ جس کے خلاف کوئی چیز ظہور پذیر نہیں ہوتی۔

کیبنٹ مشن کی آمد پر لیڈروں نے جس طرح اظہارِ خیال کیا وہ ایک زندہ قوم اور اس کے رہنماؤں کے شایانِ شان نہ تھا۔ ان کی تشریف آوری کے بعد ملاقات کا لامتناہی سلسلہ اور کشکول گدایانہ لے کر بھیک مانگنے کا جو طریقہ لیڈروں نے اختیار کیا وہ عوام کی فہم سے بالا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق مانگا نہیں جاتا حاصل کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف سامراج جمہور کے اس جذبہ کو بدلنا چاہتی تھی۔ اُس کا ادنیٰ مقصد یہ تھا کہ عوام جو ایک دوسرے سے بالحاظ مذہب و ملت مختلف ہونے کے باوجود حصول آزادی کے لئے متحد ہوتے جا رہے ہیں اس اتحاد کو پارہ پارہ کیا جائے چنانچہ انہوں نے مختلف جماعتوں کے لیڈروں کی استقامت اور اخلاقی بلندی کا جائزہ لینے کے بعد ایک منشور شائع کر دیا جس کی ہر سطر میں ایک دام ہمرنگ زمین پوشیدہ اور ہر لفظ میں ایک قفس پنہاں تھا قفس کو آشیانہ سمجھ کر ہر جماعت ہر لیڈر لپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس جال میں پھنس گیا جس میں سے نکلنے کی سعی جلد جلد ہو رہی تھی قفس کی فضا میں کبوتر کی منقار اور شاہین کے بازو کا فرق ظاہر ہوا اور بمبئی کے اجلاس میں مسلم لیگ کونسل نے منشور غلامی کو ٹھوکر مار کر اس پھندے سے گلو خلاصی کر لی جس کے آخری حلقے میں آج ملک کی سب سے منظم سب سے پرانی سب سے طاقتور اور بقول شخصے حریت پسند جماعت پھنس چکی ہے۔

ایسا کیوں ہوا؟ —— یہ بتانا مورخ کا فرض ہے میں اتنا جانتا ہوں کہ جو کچھ نہ ہونا تھا وہ ہوا اور جواہر و پٹیل جیسے دماغ آج وائسرائے کے تابع فرماں ہو کر کام کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ یہ ہندو لیڈرشپ اور ہندو عوام دونوں کی شکست ہے مسلم لیگ کے رویہ نے مسلم قوم اور مسلم لیڈرشپ دونوں کو محفوظ رکھا۔ اور آج ملک کا ہر شخص جو اس قسم کی عارضی حکومت کے نتائج سے واقف ہے اس راز کو جانتا ہے —— خواہ اس کا سینہ ان اسرار کا مدفن بن کر رہے۔

ہندو مسلم فساد وہ خفیہ ہتھیار رہے جس کی مدد کی بدولت آج تک برطانوی اقتدار ہندوستان میں موجود رہے اور جب تک ہندوستان کے برہنہ جسم پر سنگ و آہن کی ضربات پڑتی رہیں گی اس کی ذمہ داری ہندو مسلم نااتفاقی پر ہوگی۔

ظاہر ہے کہ ہندو مسلمان اس ملک کو چھوڑ کر باہر نہیں جا سکتے ان کے مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں وہ ایک دوسرے سے کافی قریب رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود جب فرقہ وارانہ فساد شروع ہوتے ہیں تو وحشت و بربریت کے ایسے بھیانک مظاہرے ہوتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت کے انسانوں کی تاریخ بھی اس سے خالی ہوگی اور پھر یہ چیز عوام تک ہی محدود ہو کر نہیں رہ جاتی بلکہ صفِ اوّل کے لیڈر اور تمام پریس جو عوام کا رہنما ہونے کا دعویدار ہے اصلی دشمن کو فراموش کر کے ایک دوسرے کو خطا وار ثابت کرنے میں سارا زورِ قلم صرف کر دیتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان تخریبی حرکات سے جو کچھ ظہور پذیر ہوگا اس سے دونوں کے دشمن کے ہاتھ مضبوط ہوں گے جو کچھ ضائع ہوگا وہ دونوں کی Common Property ہے اور Common Wealth ہے۔ کلکتہ کے فسادات ہفتہ بھر کی بات نہیں لیکن ہندو پریس اور ہندو لیڈر

اس کا تمام الزام شہید حسن سہروردی وزیر اعظم بنگال اور مسلمانوں کے سر تھوپ رہے تھے لیکن اس وقت بھی اگر کسی نے اولوالعزمی اور ترقی پسندی کا ثبوت دیا وہ مسلم قوم اور شہید حسن سہروردی ہی تھا - اُس نے کہا اور بیانگِ دہل کہا کہ برٹش شہنشاہیت اور ہندو سرمایہ دار کا آوردہ ہے - سرمایہ دار خواہ وہ کسی طبقہ سے متعلق ہو کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ اس کے دست تصرف سے تجارتی اور صنعتی اجارہ داری نکل کر عوام کی ملکیت ہو جائے۔

اور فسادات کے بعد بے گناہ شہریوں کی اپنوں کے ستم سے شکوہ سنج اور ماتم کناں لاشوں کو اٹھانے کا انتظام بھی ان کو ملکر ہی کرنا پڑا - اگر مرتے ہوئے بھائیوں کو اٹھانے سے پہلے وہ زندہ دوستوں کو سہارا دینے کی کوشش کرتے تو کیا اس سے بہتر نہ ہوتا لیکن کون ہے جو ان باتوں پر غور کرے اور کون ہے جو انہیں یہ باتیں یاد دلائے - لیڈر آج سودے بازی میں مصروف ہیں رہ رہ کر صرف ایک آواز گونجتی ہے اور وہ قائدِ اعظم کی ہے کہ ـــــ باامن رہو ہماری لڑائی ہندو عوام سے نہیں بلکہ برٹش شہنشاہیت اور ہندو سرمایہ داری سے ہے - اور تعجب نہیں اگر کچھ عرصے کے بعد اچھوت کی طرح ہندو بھی اس کی قیادت میں آگے بڑھنے کا عزم کرلے۔

اس وقت مسلمان کے سامنے ایک سوال ہے ـــــ وہ کیا کرے اس کا صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ اپنے واحد رہنما قائدِ اعظم اور واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے حکم کی پیروی کرے جو قوم خون دینا جانتی ہے اسے زیادہ گھبرانے اور پریشان ہونے کی کبھی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔

برادری کے خطاب یافتہ

آج عوام اور جمہوریت سے وابستگی کا اعلان کرنے والے لوگوں میں سرکار پرست لوگوں کی تعداد دوسرے لوگوں سے کافی زیادہ ہے - مسلم لیگ نے برطانوی خطابات کی واپسی کا فیصلہ کرکے ان پبلک لائف بسر کرنے والے انسانوں کے چہرے سے مکاری کا نقاب نوچنے کی عدیم المثال جرأت کی ہے - پنجابی برادری میں بھی چند خطاب یافتہ لوگ موجود ہیں لیکن پنجابی نوجوانوں کی بے حسی کے پیشِ نظر میری دانست میں وہ لوگ اپنے خطابات واپس کرنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوں گے - میں نہیں چاہتا تھا کہ اس موضوع پر کچھ لکھا جائے لیکن ہندوستان کے ہر گوشے سے جہاں پنجابی برادری کے افراد آباد ہیں ادارہ کے نام ان گنت خطوط اس مقصد کے لئے آئے ہیں کہ ادارہ اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرے میں ان خطوط میں سے ایک خط یہاں نقل کرتا ہوں تاکہ برادری کے ان اکابرین کو جن کے دل آج بھی برادری کے عوام کے تاثرات سے واقف ہیں باقاعدہ آگاہی ہو جائے -

بخدمت گرامی ایڈیٹر صاحب

اسلام علیکم - آج برادری کے ہر شعبۂ زندگی پر خطاب یافتہ بزرگوں کا قبضہ ہے لیکن مسلم لیگ کے فیصلے کے بعد میری دانست میں

ﻟہ پنجابی برادری کے افراد نے جس طرح کلکتہ میں عوام کی مدد کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے اور بے گور و کفن لاشوں کو اٹھانے میں بیگم عبدالرزاق نے جس انہماک کا اظہار کیا ہے وہ ان کے بلند کیریکٹر اور بے پناہ جذبۂ خلق کا شاہد ہے ایسی خاتون واقعی پنجابی برادری کے لئے باعثِ ناز و افتخار رہے اور ہمیں فخر ہے کہ اس وقت بھی جب کہ پنجابی برادری کے طبقۂ نسواں میں تعلیم کم ہے - برادری نے ایسی نیک خاتون کو جنم دیا - منظور

صرف وہی لوگ خطابات چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوں گے جن کا مقصدِ حیات برٹش شہنشاہیت کی خوشنودی ہے میں سمجھتی ہوں کہ برادری کے اس طبقے میں اخلاقی جرأت موجود نہیں ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ایسے لوگوں کو جو کاروباری بہانے اور اولاد کے مستقبل کی آڑ لے کر ملت کے اس فیصلے کو ٹھکرا دیں۔ یہ قدم اٹھانے پر مجبور نہ کریں بلکہ جس طرح ممکن ہو ان کی پبلک لائف ختم کر دیں اور تمام ادارے (خصوصاً برادری سے متعلق) جن کی بدولت آج انہوں نے گورنمنٹ کے علاوہ سادہ دل لوگوں کو عقیدت مند بنایا ہے ان کے لئے بند کر دئے جائیں

آج نہیں تو کل ہمیں ان ذمہ داریوں کو اٹھانا ہے کیوں نہ ہم آج پنجابی برادری کی عزت کے تحفظ کے لئے آگے بڑھیں۔[1]

خیر طلب فریدہ عارف

بقیہ اشارات

اتنی بڑی دنیا میں اپنا ساتھی کہ اس کی زندگی بے کیف اور ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہی تو ہے جسے کھلی ہواؤں کے تھپیڑوں کے درمیان جلا کر رکھ دیا گیا ہو۔ قسمت میں ایک ساتھی عطا کرتی ہے، دکھ سکھ کا ساتھی شادی و غمی کا شریک، رفیقِ زندگی، مونس غمخوار — ہمدرد اور دوست، ناکامیوں میں ہمت بڑھانے والا، الجھ کر گر پڑنے پر سہارا دینے والا، آنسو پونچھنے والا۔ تھپکنے والا۔ دلاسا دینے والا، اپنے ساتھی کی سچی قدر کیجئے، اس کو سر آنکھوں پر بٹھائیے، دل میں جگہ دیجئے۔ دیکھو آپ کا کوئی راز اس کے لئے اور اس کی کوئی بات آپ کے لئے بھید نہ رہنے پائے۔ آپ دونوں عہد کیجئے کہ ساتھ جئیں گے اور سنگ سنگ مریں گے۔ اس طرح آپ میں ایک نئی قوت پیدا ہو جائے گی۔ اور اب ہاتھوں میں ہاتھ دے کر زندگی کی شاہراہ پر بڑھیئے۔ راہ کے کانٹے بھی پھول بن جائیں گے۔

آمدہ شمارہ

بلحاظ مضامین ایک خاص اہمیت کا حامل ہو گا اس شمارہ کیلئے پنجابی برادری کے پانچ افراد عمر الٰہی سلطان احمد۔ منظور احمد۔ مونس شبیر۔ اور مسرت کلام

(پنجابی برادری کے نقائص اور ان کا حل)

کے عنوان پر مفصل مضامین لکھ رہے ہیں۔

- ادارہ کی جانب سے اول مضمون کے لئے مبلغ پچیس ۲۵ روپے اور دوسرے مضمون کے لئے مبلغ پندرہ ۱۵ روپیہ کی کتابیں پیش کی جائیں گی۔

منصف کے فرائض انجمن وکیل قوم کے صدر اعلیٰ جناب شیخ محمد صدیق صاحب ملتانی کو تفویض کئے گئے ہیں

(منیجر)

---

[1] خط کا متعلقہ حصہ نقل کیا گیا ہے (منظور)

سلطان احمد

اشارہ

ہمارے ماحول میں روز کتنے ہی گھر بستے ہیں اور اجڑتے ہیں۔ شادیاں ہوتی ہیں اور بدمزگی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔ نکاح پڑھے جاتے ہیں اور فسخ ہو جاتے ہیں اور اس قدر خاموشی کے ساتھ، جیسے یہ بھی ایک روزمرہ کا کاروبار ہو۔

اخبار اٹھا کر دیکھئے اس قسم کے واقعات سے پُر نظر آئیں گے — گلوں میں رسّی کے پھندے ڈال ڈال کر، زہر کے پیالے ہونٹوں سے لگا کر اور ریل کی پٹریوں پر لیٹ کر روز بیسیوں مایوس نوجوان ہنسی خوشی موت کو گلے لگاتے ہیں، گھر کی چہار دیواریوں میں گھٹ گھٹ کر، سسک سسک کر اور خون تھوک تھوک کر روز بیسیوں نامراد لڑکیاں زندگی کو خیرباد کہہ دیتی ہیں — آخر کیوں؟ — کیا زندگی اتنی سستی اور غیر ضروری چیز ہے؟ — نہیں۔ عدالت کی مسلیں، نان و نفقہ کے دعووں اور طلاق کے فیصلوں سے اٹی پڑی ہیں۔ کیا یہ سب دعوے جھوٹ ہیں؟ — نہیں! دراصل ان تمام واقعات کے پس پشت گھروں کی بدمزگیاں اور ناچاقیاں کام کرتی ہیں جو گھروں کو جہنم اور زندگیوں کو عذاب بنا دیتی ہیں اور انہیں روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر جذباتی لڑکے اور لڑکیاں اپنی زندگیاں خود اپنے ہاتھوں ختم کر لیتی ہیں۔ ہمارے گھروں کی بنیادیں ریت کی دیواروں پر قائم ہوتی ہیں۔ ہوا کے دو ہی تھپیڑوں سے یہ کچے گھروندے دھم دھم کرتے زمین پر آ رہتے ہیں۔ ان سے زیادہ پائیدار تو چڑیوں کے گھونسلے ہی ہوتے ہیں تنکوں اور گھاس کا ایک مٹھی ڈھیر — مگر کیا پُرامن —!

شادی ہوئی — ایک عورت اور ایک مرد — ایک دوسرے کے لئے اجنبی اور بے جانے بوجھے۔ کچھ دن تو جیسے تیسے چلتا ہے مگر جوں جوں شرم کھلتی جاتی ہے طبیعتوں کے فرق رنگ لانے لگتے ہیں۔ معمولی معمولی باتیں بڑے بڑے جھگڑوں کی صورت اختیار کرنے لگ جاتی ہیں اور ایک دن آتا ہے جب کہ وہ دونوں محسوس کرتے ہیں کہ اب ان کے لئے دو ہی صورتیں باقی رہ گئی ہیں — طلاق — یا خودکشی!
آہ ایک پُرمسرت ابتدا کا کیا حسرتناک انجام!

دراصل اس کا سبب طریقۂ فکر ہے جو ہم اس باب میں اختیار کرتے ہیں۔ ہمارے دماغوں میں ایک دوسرے کے متعلق کچھ عجیب سے خیالات ہوتے ہیں۔ مرد کو سمجھایا جاتا ہے کہ بیوی صرف اس لئے ہوتی ہے کہ وہ تمہاری نفسانی خواہشات پوری کرے اور تمہارے لئے بچے جنے — عورت کو بتایا جاتا ہے کہ شوہر کا کام کمانا ہے اور انہیں کھلانا ہے اور بس —! آپ ہی بتائیے کہ یہ دونوں جب اس سے آگے سوچ ہی نہ پائیں گے تو ان سے کیا نیک توقعات کی جا سکتی ہیں؟ اگر ان سماجی برائیوں کا سدباب کرنا ہے تو ہمیں اپنے بچوں اور آئندہ نسلوں کے طریقۂ فکر کو بدلنا ہوگا۔ ان کو سمجھانا ہوگا کہ عورت اور مرد کا تعلق صرف جنسی ہی نہیں قلبی اور روحانی بھی ہونا چاہئے۔

یہ دنیا بہت وسیع ہے اور بڑی پُرپیچ۔ یہاں انسان پر طرح طرح کی کیفیتیں گزرتی ہیں، خوشی، رنج، دکھ، سکھ، کامیابی، ناامیدی، آنسو، قہقہے، ٹھوکریں، بھوک، خودداری، زندگی اور موت —! یوں تو انسان اکیلا آیا ہے اور تنہا ہی جائے گا مگر

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

انجمن وکیل قوم پنجابیان دہلی

دہلی کی پنجابی برادری کی وہ سب سے بڑی تنظیم ہے جو اپنے آغاز قیام (۱۹۰۶ء) سے قوم کی غریب لاوارث اور ضعیف خواتین اور بے روزگار مردوں کی ہزاروں روپیہ سالانہ کی صورت میں امداد و اعانت اور قوم کے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اصلاحی جدوجہد کرتی رہی ہے۔ انجمن کے زیر اہتمام قومی قبرستان کا نظام قائم ہے۔ جہاں قومی افراد کو ہر قسم کی سہولیت اور غریب افراد قوم کو مفت آسانیاں فراہم کی جاتی رہی ہیں۔ اس قومی مجلس نے ۱۹۰۷ء میں قوم سے جہالت دور کرنے کا عزم کیا۔ اور "**پنجابی اسکول**" کے نام سے ایک ابتدائی مدرسہ کی بنیاد ڈالی جس نے گذشتہ برسوں میں مڈل اور پھر ہائر سکنڈری اسکول کے درجات تک ترقی کی اور جو آج اپنی دو لاکھ روپے سے زیادہ کی شاندار عمارت، میں سرگرم عمل ہے۔ اس اسکول اس کی شاخوں اور انجمن کے جدید بنا کردہ پنجابی گرل اسکول میں اس وقت ایک ہزار لڑکے اور لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔ انجمن نہ صرف ابتدائی درجات سے ہائر سیکنڈری تک قوم کی غیر مستطیع طلباء اور قومی بچیوں کے ابتدائی مدرسہ کی غیر مستطیع طالبات کی تعلیم اور کتب درسیہ کی صورت میں امداد کرتی رہی ہے بلکہ انجمن کے مقاصد میں فارغ التحصیل طلباء قوم کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں ان کی اعانت بھی داخل ہے اور انجمن نے بیشتر ہونہاران قوم کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور وہ آج ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ انجمن وکیل قوم پنجابیان صرف اپنے شعبہ تعلیم پر آج ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ خرچ کر رہی ہے۔

عمر الٰہی

حکیم الامت

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

ابلیس

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں!
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں!
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے مفلس کو دیا سرمایہ داری کا جنوں
کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں؟

پہلا مشیر

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ "قوالی" سے کچھ کمتر نہیں "علمِ کلام"
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!
کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید
"ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام"

دوسرا مشیر

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

پہلا مشیر

ہوں مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کاروبار شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجود میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

تیسرا مشیر

روح سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب؟
وہ کلیم بے تجلی! وہ مسیح بے صلیب!
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب!
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب

کارل مارکس کی کتاب سرمایہ (داس کیپٹل)

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

چوتھا مشیر

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ
آل سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب
کون بحر روم کی موجوں سے ہے لپٹا ہوا
گاہ بالد چوں صنوبر گاہ نالد چوں رباب

تیسرا مشیر

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں
جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب

پانچواں مشیر (ابلیس کو مخاطب کرکے)

اے ترے سوز نفس سے کار عالم استوار
تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار
آب و گل تیری حرارت سے جہان سوز و ساز
ابلہ جنت تری تعلیم سے دانائے کار
تجھ سے بڑھ کر فطرت آدم کا وہ محرم نہیں
سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار
کام تھا جن کا فقط تقدیس و تسبیح و طواف
تیری غیرت سے ابد تک سرنگون و شرمسار

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام
اب مجھے ان کی فراست پہ نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر وہ روحِ مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روزگار !
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے ایک مشت غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس (اپنے مشیروں سے)

ہے میرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسمانِ تو بتو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق
میں نے جب گرما دیا اقوام یورپ کا لہو !
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو
کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ مو
ہے اگر مجھ کو کوئی خطرہ تو اس امت سے ہے
جن کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

۲

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

۳

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات!

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات؟

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

فرار

منظور احمد

ڈھونڈتا ہے
انسان کی وسعتیں ہیں بے کراں
لرزاں لرزاں، ترساں ترساں اور پھر انجام کیا؟"
عشق کو انجام سے نسبت نہیں
ہے یہ اس سے ماورا
یہ گروہ فلسفہ یہ رہنما
زندگی کے راز سربستہ کو حل کرتے نہیں
سوچتے ہیں بے کراں
تاکہ جا پہنچیں کسی انجام تک
سوچنے کی ہم کو اب فرصت کہاں
چل پڑے ایک راہ پر
رک نہیں سکتے پلٹ سکتے نہیں
یہ ہے عزم آخری
آرزوؤں اور امیدوں کا ملاپ
رشتہ نازک سہی پائندہ ہے
انجم مایوس آنسو پونچھ دے
کیوں ہے اتنی بے قرار؟"
"اپنی منزل پر پہنچنا ایکدم ممکن نہیں"
لیکن منزل ایکدم آتی ہے کب
انجم بے باک کیوں ہے اسقدر سہمی ہوئی
یہ نظام دہر یہ ذاتی قیود
ایک زمانہ تھا کہ جس کے ہیں نقوش
بے بسی جمہور کا انعام تھی
آج پھر انسانیت کو ہے فروغ
طلب حق کی آرزو ہے ناشکیب
پھر بھی ہے تو اسقدر سہمی ہوئی
بے یقینی عقل کا انجام ہے۔

خاص نمبر ماہنامہ پنجاب گزٹ ۱۹۵۱ء

بزم انجم ...

بچوں کے دانتوں کی تکلیف یا دستوں کو

دور کرنے کے علاوہ

ایبن کا

گلوکوز واٹر

"لو اور پیاس"

میں بچوں کے لئے بیحد مفید ہے

شائع کنندگان :- ایبین فارمیسی ٹیکلز مینوفیکچرنگ کیمسٹس - انبالہ

جعفری

دفتر کے ملازم کا ترانہ

رہنے کو گو نہیں ہے لاہور میں سہارا ۔۔۔ چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
رہتے ہیں اس مکاں میں چھت جس کی آسماں ہے ۔۔۔ خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
دفتر دیا ہے ہم کو چھین اور جھپٹ کر الیا ۔۔۔ ہم پاسباں ہیں اس کے وہ پاسباں ہمارا
جن کو مکاں ملے تھے کہتے تھے اُن سے جو ہے ۔۔۔ آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

منظور

تبدیلی

(۱)

شاعر کا تخیل نہیں پابندِ سلاسل ۔۔۔ ادراک کا طائر کہیں آتا ہے تہِ دام
ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی ۔۔۔ تبدیلی افکار زمانہ کا رہا کام

۲

رنگینی گل و عارض بھی ہم نے دیکھی ہے ۔۔۔ کسی کا خونِ تمنا شفق میں ہے مستور
جراحت دلِ مفلس کا اندمال عجب ۔۔۔ نظام دولت و حشمت کا یہ نہیں دستور

دہلی کی پنجابی ڈرامی

مختصر تاریخ

از

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

خاص نمبر ماہنامہ پنجابی گزٹ سنہ ۱۹۴۶ عیسوی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے (علیگ) استاد معاشیات
جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں
آباد مختلف برادریوں کے حالات قلمبند فرما رہے ہیں اور اسی
عنوان پر ایک کتاب مرتب فرمانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔
گذشتہ دو سال سے ہر ماہ رسالہ جامعہ میں اسی عنوان پر مضامین
طبع ہوتے رہے ہیں اور تقریباً دو درجن برادریوں کے حالات
شائع ہو چکے ہیں۔ یہ سلسلہ رسالہ جامعہ میں برابر جاری ہے۔ ہم
انتہائی شکر گذار ہیں کہ پروفیسر محمد عاقل نے ہماری درخواست پر
"دھلی کی پنجابی برادری" کے عنوان پر اپنا بلند پایہ مقالہ ہمیں شائع
کرنے کی اجازت دی۔

(منظور احمد)

برادری کی تاریخ

اس برادری کے بارے میں مقررہ سوال نامے کے مطابق عمر الٰہی صاحب جاتمی اور ان کے چھوٹے بھائی محمد عبدالالٰہی صاحب جاتمی کے ذریعہ حالات معلوم کئے گئے - یہ دونوں بھائی صدر بازار میں فضل الٰہی محبوب الٰہی سوت والوں کی دوکان اور یو. اسے فلمینتن اینڈ کمپنی کے سوت گولے کے کارخانے کو نہایت کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں - پنجابی برادری کی سب سے بڑی تنظیم انجمن وکیل قوم پنجابیان کے نہایت سرگرم عہدہ دار ہیں - یہ جائزہ اپریل ۱۹۵۸ء میں لیا گیا تھا اور ۱۹۶۰ء میں اس پر نظرثانی کی گئی تھی -

(اے) برادری کی تاریخ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس برادری کے لوگ وسطی پنجاب میں خوشاب کے مقام پر آباد تھے تجارت ان کا پیشہ تھا یہ ہندو تھے اور اروڑہ کھتری کہلاتے تھے - چاولے "نہلیچے" "مہندی رتے" کے ناموں سے دلی کی پنجابی برادری میں بہت سے خاندان معروف ہیں - خوشاب کے "اروڑے کھتری" آج بھی ان گوتوں (اور ناموں) سے موسوم ہیں - آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں آج سے چھ سو سال قبل تقریباً تین سو زن و مرد اور بچے گنگا اشنان کے ارادے سے یہاں آئے اور حضرت شاہ نصیر الدین "روشن چراغ دلی" کے خلیفہ سوم حضرت شاہ شمس الدین رحمۃ علیہ کے دست مبارک پر مشرف باسلام ہوئے - حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد دہلی ہی میں مستقلاً آباد ہو گئے اور اس تاریخی شہر کو اپنا مرکز بنا کر دہلی میں اور بیرون دلی سے تجارت کرنے لگے -

(بی) لیکن برادری کی کسی مستند تاریخ کا پتہ نہیں چلتا - نہ اس کی تحقیقات ہمارا اصل موضوع ہے - ہمارے لئے اس قدر کہنا کافی ہے کہ یہ ایک نومسلم برادری ہے اور مذہب اسلام کے ساتھ دلی تعلق رکھتی ہے اور اس کی بقا اور ترقی کے لئے برابر کوشش کرتی رہتی ہے

ہندوستان کے مختلف شہروں میں آبادی کی تقسیم

اس برادری کے افراد سب سے زیادہ دہلی میں ہیں اس کے بعد دوسرا مرکز کلکتہ ہے جہاں زیادہ تر دہلی ہی کے لوگ تجارت کرنے گئے ہوئے ہیں - دوسرے صوبوں میں زیادہ تر آبادی یوپی میں ہے - جہاں یہ لوگ میرٹھ، بریلی، مراد آباد، ہاپوڑ، امروہہ، سہارنپور، آگرہ، بنارس، علیگڑھ، کانپور اور لکھنؤ میں ہیں، آنولہ میں بھی بڑے بڑے لوگ ہیں پنجاب میں انبالہ اور لدھیانہ میں ہیں جہاں رہتے ہیں وہیں کے پنجابیوں سے تعلقات ہوتے ہیں - البتہ دہلی والوں کا ہاپوڑ اور میرٹھ کے لوگوں سے تعلق ہے -

دہلی کے مختلف محلوں میں تقسیم

دہلی میں ان کی کل آبادی تقریباً پندرہ ہزار ہے - کچھ محلے پورے کے پورے ان کے ہیں اور کچھ میں ان کی اکثریت ہے - غدر سے پہلے نہلوں والی گلی اموری گیٹ میں رہتے تھے وہیں سے بعد میں ساری دہلی میں پھیل گئے جو محلے سارے کے سارے ان کے ہیں وہ یہ ہیں:-

ا- پھاٹک حبش خاں (۲) حویلی حسام الدین حیدر (۳) احاطہ کالے صاحب (۴) محلہ کشن گنج (۵) باغیچی اچھے جی - پھاٹک حبش خاں میں ان کے حسب ذیل ذیلی محلے ہیں -

(الف) گلی ہیجڑا بیگ (ب) دھوبیوں کا کٹرہ (ج) رنگ محل (د) طوطا مینہ (ک) بارہ دری (ل) چھتہ عبدالرزاق

(م) چمن والا کلاں و خورد (ن) گلی تنگ والی ۔ گلی محمد ذکریا (ق) گلی ابلی والی (ر) گلی باقر والی (ی)، گلی کارخانہ والی ۔

جن محلوں میں ان کی اکثریت ہے وہ یہ ہیں ۔ ۱۔ شیش محل (۲) نواب گنج ۳ نیا محلہ ۴ بیری والا باغ ۵ باڑہ ہندوراؤ ۔ ۶ فیض گنج ۷ عزیز گنج ۔

باڑہ ہندوراؤ میں ان کے حسب ذیل محلے ہیں۔ (الف) باغیچی الشہری پرشاد (ب) پکی گلی (ج) کوٹھی میم (د) ممبئی مل کا احاطہ کدارہ ۔

ان سب محلوں میں جن مکانات میں رہتے ہیں وہ یا تو اپنی ذاتی ملکیت ہیں یا اپنے کسی دوسرے بھائی کے ہیں اور یہ کرایہ پر رہتے ہیں کسی غیر برادری کے مکان میں غالباً کوئی نہیں رہتا ۔ عقیدہ کے لحاظ سے زیادہ تر حنفی مسلمان ہیں ۔ کچھ اہل حدیث بھی ہیں

پیشے اور کام

یہ تجارت پیشہ قوم ہے اور شروع زمانے سے تجارت کرتی چلی آرہی ہے ۔ اب ان کے یہاں ڈاکٹر بھی ہوگئے ہیں ۔ وکیل بھی ہیں ۔ گورنمنٹ سروس میں بھی آگئے ہیں لیکن آئی سی ۔ ایس اور پی سی ایس میں ابھی تک کوئی نہیں ہے ۔ دہلی ایڈمنسٹریٹیو سروس میں بھی تھے لیکن اب ریٹائر ہوگئے ہیں ۔ سکریٹریٹ میں سپرنٹنڈنٹ دونوں سروسوں میں ہیں ۔ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں بھی ہیں اور میونسپلٹی میں بھی ۔ جائداد کی آمدنی پر بھی بہت سے لوگ گذر کرتے ہیں ۔ کچھ لوگ فوج میں بھی ممتاز عہدوں پر ہیں ۔

تجارت کے کام میں لوگ حسب ذیل طریقہ پر لگے ہوئے ہیں ۔

(۱) **بساط خانے کے کام میں** :۔ اس میں کنگھی، کنگھا، ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ پاؤڈر، ٹوتھ برش، چاقو، تالہ، اسٹیشنری، خوشبوئیں، ویسلین کریم، سنگار کا دوسرا سامان، تاش، شیونگ کا سامان، بلیڈز، ہر قسم کے بٹن، ریل، سوئی، کروشیا، نٹنگ کی سلائیاں شامل ہیں ۔ ان کے علاوہ جو چیز بھی فروخت کے قابل مل جائے اسے بیچنا شروع کر دیتے ہیں ۔ دہلی میں بساط خانے کا جتنا کام ہوتا ہے اس کا پچہتر فی صدی حصہ اس برادری کے لوگوں کے ہاتھ میں ہے ۔ اس سے پہلے سو فی صدی کام اس برادری کے ہاتھ میں تھا لیکن اب ہندوؤں اور دوسری برادریوں کے لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے ۔

(۲) **ہوزری کے کام میں** :۔ اس میں موزہ بنیان، رومال، دستانے، اور جرسیاں شامل ہیں ۔ یہ کام پچیس فی صدی اس برادری کے پاس ہے ۔ سوائے ایک ہوزری نٹنگ مل کے باقی تمام کارخانے چونکہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں اس لئے وہ اپنی ایجنسیاں ہندو دوکانداروں کو دیتے ہیں یا خود قائم کر لیتے ہیں اس کے باوجود دکانیں پچاس فی صدی مسلمانوں کی ہیں لیکن اس تجارت میں ان کا تناسب بصورت مجموعی پچیس فی صدی ہی سمجھنا چاہیئے ۔ پہلے جب مال جاپان سے آتا تھا تو اس برادری کے لوگوں کا تناسب اس تجارت میں پچھتر فی صدی کے قریب تھا ۔

گلاس اور چینی کے کام میں :۔ اس میں شیشہ، چینی، تمام چینی کے برتن، چمچے، کانٹے، چھری، لالٹین، اسپورٹ لیمپ اسٹوو، آئس کریم کی مشین اور دوسری گھریلو مشینیں شامل ہیں، یہ کام سو فی صدی اسی برادری کے ہاتھ میں ہے اگرچہ دیسی مال کے کارخانے ہندوؤں کے ہیں ۔ البتہ ایک کارخانہ نیشنل اینمل کے نام سے اسی برادری کے ہاتھ میں ہے ۔

۴۔ **خوراکی کام کے سامان میں** :۔ اس میں بسکٹ، ٹافی، چائے، چاکلیٹ، مکھن، جام، پنیر، ڈبوں کے فروٹ، مچھلی، سگریٹ

وغیرہ شامل ہیں، یہ کام ۹۰ فی صدی اس برادری کے ہاتھ میں ہے۔ کشمیری دروازے اور کناری بازار کے ہندو دکاندار بھی بیچنے والی چیزیں صد سے تجار ہی سے لیتے ہیں۔ یہ کام پہلے بھی ۹۰ فی صدی اسی برادری کے ہاتھ میں تھا۔ ایک فیکٹری پیراڈائز بسکٹ فیکٹری کے نام سے برادری کے ایک شخص کی ہے اور کاٹیج انڈسٹری کے طور پر جام جیلی وغیرہ کے بہت سے کارخانے ہیں۔

۵۔ سوت گولے کے کام میں:۔ یعنی سوت کا ریل اور بکسوا جو سلائی کی مشین وغیرہ میں کام آتا ہے اسی میں سرکنڈہ کیا ہوا کرہ سائی بنائی کا گولا بھی شامل ہے، یہ کام اس برادری کے پاس ۹۰ فی صدی ہے، اس کام کے بارے میں ایک نہایت اچھا مضمون "دہلی کی سوت گولے کی صنعت" کے عنوان سے ماہنامہ پنجابی گزٹ دہلی بابت نومبر ۱۹۶۵ء میں محمد عمر الٰہی صاحب نے اپنی ذاتی واقفیت تجربہ اور تحقیقات کی بنا پر شائع کیا ہے، اس مضمون میں انہوں نے بتلایا ہے کہ سوت کا گولہ پہلے انگلستان سے آیا کرتا تھا۔ ہندوستان میں سوت گولا بنانے کا کام سب سے پہلے بیسویں صدی کے آغاز میں دہلی کی پنجابی مسلمان برادری نے شروع کیا اور جنگ عظیم اول کے زمانے میں اس کام سے انہوں نے خوب نفع حاصل کیا۔ بعد میں ہندو برادران وطن بھی اس صنعت میں شریک ہو گئے لیکن ابھی تک اس کا ۹۰ فی صدی کام پنجابی برادری ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کام ابتدا میں کاٹیج انڈسٹری کے طور پر شروع کیا گیا تھا لیکن جنگ عظیم اول کے بعد سے اس نے اچھے خاصے کارخانوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ پہلے دہلی کے کارخانے والے موٹا سوت ہندوستان سے اور باریک سوت انگلستان سے حاصل کیا کرتے تھے لیکن ۱۹۳۰ء میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کی مشترکہ ملکیت میں کوہ نور مل بمبئی کے قائم ہو جانے کے بعد باریک سوت بھی ہندوستان ہی سے حاصل کیا جانے لگا۔

عمر الٰہی صاحب کا بیان ہے کہ "انگلستان کے سوت گولے ریل بکسوا بنانے والے کارخانوں کو جب ہندوستان کی مارکیٹ میں شکست ہوئی تو انہوں نے ایک منظم اسکیم کے مطابق ۱۹۳۶ء میں دہلی اور بمبئی میں اپنے دو کارخانے جمنا تھریڈ مل کے نام سے قائم کئے اور ان میں وہی اقسام بنانی شروع کیں جو دہلی کے کارخانے بنا رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کارخانوں کے لئے چودہ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا تھا جب کہ دہلی کے تمام چھوٹے بڑے کارخانوں کا کام میں لگنے والا سرمایہ (ورکنگ کیپٹل) قبل از جنگ بمشکل اس کے برابر تھا۔ لیکن چونکہ اس انگلستانی کارخانے کا قیام ایک انتہائی انتشار کے دور میں ہوا تھا اس لئے دہلی کی صنعت پر یہ ابتدا میں اثر انداز نہ ہو سکا"۔

"۱۹۳۹ء کی جنگ عظیم ثانی نہ صرف دہلی کے بڑے بلکہ گرتے ہوئے متوسط درجے کے کارخانوں کے لئے امید افزا زندگی کا پیغام لے کر آئی سوت کی سپلائی کے سب سے بڑے مرکز کوہ نور مل کے مال کا بیشتر حصہ جنگی ضروریات کے لئے مخصوص ہو گیا، سوت بمشکل اور کمی کے ساتھ دستیاب ہونے لگا۔ اس کمی کے سبب مسلسل قیمتیں بڑھ گئیں۔ کمیابی کے اس دور میں جمنا تھریڈ مل کے انگریزی کارخانے نے جس کی شاخیں دہلی اور بمبئی میں قائم تھیں خوب ہاتھ پیر پھیلائے اور اپنے خاص اثر و رسوخ سے کوہ نور مل سے زیادہ سے زیادہ سہولت حاصل کی۔ سنا ہے کہ بمبئی کے ایک دوسرے مل کو بھی اپنے سرمایہ کی قوت پر اپنے لئے اچھی قسم کا سوت بنانے کے لئے تیار کیا اور اپنے کارخانے کی پیداوار بڑھاتا چلا گیا۔ دہلی کے سوت گولے کے کارخانے دار اس بات پر مگن رہے کہ ان کی پیداوار کم ہو رہی ہے تو پرواہ نہیں نفع تو کافی ہو رہا ہے۔ اس غفلت سے اس انگریزی کارخانے نے بڑا فائدہ اٹھایا اور نسبتاً ان سے کچھ کم نرخ پر ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی منڈی میں اپنا مال بھیجتا اور جڑ پکڑتا رہا۔ اس عرصے میں ایمپی تھریڈ مل لمٹیڈ کے نام سے بمبئی میں ایک اور انگریزی کارخانہ قائم ہوا اور ۱۹۴۲ء سے

خاص نمبر ماہنامہ پنجابی گزٹ ۱۹۶۶ء

خود کوہ نور مل نے سوت کے ٹیوب ریل بنانے شروع کر دیئے ہیں۔
سوت گولے کی صنعت میں ان نئے اور خطرناک حریفوں کے داخلے کی طرف توجہ دلانے کے بعد عمرالٰہی صاحب نے اپیل کی ہے کہ "آج دہلی کے بکھرے ہوئے سوت گولے کے چھوٹے بڑے کارخانوں کو اپنی حالت کا جائزہ لینا اور آئندہ کی شکل کے لئے ان کمپنی ۔ کرنڈ ٹیکسٹائل ٹریڈرز، ایکمی ٹریڈیل اور کوہ نور جیسے اداروں سے مقابلہ کے متعلق نہ صرف غور کرنا بلکہ تیار ہونا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس معاملہ میں آج ہماری غفلت نہ صرف دہلی کی مرکزیت، ہندوستان کے قومی سرمایہ بلکہ ہماری انفرادیت تک کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جنگ کے بعد سوت گولے کی صنعت چند ہزار روپے سے زیادہ قائم نہیں رکھی جا سکتی ۔ اس کے لئے مشترکہ سرمایہ سے بڑے بڑے ادارے قائم کرنے کی ضرورت ہے ۔
آج کی صنعت اور آج کی تجارت سیاسی دماغ اور سیاسی چالوں سے قائم رکھی جا سکتی ہے۔ سوت گولے کی صنعت میں منڈیوں کی جنگ شروع ہو چکی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آج ہم کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ سوت والوں کو ایک ایک کر کے فنا کے گھاٹ اترنا ہے یا متحد ہو کر مشترکہ سرمایہ سے اپنی صنعت و تجارت کو برقرار رکھنا ہے"۔
غرض عمرالٰہی صاحب کے مندرجہ بالا بیان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہر چند موجودہ جنگ کے زمانے میں سوت گولے کے کام سے پنجابی برادری کے لوگوں نے خوب نفع کمایا ہے اور ابھی تک ان کا حصہ اس کام میں پچھتر فی صدی کے قریب ہے لیکن آئندہ کے لئے کچھ ایسے خطرناک حریف پیدا ہو گئے ہیں جن کی طرف سے ڈر ہے کہ اگر یہ کام حسب سابق کم سرمایہ سے بکھرے ہوئے طریقہ پر جاری رکھا گیا تو کہیں اس برادری کے لوگوں کو مقابلہ میں ناکام نہ ہونا پڑے ۔
۶۔ الیکٹرک گڈز اور ٹارچ کا کام :- اس برادری کے پاس دس فی صدی ہے ۔
۷۔ کھلونے کا کام :- اس برادری کے پاس ساٹھ فی صدی ہے ۔
۸۔ ٹاٹا کے کارخانے کی بنی ہوئی بٹن کی پلیٹس کے سول ایجنٹ اسی برادری کے ایک صاحب ہیں۔
۹۔ فیتے، چین، اور ربن :- تیار کرنے اور ان کے اور بیلوں کے فروخت کرنے کا ستر فی صدی کام اسی برادری کے ہاتھ میں ہے
۱۰۔ سائیکل کا کام :- پندرہ فی صدی اسی برادری کے ہاتھ میں ہے ۔
۱۱۔ لوہے اور پیتل کا کام :- پانچ فی صدی اسی برادری کے ہاتھ میں ہے ۔
۱۲۔ ٹائل، پائپ، سینیٹری گڈز، باتھ روم کا سامان اور گلاس :- چالیس فی صدی کام اسی برادری کے ہاتھ میں ہے۔
۱۳۔ پینٹ اور وارنش کا کام :- پچاس فی صدی کام اسی برادری کے ہاتھ میں ہے۔
۱۴۔ چمڑے کا :- دس فی صدی کام۔
۱۵۔ چھاپہ خانے کا :- دو فی صدی کام
۱۶۔ امیونیشن کا :- پچھتر فی صدی کام۔
کپڑے، بنیان، فیتے اور چین کو برادری کے کچھ لوگ پھیری کر کے بھی بیچتے ہیں ان کے علاوہ تجارت کی دوسری لائنوں کو بھی آزما رہے ہیں۔ کچھ نے غلہ کا کام بھی چھوٹے پیمانے پر شروع کر رکھا ہے۔ کچھ نے بنیانوں کا کام ۔ حلوائی کا کام ۔ عمارتی لکڑی، لکڑی کی ٹالیں ۔

- فونڈری، دوائیں، پٹرول پمپ، جوتے کے کارخانے، گوٹے کے کارخانے، زردوزی کے کارخانے، مشین کی کڑھائی، کے کارخانے، ڈیری، لکڑی کا کام اور ہوٹل کا کام بھی شروع کر رکھا ہے۔ فلم ڈسٹری بیوٹرز کا کام بھی کچھ لوگوں نے کیا تھا اور اب بھی بعض حضرات اس لائن میں سرمایہ لگاتے رہتے ہیں۔

کل پندرہ ہزار آبادی میں سے اندازاً چار ہزار آدمی دوکانوں اور کارخانوں کے کام میں لگے ہوئے ہیں کچھ ہم قوم پنجابیوں کی دوکانوں اور کارخانوں میں شاپ اسسٹنٹ اور کلرک وغیرہ کی حیثیت سے ملازم ہیں۔ کچھ لوگ اپنے ہاتھ سے صابن، برش، پالش، پرفیومری، چمڑے کے بٹوے وغیرہ بنانے کا کام کرتے ہیں۔

پنجابی برادری کی کل چھ سو فرمیں ہیں جن میں سے تین سو کے قریب دوکانیں اور کارخانے صدر بازار میں ہیں اور تقریباً اتنے ہی دوسرے بازاروں میں ہیں۔ صدر بازار میں تین سو پنجابی فرموں کے علاوہ ڈھائی سو ہندو فرمیں اور ساٹھ ستر ایسی مسلم فرمیں ہیں جن کا تعلق پنجابی برادری سے نہیں ہے۔ لیکن یہ زیادہ تر چھوٹا کام کرتے ہیں۔ صرف کچھ ایسے ہیں جو تھوک کا بڑا کام کرتے ہیں۔

نوٹ :- یہ اعداد شمار ۱۹۴۴ء کے ہیں جب تحقیقات کی گئی تھی کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد سے ان فرموں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ تقریباً دوگنی ہو گئی ہیں۔ اسی نسبت سے اس ضمن کے دوسرے تمام اعداد کو بھی دوگنا کیا جا سکتا ہے۔

پنجابی برادری کے کارخانے :- پنجابی برادری کی مندرجہ بالا چھ سو فرموں میں سے تقریباً سو کارخانے ہیں۔ دہلی میں سوت گولے کے کل باون کارخانے ہیں جن میں سے ستیس کارخانے پنجابی قوم کے ہاتھ میں ہیں۔ دس صابن کے کارخانے بھی اس برادری کے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کے علاوہ نواڑ، لالٹین کی بتی، صابن ڈوری، فیتا، لیس، ہوزری اور کپڑے کے بھی کارخانے ہیں، ان میں سے بعض کی حیثیت فیکٹریوں کی سی ہے مثلاً صابن، لالٹین کی بتی، اور نواڑ کی فیکٹریاں ہیں جن میں سے ایک ایک میں پچاس سے اسی ہزار کے درمیان سرمایہ لگا ہوا ہے۔ تیس چالیس مزدور روزانہ کام کرتے ہیں۔ بجلی سے مشین چلتی ہے۔ پنجابی برادری کے ہاتھ میں لالٹین کی بتی کی تین فیکٹریاں ہیں اور نواڑ کی دو اور صابن کی ایک فیکٹری ایسی ہے جس میں صابن نواڑ، فیتہ تیار کیا جاتا ہے اور سوت پر گلیزنگ بھی کی جاتی ہے۔ یہ سوت پتنگ اڑانے کے کام میں آتا ہے ایک اور فیکٹری کا ملین لیس مل کے نام سے ہے۔ ایک ہوزری نٹنگ مل بھی ہے اور ایک پنجابی کلاتھ مل ہے جس کا کام پہلے چھوٹے پیمانہ پر تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ترقی کر رہا ہے اس میں صرف بنائی کا کام کیا جاتا ہے اور کرگھے چلانے کے لئے الکٹرک پاور استعمال کی جاتی ہے لیکن سوت باہر سے لیتے ہیں یا اور سوتی اور ریشمی ملا کر کپڑا تیار کرتے ہیں۔ کل چھوٹے بڑے کارخانے سوت کے کارخانوں کے علاوہ دس کے قریب ہیں جن میں دس سے پندرہ لاکھ کے درمیان مجموعی طور پر سرمایہ لگا ہوا ہے اس کے علاوہ بہت سے کارخانے چلائے جا رہے ہیں۔ مثلاً بٹن، تبدے، کٹرے، جھن جھنے گلٹ کے زیورات اور تالوں کے کارخانے، بیٹری کے ٹھیک کرنے اور دیسی بیٹری کے تیار کرنے کا کام بھی کیا جاتا ہے۔ پیتل اور لوہے کے سامان کے سرکاری ٹھیکے اور نجی کام کے ٹھیکے بھی لیتے ہیں اور کاریگروں سے جو اپنے گھر پر کام کرتے ہیں مال تیار کرا کر فراہم کرتے ہیں

دیگر پیشے :- برادری میں دو بیرسٹر اور دس بارہ وکیل ہیں۔ دس بارہ حکیم ہیں ایک ڈاکٹر ہے۔ الکٹرک ریڈیو اور گاڑی کے مستری سو کے قریب ہیں ایک ممتاز عہدے پر بھرتی کے آفیسر ہیں ایک فوج میں کنگز کمیشن آفیسر ہیں اور ایک پائیلٹ ہیں۔

دیگر شہروں میں برادری کے کارخانے :- سہارنپور میں :- دو ہوزری فیکٹریاں جو بڑے پیمانہ پر دیہاتی ضروریات کا مال بناتی ہیں

علیگڑھ میں :- تالے کے کارخانے۔

کلکتہ میں: تیل صاف کرنے کے کارخانے، ادویات کے دو بڑے کارخانے جس میں نہ صرف ادویات بلکہ فنائل کی گولیاں تیار ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک فرم کے مالک حاجی ممتاز الدین صاحب ہیں جو علم کیمیا سے غیر معمولی شغف رکھتے ہیں اور سماجی کاموں کے اور تعلیمی کاموں کے لئے فیاضی کے ساتھ روپیہ دیتے ہیں۔

برادری کا کام اور اس کی انجمنیں:- برادری کا نظام بہت اچھی طرح سے قائم ہے۔ صرف نصف فی صدی موقع ایسا ہوتا ہے کہ برادری کے باہر شادی ہوتی ہے ورنہ باہر شادی نہیں ہوتیں جن لڑکیوں کی شادی باہر ہو جاتی ہے تو ان کی اولاد برادری میں الگ طرح کی ہو جاتی ہے اور برادری کی انجمنوں سے ان کو کسی قسم کی امداد نہیں ملتی اور نہ برادری کے لوگ ان کے ساتھ کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ باہر سے لڑکی اگر اتفاق سے آ جاتی ہے تو وہ رفتہ رفتہ برادری میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بچوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا۔

برادری میں باہر شادی نہ کرنے کا رجحان صرف معاشی وجوہ سے ہے لیکن اس لئے کہ جائداد اور پیسہ برادری سے باہر نہ جائے ورنہ دوسرے تمام تعلقات اور معاملات میں کسی اور دوسری برادری کے لوگوں کو پنجابی برادری کے لوگ اپنے سے کمتر یا بہتر نہیں سمجھتے۔

برادری کی صرف ایک انجمن ہے یعنی انجمن وکیل قوم پنجابیان۔ یہ انجمن ان اوقاف کا انتظام کرتی ہے جو اس کی نگرانی میں دیئے جاتے ہیں۔ انجمن کے انتظام میں جو اوقاف ہیں اور انجمن کی خریدی ہوئی اور بنائی ہوئی جو جائداد ہے ان سب کی مالیت تقریباً [illegible] لاکھ روپیہ ہوتی ہے اور اس سے سالانہ مستقل آمدنی تقریباً بارہ ہزار روپے کی ہے۔ اس آمدنی سے مدرسے چلائے جاتے ہیں۔ امداد بیوگان کا کام کیا جاتا ہے اور قبرستان کا کام کیا جاتا ہے۔ یہ انتظام غیر مستطیع لوگوں کے لئے مفت کیا جاتا ہے۔ پنجابی اسکول سے جو میٹرک پاس کر کے جو پنجابی طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیں ان کو وظائف دیئے جاتے ہیں جن کے لئے پانچ سو روپے کی رقم مخصوص کر دی گئی ہے۔ اس فنڈ میں اس وقت کافی روپیہ جمع ہے جو لوگ صنعت کا کام شروع کرتے ہیں ان کی کمی سرمایہ سے امداد کی جاتی ہے اور اس کی صورت ابھی تک عطیہ کی رہی ہے شادی کے موقع پر غریب قوم کی لڑکیوں کو ضروریات شادی کے لئے امداد دی جاتی ہے۔ یہ انجمن [illegible]ء میں قائم کی گئی تھی۔ اور اس نے پنجابی اسکول کو [illegible]ء میں قائم کیا تھا۔

برادری سے خارج کرنے کا کام انجمن نہیں کرتی۔ نہ خاندانی جھگڑے انجمن طے کرتی ہے قوم کے بزرگ انفرادی طور پر ان جھگڑوں کا تصفیہ کر دیتے ہیں کوئی شخص اگر برادری سے باہر شادی کرتا ہے تو انجمن اس میں بحیثیت انجمن دخل نہیں دیتی اگر کوئی ایسا مسئلہ اٹھا جس کا برادری پر بحیثیت قوم اثر پڑتا ہو یا برادری کے تجارتی کاروبار پر اثر پڑتا ہو تو انجمن ارباب حکومت سے خط و کتابت کر کے یا غور کر کے قوم کے جذبات کی نمائندگی کرتی ہے۔

پیدائش شادی اور موت کے اندراجات کرنے کے لئے انجمن کی طرف سے تین رجسٹر رکھے جاتے ہیں ان اندراجات کو مکمل کرنے کے لئے منشی گھومتے ہیں۔ شادی کے لئے کوئی باقاعدہ قاضی نہیں ہوتے بلکہ جس مولوی سے عقیدت ہوتی ہے ان سے نکاح پڑھوا لیا جاتا ہے۔ مہر عام طور پر گیارہ سو روپے سے لے کر اکیاون سو روپے تک ہوتا ہے اور یہ موجل ہوتا ہے۔

اس بڑی انجمن کے علاوہ کچھ اور دوسری اصلاحی انجمنیں بھی تھیں مثلاً (۱) یوتھ لیگ جس کے ساتھ ماہنامہ پنجابی گزٹ منسلک ہے (۲) بزم ادب جس کے ساتھ پنجابی پبلک لائبریری منسلک ہے اور (۳) انجمن ضیاء الادب جس کے ساتھ نیشنل پبلک لائبریری منسلک ہے۔

(۱) پنجابی یوتھ لیگ:- [illegible]ء میں ان لغو اور فضول رسموں کی اصلاح کے لئے جو برادری میں خلاف شرع رائج تھیں اور جو گھن کی طرح برادری کے سرمایہ کو نقصان پہنچا رہی تھیں ایک انجمن [illegible]

خاص نمبر ماہنامہ پنجابی گزٹ [illegible]

سنہ۱۹۲۸ء میں اس لیگ کا کام بہت زور شور سے چلا لیکن سنہ۱۹۳۲ء میں یہ ختم ہوگئی اور اس کے بعد سے اس کا بڑا ابھی تک یوتھ لیگ کام کر رہا ہے۔ اس نے بہت سی رسومات کے سلسلے میں خرچ کی حد بندی کر رکھی ہے کہ اس سے زیادہ ان میں برادری کا کوئی رکن خرچ نہ کر سکتا۔

ذیل میں ان کی تفاصیل بیان کی گئی ہیں:۔

زیورمیں اسراف کو دور کرنے کے لئے سنہ۱۹۲۹ء میں اسی تولے سونا بیٹے والے اور ۶۰ تولے سونا بیٹی والے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ ایسے سات آٹھ جوڑوں کی جگہ جن کی لاگت ڈھائی ڈھائی سو پانچ پانچ سو فی جوڑے سے کم نہیں ہوتی تھی اور صرف دیکھنے کے لائق ہوتے تھے دو جوڑے کر دئے گئے تھے۔ اس کے بعد بھی برابر اصلاح ہوتی رہی۔ اور بہت سی رسمیں بند ہوتی رہیں۔

سنہ۱۹۳۱ء میں ان رسموں کے خلاف پورے طور پر کاروائی شروع کی گئی تھی پنجابی لیگ نے تین بنیادی باتیں پیش کی تھیں۔

(۱) زیور میں زیادہ سے زیادہ سونا بیٹے والا چالیس تولے بیٹی والا تیس تولے دے سکتا تھا۔

(۲) جوڑے ستر روپے کی لاگت کے دیئے جائیں اس حد کے اندر جتنے چاہے جوڑے دے سکتے ہیں۔

(۳) برات کا کھانا بند کر دیا گیا۔ یہ کھانا پوری برادری کو کھلایا جاتا تھا اور اس میں دو ہزار کے قریب خرچ ہو جایا کرتے تھے۔

پنجابی لیگ نے جو جرمانے وصول کئے ان کی رقم کو پنجابی اسکول کی بلڈنگ فنڈ کے لئے مخصوص کیا گیا۔ ان سختیوں کی وجہ سے بڑی عمر کے لوگ پنجابی لیگ کے مخالف ہوگئے۔ اور اس نے اس مخالفت کو برداشت نہ کر کے اپنا کام چھوڑ دیا۔

اس لیگ کے کارکن بڑی عمر کے لوگ تھے۔ ان سے جھگڑا کھانے کی مخالفت پر ہوا تھا جس میں عبدالسلام صاحب کو بھی ضربات آئی تھیں غرض اسی طرح پنجابی لیگ ٹوٹ گئی۔

اس کے بعد یوتھ لیگ نے جو نوجوانوں پر مشتمل تھی اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ یوتھ لیگ نے کھانے کی مکمل بندش پر تو زور نہیں دیا۔ البتہ یہ پابندی لگا دی کہ ساری برادری کو صلائے عام نہیں ہوگی۔ بلکہ جس کو دعوت دی جائے گی وہی لوگ دعوت میں آئیں گے

اب پانچ سو کھانا پکوایا جاتا ہے اور صرف ایک کھانا پکوایا جاتا ہے۔ پہلے دس دس قسم کے کھانے ہوتے تھے اور ساری برادری کے لوگ چاہے انہیں بلایا ہو یا نہ ہو آ جاتے تھے اور زیادہ کھانے میں باہمی مقابلہ ہوتا تھا۔

برادری کے نائی ڈوم برات کے کھانے کا اعلان کرتے تھے۔ برات کا کھانا دینے کے لئے اب ایک اور شرط لگا دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جو برات کو کھانا دے وہ پچاس روپے پنجابی اسکول کو چندہ بھی دے۔

زیور کے سلسلے میں یوتھ لیگ نے ۳۰ تولے سونا بیٹے والے اور پندرہ تولے سونا بیٹی والے کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ باقی سب رسوم شادی سے قبل، شادی کے دوران، اور شادی کے بعد کی یک قلم موقوف کر دی گئی ہیں۔

(۴) بزم ادب:۔ پنجابی نوجوانوں کا ادبی شعبہ ہے جہاں نہ صرف قوم کے نوجوان مختلف عنوان پر تبصرے اور تقریریں باقاعدہ جلسوں کی صورت میں کرتے ہیں بلکہ ملک کے اہل علم اور ممتاز مقرر سیاسی، معاشی، ادبی موضوع پر نہ صرف بزم ادب کے اراکین بلکہ علاقے کے دوسرے نوجوانوں کے سامنے تقریر کرتے ہیں۔ اس بزم کے ساتھ پنجابی پبلک لائبریری بھی وابستہ ہے جس کے پاس تقریباً چار ہزار کتابوں کا ذخیرہ ہے۔

[illegible] نامہ، ہفتہ وار اور ماہوار رسالے تقریباً پانچ سو آتے ہیں۔ یہ اردو، انگلش [illegible] [illegible] کی [illegible] جاتا ہے۔ اس کے لیے میونسپلٹی سے امداد لینے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس کتب خانہ کی ایک [illegible] ہے کہ [illegible] کی دلچسپی کی کتابوں کی ایک خاص فہرست مہیا کی گئی ہے کہ عورتیں گھر بیٹھے کتابیں [illegible] کی کتابوں کی فہرست [illegible] مہیا ہے۔ [illegible] پندرہ سو روپیہ سالانہ ہے۔ [illegible] کا [illegible] ہے۔

اسی قسم کے کام [illegible] بھی کر رہے ہیں لیکن ان کے کتب خانے نیو ٹاؤن پبلک لائبریری کے پاس کتابوں کا ذخیرہ زیادہ ہے۔ پنجاب پبلک لائبریری کے مقابلہ میں اس کی تقریباً سب چیزیں [illegible] ہیں۔ نیشنل پبلک لائبریری کو تقریباً ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ میونسپلٹی سے امداد بھی ملتی ہے۔

غرض برادری کا نظام اپنی جگہ پر قائم ہے اور اس کی انجمنیں اس نظام کو نئی ضرورتوں کے مطابق کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

محلوں اور گھروں کی صفائی:- سوائے کچھ حصّے جمشید خان کے اور تمام محلے جن میں پنجابی برادری کے لوگ آباد ہیں عموماً صاف رہتے ہیں۔ ہر محلہ میں محلہ کمیٹی ہوتی ہے اور وہ صفائی کا یا تو خود انتظام کرتی ہے یا میونسپلٹی سے کراتی ہے۔ ہر محلہ میں ورزش، پریڈ، والنٹیر کور وغیرہ کا بھی انتظام رکھا جاتا ہے۔ حویلی حسام الدین میں اور کالیجا میں اسکاؤٹس کا انتظام زیادہ باقاعدہ ہوتا ہے۔ برادری کے لوگوں کے گھر بھی دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ صاف ستھرے ہیں۔ گھر کی عورتیں گھر کو بہت صاف رکھتی ہیں۔ کپڑے بھی [illegible] ہوں لیکن صاف ستھرا رکھا جاتا ہے۔

تندرستی:- زیادہ اچھی نہیں ہے کیونکہ کھاتے پیتے تو زیادہ ہیں لیکن ورزش زیادہ نہیں کرتے۔ ان کا دکان پر اکثر بیٹھے رہنا ہے۔ صحت کی خرابی صفائی کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ورزش کی کمی کی وجہ سے ہے۔ پردہ بھی بہت سخت ہے [illegible] [illegible] [illegible] کے سب سے پردہ کیا جاتا ہے۔ خالہ کے بیٹوں، شوہر کی بہن کے شوہر سے بھی پردہ کیا جاتا ہے۔ [illegible] سے بھی پردہ کیا جاتا ہے۔ ڈولی میں، موٹروں، تانگوں میں پردہ لگا کر جاتی ہیں لیکن جاتی ہر جگہ ہیں۔ [illegible] [illegible] لیکن برقعہ اور پردہ ضرور ہوتا ہے۔ برقعے عموماً سادہ ہوتے ہیں۔ بچوں کی تندرستی کو بہتر کرنے کی کوشش [illegible] کا انتظام کیا جاتا ہے۔

تعلیم:- پنجابی قوم میں عورتوں اور مردوں کی تعداد تقریباً برابر ہے یعنی سات سات ہزار ہے۔ ان سات ہزار مردوں میں سے [illegible] سے زیادہ ہے ان میں تعلیم کا تناسب یہ ہے۔ ناخواندہ ۲۲ فی صدی، خواندہ [illegible] فی صدی، میٹرک [illegible] فی صدی، اعلیٰ تعلیم یافتہ [illegible] ناخواندہ ۵ فی صدی، خواندہ ۵۰ فی صدی، میٹرک ۴ فی صدی، اعلیٰ تعلیم یافتہ ۵ فی صدی۔

پنجابی ہائی اسکول مکمل طور پر پنجابی برادری کی نگرانی میں ہے اور اس کے علاوہ فتحپوری مسلم ہائی اسکول اور صدیقیہ مڈل اسکول پنجابیوں کی نیم نگرانی میں چل رہا ہے۔ [illegible] گرلز اسکیم میں پنجابی [illegible] ہائیر سیکنڈری اسکول کی اسکیم میں شامل ہو گیا ہے۔ عربی مدرسے جو پنجابی قوم کی سرپرستی میں چلتے ہیں ان میں اہل حدیث کے مدرسوں کو سو فی صدی پنجابی قوم چلاتی ہے۔

لہ یہ کام جنگ کے ہنگامی زمانہ میں جب تحقیقات کی گئی تھی باقاعدگی سے کیے گئے تھے اب یہ سب ختم ہو گئے ہیں۔
[illegible]

بازار [illegible] میں ہی جو سو طلبہ باہر سے پڑھتے ہیں ۔ ان مدرسوں میں کھانے وغیرہ سب چیزوں کا انتظام اہل حدیث کی طرف سے کیا جاتا ہے ۔ دیہات کے مدرسوں کی تعداد اہل حدیث سے زیادہ ہے۔ طلبہ کی تعداد بھی زیادہ ہے لیکن ان کا بڑا حصہ پنجابی قوم پر نہیں ہے ۔
میونسپلٹی کے مدرسوں میں پنجابی لڑکے بہت کم پڑھتے ہیں ۔ قرآن خوانی کے مکتب ہر محلہ اور ہر مسجد میں ہوتے ہیں لیکن ان میں پنجابی تخصیص نہیں ہوتی ۔ معاشرہ بہتر ہو رہا ہے ۔ پہلے ٹیکنیکل میں پنجابی قوم کے دس بارہ سے زیادہ بچے نہیں ہوں گے ۔ گریجویٹ دو تین ہوں گے ۔
ایم اے پنجابی نہیں ۔ وکیل ذات پنجابی نہیں ایک کیمسٹ بھی ہے دو ایک عالم بھی ہیں ۔
عورتوں میں تعلیم کا تناسب مردوں سے کم ہے ۔ نوجوان لڑکیوں میں خواندگی کا تناسب ۲۵ فیصدی ہوگا ۔ عمر رسیدہ عورتوں میں سے بیس فیصدی قرآن شریف پڑھی ہوئی تقریباً سو فیصدی ہوتی ہیں میٹرک تین چالیس ہیں گریجویٹ بھی ایک دو ہیں ۔
لڑکیوں کے لیے تین مدرسے ہیں ۔ ایک بڑا [illegible] روپے
[illegible] وقف کر دی گئی ہے اور اس سے یہ مدرسہ [illegible]
[illegible] محمد امین صاحب سنگاپور والی کی بیگم ہیں جنہوں نے دو لاکھ روپے کی جائیداد وقف کر
[illegible] لے ہیں ۔ اراکین میں کچھ مرد اور عورتیں ہیں ۔ اس میں تین سو لڑکیاں [illegible]
[illegible] میں پڑھنے کے لیے لڑکیاں آتی ہیں ، استانیوں اور استادوں میں پنجابی قوم کی کوئی تخصیص نہیں ہے صرف پنجابی پڑھانے کے لیے ایک پنجابی استاد ضرور رکھا جاتا ہے ۔ لڑکیوں کے لیے [illegible] کے علاوہ دو مدرسے اور ہیں ایک حافظ حمید اللہ کا قائم کیا ہوا محلہ کشن گنج [illegible] دوسرا الحاج فضل الرحمن کا قائم کیا ہوا محلہ [illegible] میں لیکن ان کا دارومدار دونوں حضرات کی ذات پر ہے ان کے لیے کوئی مستقل [illegible] نہیں ہے ۔
عورتوں اور لڑکیوں میں یہ رجحان ہے کہ زیادہ تعلیم حاصل نہ کی جائے لیکن مردوں میں عورتوں کی تعلیم کی کمی کا احساس ہے اور وہ یہ [illegible] کہ لڑکیوں کی تعلیم کا معیار بھی مردوں کے برابر ہو ۔
اخلاقی حالت :۔ پنجابی قوم میں من حیث القوم تو برائیاں نہیں ہیں کچھ لوگوں میں فرداً برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن [illegible] کے [illegible] خلاف ہے کہ ان کو یہ برائیاں چھوڑنا پڑتی ہیں ۔ نوجوانوں میں اصلاح کا اچھا جذبہ ہے کہ وہ تو عام طور پر سگریٹ پینے کے [illegible] نہیں
بزرگوں میں کچھ لوگ رنگین مزاج تھے لیکن نوجوانوں میں بالکل نہیں ہیں ۔ بارات میں ڈھول باجہ تک نہیں بھیجا جاتا
اعزازی عہدے :۔ برادری میں سات خان بہادر ہیں ۔ جو میونسپل کمیٹی کے ممبر ہیں میونسپلٹی کے معاملات میں ان کا خاصا دخل رہتا ہے
[illegible] مسلمان ممبروں میں سے پانچ پنجابی منتخب ہو کر ایک نمائندہ انجمن وکیل قوم پنجابیان کی طرف سے میونسپلٹی بھیجا گیا ۔
مقامی مسلم لیگ کے سکریٹری عبدالسلام صاحب بی اے بھی برادری سے تعلق رکھتے ہیں ۔
برادری کے ممتاز لوگ :۔ برادری میں تین حیثیتوں سے لوگ ممتاز سمجھے جاتے ہیں کچھ شخص کام کرنے کی وجہ سے کچھ [illegible] کرنے کی وجہ سے اور کچھ لٹریری کام کی وجہ سے ۔
سوشل کام کرنے والوں میں حبیب میں تعلیم کا شغل ہے خان بہادر [illegible]
اور حاجی کرم [illegible] [illegible]
[illegible]

چھپے والے، شیخ محمد عمر صاحب لیس والے اور نفضل حسین صاحب کے کام لائق ذکر ہیں۔ نئی عمر کے لوگوں میں محمد رفیع کپڑے والے، محمد عمر الٰہی صاحب، عبدالمتین صدیقی، محمد عبدالالٰہی صاحب، محمد یوسف فیروزی، شجاع الدین صالح، محمد نواب چشتی، محمد یونس بھولا والے، محمد نواب چوغتائی، عبدالغنی چشتی لائق ذکر ہیں۔

پولیٹیکل کام کرنے والوں میں ہر خیال کے لوگ پائے جاتے ہیں، مسلم لیگی بھی ہیں، جمعیتہ العلماء کے ماننے والے بھی ہیں اور چند کانگریسی بھی ہیں اور چند کمیونسٹ بھی ہیں۔ کانگریس اور جمعیتہ العلماء کی خدمت کرنے والے صرف بڑی عمر کے لوگ ہیں، حافظ رحمت الٰہی صاحب مشکفیا اور محمد عثمان صاحب گھڑی والے جمعیتہ العلمائے ہند اور شیخ محمد تقی صاحب وکیل کانگریس سے تعلق رکھتے ہیں اور غالباً بہادر محمد جان صاحب آل انڈیا مسلم مجلس کے اسسٹنٹ سکریٹری ہیں، مسلم لیگ سے دلچسپی لینے والوں میں بوڑھے سے بچے تک تقریباً نوے فی صدی مرد اور عورت ہیں جن میں عبدالسلام صاحب بی اے کا نام خاص شہرت کا مالک ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں کچھ کمیونسٹ بھی ہیں ان میں محمد یاسین صاحب ہاشمی دہلی کی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری ہیں۔

لٹریری کام کرنے والوں میں صرف نئی نسل کے نوجوان ہیں جو اچھا خاصا لکھ لیتے ہیں۔ بڑی عمر کے اور درمیانی عمر کے لوگوں میں اس قسم کا ذوق نہیں ہے۔ ان میں لائق ذکر نام مسرت کلام صاحبہ اور مونس شبیر صاحبہ خواتین میں ہیں اور نوجوان مردوں میں۔ محمد تقی نور۔ محمد احمد صاحب۔ منظور احمد صاحب۔ عمر الٰہی صاحب۔ جمیل الرحمن صاحب۔ عبدالالٰہی صاحب اور سلطان احمد صاحب الٰہ دہ والے ہیں۔

شعراء میں حافظ محمد صدیق صاحب رئیس اعظم کانپور۔ اور شیخ محمد صالحین صاحب انبالہ والوں کے نام لائق ذکر ہیں۔

برادری کی مالی حیثیت[1] برادری میں کم سے کم ایک کروڑپتی ہیں۔ چھ سات پچاس لاکھ اور ایک کروڑ کے درمیان حیثیت رکھتے ہیں دس لاکھ اور پچاس لاکھ کے درمیان حیثیت رکھنے والے پچاس کے قریب ہیں ایک لاکھ اور دس لاکھ کے درمیان ڈیڑھ سو سے زیادہ ہیں پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان تین سو سے زیادہ ہیں۔ دس ہزار اور پچاس ہزار کے درمیان ایک ہزار کے قریب ہیں اور ایک ہزار اور دس ہزار کے درمیان ہر اس شخص کو سمجھنا چاہیے جس کی شادی ہو گئی ہے کیونکہ ایک ہزار کا تو جہیز ہی مل جاتا ہے اور اس کے نیچے بقیہ سب ہیں۔

برادری کا سرمایہ مختلف کاموں میں:- برادری کا سرمایہ صحرائی جائداد میں بہت کم لگا ہوا ہے۔ اندازاً دو فی صدی شہری جائداد میں تقریباً پچاس فی صدی لگا ہوا ہے۔ فیکٹری کارخانوں میں دس فی صدی، دوکانوں وغیرہ میں پینتیس فی صدی اس میں ملوں کے حصوں اور سرکاری قرضوں میں ایک فی صدی سے کم سمجھنا چاہیے۔ چار پانچ آدمی سود کا لین دین بھی غیروں کے ساتھ کرتے رہتے ہیں لیکن قوم میں اُن کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اس میں سے پانچ فی صدی نوجوانوں میں کافی کی دوکانوں کے اور دوسرے طرح کے کنٹریکٹر بھی ہیں۔ سونا اس برادری کے پاس کافی رہتا ہے لیکن جواہرات وغیرہ بہت کم ہیں جن لوگوں کی حیثیت ایک لاکھ سے زائد ہے وہ موٹر بھی رکھتے ہیں۔ عورتوں کے کپڑوں کا خرچ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کافی قیمتی کپڑے ہوتے ہیں اور بسا اوقات حیثیت سے زیادہ ہوتے ہیں گھر میں تانبے کے برتن استعمال کئے جاتے ہیں۔ چینی، تام چینی اور شیشوں کے برتن کا استعمال کم ہوتا ہے۔ موٹر میں کفایت شعار ہوتی ہیں۔ آرائش کے سامان میں قالین، دری چاندنی، پلنگ پوش، وغیرہ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ کوئی گھر دری اور چاندنی سے

---

[1] یہ صورت حال اپریل ۱۹۴۲ء میں تھی اس کے بعد تجارتوں سے غیر معمولی اضافہ کے وجہ سے لوگوں کی مالی حیثیت میں بھی اسی نسبت سے ترقی ہو گئی ہے

خالی نہیں ہوتا ۔ موسیقی میں گراموفون اور ریڈیو کا استعمال ہوتا ہے ۔ قلمی کتابیں اور نوادر بہت کم ہیں ۔ قرضہ کاروبار کی ضرورت کے لئے دوسروں سے لیا دیا جاتا ہے لیکن دوسروں کے روپیہ پر قوم انحصار نہیں کرتی ۔

برادری کے چار پانچ افراد ملوں کے ڈائرکٹر بھی ہیں ۔

برادری کے فیملی بجٹ :۔ پنجابی برادری میں متمول اوسط اور غریب ہر ایک طبقہ کے افراد عام طور سے اپنے کنبہ والوں کے ساتھ مل جل کر مشترکہ کنبہ کی صورت میں نہیں رہتے بلکہ چھوٹے چھوٹے خاندانوں کی صورت میں علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ باپ اور بیٹا بیٹے کی شادی ہو جانے یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ اولاد ہو جانے کے بعد علیحدہ ہو جایا کرتے ہیں ۔

برادری کا غریب طبقہ :۔ پنجابی برادری کے غریب طبقہ سے مراد ایسے اہل وعیال والے افراد ہیں جو بیس روپے ماہوار سے ساٹھ روپیہ ماہوار تک نوکری یا کسی دستکاری سے حاصل کرتے ہیں ۔ یہ لوگ عام طور پر اپنی آمدنی اپنی بیوی کے ہاتھ دے دیتے ہیں جو نہایت کفایت شعاری سے اسے خرچ کرتی ہے ۔ مرد سوائے کبھی بائیسکوپ جانے کے اور اپنے برابر والوں سے گپ شپ کرنے کے کوئی خاص شوق نہیں رکھتے ۔ بازار میں کھانا پینا عیب نہیں سمجھتے تو کچھ اچھا بھی نہیں سمجھتے ۔ مرد پہننے اور اوڑھنے کے معاملے میں بہت سادہ مزاج ہوتے ہیں ان کی پوشاک پر اوسطاً تین چار روپے ماہوار سے زیادہ خرچ نہیں ہوتا عورتیں کپڑوں پر کافی خرچ کرتی ہیں عام طور سے ولایتی باریک کپڑا پہنا جاتا ہے ۔ گھر میں سفید وائل چکن اور تقریبات کے موقع پر کریپ ۔ جارجٹ لٹھ وغیرہ پہنا جاتا ہے ۔ غذا میں گوشت بہت کافی کھایا جاتا ہے ۔ پنجابی عورتیں کھانا پکانے میں بڑی ماہر ہوتی ہیں ۔ مرد عام طور سے اپنی حیثیت کو سمجھتے ہیں لیکن عورتیں برادری کے مظاہروں میں مالدار خواتین کے آگے اپنی کم مائیگی کے اظہار کے مواقع نہیں آنے دیتیں ۔ ان کے ماہوار خرچ کا اوسط حسب ذیل ہوتا ہے ۔

خوراک ۴۰ فی صدی ۔ کپڑا ۱۰ فی صدی ۔ رہائش ۲۵ فی صدی ۔ رسومات ۵ فی صدی کالسپ اندازاً ۲ فی صدی ۔

برادری کا متوسط طبقہ :۔ متوسط طبقے سے ایسے خاندان مراد ہیں جن کی وسائل آمدنی ایک سو سے ۲ سو روپے ماہوار تک ہے ۔ پنجابی برادری میں یہ طبقہ تعداد میں دوسرے طبقوں سے زیادہ ہے ۔ یہ اپنی آمدنی کا ۷۵ فی صدی حصہ اپنی شریک زندگی کو دیتے ہیں جو جملہ اخراجات کا حساب کرتی ہے البتہ رسومات کے موقع پر کسی تناسب کا خیال نہیں رکھا جاتا ۔ ان کے گھروں میں گھریلو کام کے لئے کچھ کھلانے کے لئے بازار کا سودا سلف لانے کے لئے بوڑھے یا کم عمر لڑکے ملازم ہوتے ہیں ۔ گھر کی صفائی اور روٹی پکانے کے لئے نوکرانیاں مقرر ہوتی ہیں ۔ عام طور سے متوسط طبقے کی عورتیں ہنڈیا خود نہیں پکاتی ہیں ۔ ان کا کام محض نگرانی کرنا اور کام کرانا رہتا ہے اور یہ بیٹھے بیٹھے حکم چلانے کی عادی ہو جاتی ہیں ۔

مکان بہت صاف فرنیچر اور فرش فروش سے آراستہ ہوتے ہیں سفید چاندنیاں بچھی ہوتی ہیں جن پر ریشمی غلافوں کے تکیے لگے رہتے ہیں ۔ چینی کے ظروف طاقوں میں سجے ہوتے ہیں ۔ عورتوں کو بیاہ شادی سے خاص دلچسپی ہوتی ہے اور عام طور سے ان کا موضوع بحث یہی ہوتا ہے ۔ موقع آنے پر اپنی بساط سے زیادہ اور مستقبل کے نتائج سے بے پرواہ ہو کر خرچ کیا کرتی ہیں ۔ مرد سادہ لباس مگر صاف پوش ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کا مشغلہ محض کاروبار اور گھریلو سیاست ہوا کرتا ہے ۔ البتہ اس طبقہ کے نوجوانوں میں ادبی اور سماجی خدمت کرنے کا کافی حوصلہ موجود ہے اور وہ اس میدان میں کام بھی کرتے ہیں ۔ لڑکیاں پڑھی لکھی ہوتی ہیں لیکن ان کو کوئی اعلیٰ تعلیم نہیں دلائی جاتی ۔

عورتیں سلیقہ مند ہوتی ہیں ۔ گھروں میں صاف مگر سادہ لباس پہنتی ہیں اس طبقہ کے اخراجات کا تناسب عموماً حسب ذیل رہتا ہے ۔

خوراک ۳۰ فی صدی - کپڑا ۲۵ فی صدی - آرائش ۱۲ فی صدی (مکان عام طور سے ذاتی ہیں) رسومات [illegible] فی صدی - علاج و تعلیم دس فی صدی - پس انداز ۱۵ فی صدی -

برادری کا طبقہ امراء :- تیسرے طبقہ یعنی امراء کے افراد پنجابی برادری میں طبقہ صغریٰ اور طبقہ متوسط سے کم پائے جاتے ہیں - اس طبقہ کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے - ایک وہ جو بڑے پیمانہ پر تجارت کر رہے ہیں - اور دوسرے وہ جو محض جائداد پر تکیہ کئے بیٹھے ہیں - اور کوئی کام نہیں کرتے گروہ اول کی کمزوری یہ ہے کہ وہ زمانہ کی رفتار کے مطابق صنعت کی طرف متوجہ نہیں ہے - گروہ دوم کے افراد عضو معطل کی حیثیت رکھتے ہیں - ان کے افراد عام طور پر کسی کلب کے ممبر ہوتے ہیں اور اکثر صبح سے شام تک کسی کلب کی فضا میں اپنا وقت گذار دیتے ہیں - اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ گروہ اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہے - البتہ اس کے نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور صنعت و تجارت کی طرف متوجہ ہیں -

طبقہ امراء کی ماہانہ آمدنی تین سو روپے سے ڈیڑھ ہزار روپے تک اور کہیں اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے - گھریلو اخراجات کہیں بھی چار سو سے زیادہ نہیں ہوتے - خرچ کا تناسب وہی رہتا ہے جو متوسط طبقہ کا اوپر بیان کیا گیا ہے - گھریلو زندگی بھی بڑی حد تک متوسط طبقہ سے ملتی جلتی ہے البتہ اس میں عیش پرستی اور کاہلی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں - گھریلو ساز و سامان میں [illegible] - کمروں کے دروازوں پر ریشمی کپڑے دار پردوں کا اضافہ ہوتا ہے - مکان میں مختلف ضروریات کے لئے کمرے مخصوص ہوتے ہیں اور مختلف مناظر کی تصاویر ان میں آویزاں ہوتی ہیں - ریڈیو اور گراموفون ان کی ضروریات زندگی میں شامل ہوتا ہے

برادری کی عام حالت پر تبصرہ :- بساط خانے کی تجارت اس برادری کی خصوصیت ہے اور ہر پنجابی بچہ کو بساط خانے کا کام شروع سے سکھایا جاتا ہے - چنانچہ ان کے محلوں میں چھوٹے چھوٹے بچے خونچے میں سامان بیچتے دکھائی دیتے ہیں اس تجارت میں پہلے تقریباً تمام تر مال انگلستان، جرمنی، جاپان، امریکہ سے آتا تھا لیکن ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۹ء کے درمیان کاروبار میں ایک زلزلہ سا آیا - مال کے بنانے والے بہت سے دیسی لوگ پیدا ہوگئے اور انہوں نے اپنے مال کے فروخت کرنے کے لئے اپنے ذاتی دکاندار مقرر کر دیئے اس لئے سول ایجنٹ ہونے کا جو فائدہ اس برادری کے لوگوں کو ملا ہوا تھا وہ باقی نہیں رہا -

مقامی کام میں بھی بہت سے ہندو شریک ہوگئے اور دوسرے اضلاع کے لوگوں نے تحریک فروشوں سے مال منگانے کی جگہ براہ راست ہندوستانی کارخانوں کے ہندو ایجنٹوں سے چیزیں منگانا شروع کر دیں - جب دیسی مال شروع میں چلا تھا تو کچھ کارخانہ والوں نے اپنا مال صدر بازار کے پنجابی دکانداروں کو دینا چاہا تھا لیکن انہوں نے یہ خیال کر کے کہ یہ مال چلنے والا نہیں ہے اور انگلستان امریکہ اور جاپان کے مال مہیا کرنے والوں سے بگاڑ کرنا ٹھیک نہیں ہے مال کو قبول نہیں کیا تھا - دوسرے ہندو کارخانہ والوں نے فرقہ پرستی کے جذبہ کے ماتحت ان کو مائل کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی - اس لئے ہندو کارخانہ داروں کے ہندو دکاندار پیدا ہوگئے اور ان کا مال بھی چل نکلا - چنانچہ اب صدر بازار اور چاندنی چوک کے مسلمان دکانداروں کو بھی دیسی مال منگانا پڑتا ہے لیکن کارخانے سے براہ راست ان کے پاس مال نہیں آتا - اور نہ وہ ان کے سول ایجنٹ ہیں اس لئے اس مال کی تحریک تجارت ان کے ہاتھ میں زیادہ نہیں ہے صرف مقامی تجارت ہے اور اس میں بھی ہندوؤں کا مقابلہ ہے -

---

[illegible] ۱۹۳۳ء کے ہیں جب تحقیقات کی گئی تھی -

[illegible] ۱۹۳۵ء

لیکن یہ بات نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ان کی حالت بہت گر گئی ہو۔ نرتن ہجا کیان کی دکانیں تو انھیں جگہ پر قائم ہیں اور تقریباً اتنا ہی کما رہی ہیں جتنا پہلے کماتی تھیں۔ لیکن ان کے ساتھ نئی دکانیں ہندوؤں اور دوسرے لوگوں کی قائم ہو گئی ہیں۔ کاروبار کا پیمانہ بڑھ گیا ہے پہلے اگر مجموعی بیوپار بیس لاکھ کا تھا تو اب ایک کروڑ روپیہ کا ہو گیا ہے۔ پہلے سارا کاروبار تقریباً ان کے ہاتھ میں تھا تو اب اس میں دوسرے بھی شریک ہو گئے ہیں یعنی ان کا نسبتی حصہ کم ہو گیا ہے۔

ہندوؤں کے مقابلہ میں پہلے لباس خانے میں ان کا تناسب تقریباً سو فی صدی تھا تو اب کچھ فی صدی رہ گیا ہے۔ لیکن صدر بازار کی جائداد کے مالک ابھی تک مسلمان ہی ہیں اور ہندو کرایہ دار کی حیثیت سے ان کے مکان میں اپنی دکان کرتے ہیں۔ جائداد میں پنجابی برادری نے خاصا اضافہ کر لیا ہے تجارت سے زیادہ اب اس برادری کا روپیہ جائداد میں لگا ہوا ہے۔ رہنے کے ذاتی مکانوں کے علاوہ صدر بازار کی دکانیں، کشمیری دروازہ کی آدھی دکانیں، انکی دہلی کی بہت سی کوٹھیاں، مکو رڈ نیشن ہوٹل، میرینا ہوٹل، حوض قاضی کے پاس کی بڑی عمارت، کلاں محل وغیرہ۔ یہ سب مکان پنجابی برادری کے لوگوں کے پاس ہیں۔ اس برادری کے بڑے سرمایہ دار لوگ اب صنعت کی طرف مائل ہیں البتہ جو لوگ محض مکانوں کے کرایہ یا جائداد کی آمدنی پر تکیہ کئے ہوئے ہیں وہ اپنے زائد اخراجات اور کم آمدنی کی وجہ سے پریشان ہیں۔ اوسط طبقے کی تعداد زیادہ ہے لیکن اونچے درجے کے ان لوگوں کی دولت جو تجارت اور صنعت کرتے ہیں بڑھ رہی ہے۔ اب سنہ ۱۹۱۱ء کے مقابلہ میں ملازموں (یعنی دوکان پر ملازم کی حیثیت سے کام کرنے والوں) کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ اسباب جو ہر جگہ ہیں وہی یہاں بھی کام کر رہے ہیں۔ دوکان کے کام میں اب سرمایہ لگانے کی ضرورت زیادہ ہونے لگی ہے۔ پہلے صورت یہ تھی کہ دوسرے ملکوں کا مال منگایا جاتا تھا۔ اور جو شخص بازار میں ایک دفعہ ساکھ پیدا کر لیتا تھا اُسے پھر کاروبار میں اپنا زیادہ روپے لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ مال اعتبار پر آتا رہتا تھا اور وہ اسے تھوک فروخت کر کے سہولت کے ساتھ دام ادا کرتا تھا اور درمیان میں اپنی آڑھت کا حق کاٹتا رہتا تھا اس طرح لوگوں نے بغیر زیادہ روپیہ لگائے خوب نفع کمائے اور اپنے خرچ بھی اپنی آمدنی کے لحاظ سے خوب بڑھا لئے اور یہ سمجھا کہ جو مالی حالت آج ہے وہ ہی ہمیشہ رہے گی۔ لیکن جب باہر کا مال چلنا بند ہو گیا اور ملکی کارخانوں کا مال چلنے لگا تو ایک طرف تو اس کے حاصل کرنے کے لئے زیادہ روپیہ لگانے کی ضرورت پیش آئی کیونکہ کارخانے والے نقد ادائی چاہتے تھے اور دوسری طرف خردہ کے دکانداروں نے جن کے ہاتھ مال فروخت کیا جاتا تھا ادھار خریدنے کا مطالبہ شروع کیا اور اس طرف بھی روپیہ لگانا ضروری ہو گیا اس کی وجہ سے صرف روپیہ والے لوگ ہی کام کو اپنے ہاتھ میں رکھ سکے اور دوسرے لوگوں نے اپنا کام بند کر کے ان روپیہ والوں کی ملازمت کرنا شروع کر دی۔

یہی حال سوت گولہ والوں میں بھی ہوا لیکن اوسط درجے کے جو لوگ ختم ہوئے۔ اُن کے کاروبار کو برادری سے باہر نہیں جانے دیا گیا بلکہ برادری کے لوگوں کے ہاتھ ان کا کاروبار آ گیا اور آج جو لوگ بعض دکانوں پر ہیڈ منشی کا کام کرتے ہیں وہ کسی زمانے میں اپنا ذاتی کاروبار خود کیا کرتے تھے

ضمیمہ متعلق بہ سکنائی جائداد !

زیادہ جائداد والے لوگ: اس برادری میں زیادہ جائداد والے لوگوں میں حسب ذیل ممتاز اور قابل ذکر ہیں۔

(۱) محمد ابراہیم صاحب سنگاپور والے (۲) سراج الدین صاحب کلکتہ والے (۳) محمد اسمٰعیل صاحب (۴) سلطان احمد صاحب جاپان والے

(۵) حبیب الرحمن عبدالوہاب صاحبان (۶) حافظ محمد صدیق صاحب ملتانی (۷) سراج الدین صاحب لاہور والے (۸) فضل دین نیس والے (۹) حافظ حمید اللہ صاحب چپا بڑے (۱۰) ایس ایم عبداللہ صاحب۔

اسی طرح کئی اور بھی درجنوں ہیں۔

دہلی شہر میں سکنائی جائداد کی قیمت میں اضافہ :-

جائداد کا بھاؤ چاندنی چوک میں تقریباً ہزار سیکڑہ[۵] ہو گیا ہے۔ عام طور پر بیس ہزار والی اچھی جائداد سو ہزار پر فروخت ہو جاتی ہیں۔ محلوں کے شہروں کے مکان ہر تک اور دور افتادہ جگہ کے ۸ تک پہلے عمر معمولی بات تھی اب وہ بھی بہت کم رہ گیا ہے۔

جائداد سے اس زمانے میں لوگوں نے خوب روپیہ کمایا ہے لیکن یہ کرایہ کی آمدنی سے نہیں۔ اس لئے کہ کرایہ کنٹرول کی وجہ سے کرایہ میں اضافہ کرنا ممکن نہیں تھا بلکہ مکانوں کو بیچ کر۔ لوگوں کے پاس جنگ کے زمانے میں روپیہ کی افراط ہو گئی تھی اور روپیہ کے خرچ کرنے یا کاروبار میں لگانے یا نئے مکان تعمیر کرنے کے مواقع کم ہو گئے تھے۔ روپیہ کی قیمت تیزی سے گر رہی تھی اس لئے لوگ قیمت کے زوال سے بچنے اور کاغذی نوٹوں کی جگہ ٹھوس جائداد رکھنے کے خیال سے سکنائی جائداد خریدنا چاہتے تھے چنانچہ دو ہزار کی جائداد بارہ ہزار تک میں فروخت کی گئی اور اس سے لاکھوں روپیہ لوگوں نے کما لیا۔

پہلے کے اوسط کے مقابلے میں اب جائداد کی قیمت میں اوسطاً چار گنا اضافہ ہو گیا ہے[۵]۔

[۵] یہ اعداد اپریل ۱۹۵۰ء کے ہیں جب تحقیقات کی گئی تھی

پاکستان کیا اور کیوں؟

ہر چند کہ آج "آزاد ہندوستان" اور آزاد ہندوستان میں آزاد پاکستان کے نعرے مدھم پڑ گئے ہیں لیکن تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ قوموں کی آزادی کی جدوجہد میں اس قسم کے مد و جزر آتے رہے ہیں۔ اقوام ہند کی سیاسی اور معاشی آزادی کی لڑائی میں مخالف قوتیں انتشار پیدا کر سکتی ہیں لیکن ان کے اس مقدس جہاد کو ختم نہیں کر سکتیں۔ اس سرزمین پر بسنے والوں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہندوستان میں بسنے والی اقوام کے اکثر رہنما آپس میں سمجھوتے کی بجائے انگریز کے "دست کرم" پر نظریں جمائے رہے۔ اور گذشتہ برسوں کے تلخ تجربوں کے باوجود ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتیں کانگریس اور لیگ متحد نہ ہو سکیں۔ کہ سامراج شاہی کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملایا جا سکتا اور اس کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا جا سکتا۔

آج ہر فرد قوم پر ایک قسم کی یاسیت طاری ہے اس یاسیت کو زندگی کی دھڑکنوں اور ولولوں میں تبدیل کرنا آج ہم سب کا قومی فریضہ ہے۔

عمر الٰہی

(ممبر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل)

مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد کی تاریخ کو مسلم لیگ کی ۱۹۳۷ء کی "آزادی کامل" کی تجویز سے شروع کرنے والے ہندوستان کے ملاؤں کی سیاسی تاریخ سے ناواقف ہیں۔ مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد کی تاریخ اٹھارویں صدی میں مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اقتدار کے زوال کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اس صدی کے آخری سالوں میں ایک طرف بہادر افغان سردار غلام قادر روہیلہ کو مرکز کے اقتدار کو بحال کرنے کے لئے تلوار نکالتے اور اس جدوجہد میں فنا ہوتے دیکھتے ہیں۔ دوسری طرف زرخیز اور خوشحال ہندوستان کو انگریز لٹیروں کے غاصبانہ قبضے سے نجات دینے کے لئے جنگ آزادی کی ایک اور تصویر ہمارے سامنے آتی ہے غیر ملکی ڈاکوؤں کے خلاف آزادی کی سب سے بڑی لڑائی ہندوستان کی جمہوری ریاست سلطنت خداداد میسور کی طرف سے لڑی گئی۔

ٹیپو سلطان ملاؤں کے کفر کے فتووں کے باوجود ریاست کے اندر ایک طرف زمینداری سسٹم کو ختم کرکے زمین کو کسان کی ملکیت قرار دے رہا تھا۔ اور زمینداروں سے جنگ کر رہا تھا دوسری طرف ہندوستان کی تمام قوموں اور قوتوں کو انگریزوں کے خلاف ایک محاذ بنانے کے لئے اتحاد کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔ اور نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرق کی ہر قوت کو اس مقدس جہاد میں اشتراک کی دعوت دے رہا تھا۔

آزادی کی یہ خونریز لڑائی ۱۷۶۶ء سے ۱۷۹۹ء کے درمیان تین بار ہوئی اور کئی کئی سال جاری رہی ہماری آزادی کی اس لڑائی کا سب سے بڑا غدار "ننگ قوم" اس وقت کا نظام دکن تھا جو انگریز کے شانہ بشانہ ٹیپو سلطان کے خلاف لڑ رہا تھا۔

۴ مئی ۱۷۹۹ء کی صبح کو ٹیپو نے اپنی آخری تقریر میں کہا تھا "کہ مجھے اس بات کا اندازہ ہے کہ میری زندگی کے اب چند گھنٹے باقی ہیں لیکن میں اس ملک کے دشمنوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس غداری کا نتیجہ تمہیں اس وقت معلوم ہوگا کہ جب اس دیس کے باشندے چاولوں کے ایک ایک دانے اور پیاز کی ایک ایک گٹھی کو ترسیں گے"۔ اسی روز قلعہ سرنگاپٹم سے باہر نکل کر وہ انگریزوں پر ٹوٹ پڑا۔ دن کے ۲ بجے سے رات کے ۱۰ بجے تک خونریز جنگ ہوئی۔ بارہ ہزار شہیدوں کے درمیان ٹیپو سلطان کی نعش تھی۔ ان شہیدوں کے خون سے ہماری آزادی کی جدوجہد کی تاریخ شروع ہوتی ہے

انیسویں صدی میں ہماری تحریک آزادی میں مختلف رجحان پیدا ہوئے۔ اس صدی کے ابتدائی سالوں میں مخلص مسلمانوں کی ایک جمعیت نے احیاء مذہب کا نعرہ بلند کیا۔ وہ کہتے تھے کہ فاسق فاجر بادشاہوں اور جاہل اور بدعتی ملاؤں کی وجہ سے ہم اپنے مذہب کی اصل تعلیمات کو بھلا بیٹھے ہیں اور اس لئے آج ہم انگریزوں کے غلام ہیں۔ ہمیں اپنے مذہب کی روح کو زندہ کرنا چاہیئے اور مذہبی تعلیم کو خالص شکل میں رواج دینا چاہیئے تب ہی ہم میں وہ جذبہ ایمانی پیدا ہوگا کہ ہم اپنی آزادی کی لڑائی لڑ سکیں۔ احیاء مذہب کا نعرہ بلند کرنے والوں نے ہماری موجودہ پستی اور انحطاط کے مقابلہ میں ہمارے ماضی کے شاندار کارناموں کی یاد تازہ کی اور اس طرح ہم میں قومی عظمت کا احساس اور سامراجیوں سے نفرت کا جذبہ پیدا کیا ان کی باتیں مذہبی ہوتی تھیں مگر اس کی تہہ میں سامراج دشمنی کا جذبہ کام کر رہا تھا

انیسویں صدی میں مسلمانوں کی آزادی کا نعرہ سب سے پہلے وہابیوں نے بلند کیا۔ اس تحریک کا ایک سرا بنگال اور دوسرا صوبہ سرحد کی چٹانوں سے ملتا تھا۔ اس جدوجہد کے روح رواں مولوی سید احمد اور مولانا اسمٰعیل شہید تھے۔ اور اس کے کھنڈرات آج تک ملتیہ کے معتوب علاقوں اور کالے پانی کے جزیرہ پر قبروں کی شکل میں موجود ہیں۔

اس کے بعد ۱۸۵۷ء کی بغاوت نمودار ہوتی ہے "غاصب انگریزوں کو نکالدو" کی پکار مشرق سے چل کر مغرب اور جنوبی ہندوستان تک گونج جاتی ہے۔ مسلمان اس انقلاب میں پیش پیش تھے۔ دوستوں کی جنگ غیر منظم اور دشمن کی مخالفت اور جارحانہ کاروائی [illegible]

مطابق ہوتی ہے۔ فروری ۱۸۵۷ء سے ستمبر ۱۸۵۸ء تک ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں میدان کارزار میں گولیوں کا نشانہ بنتے ہیں، پھانسی کے پھندوں کی گرفت کی راہ ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دیئے جاتے ہیں اور زندہ آگ میں جلا دیئے جاتے ہیں۔ نوجوانوں کی ابھرتی ہوئی قوتوں کو پھر ابھرنے سے کچل کر برسوں کے لئے دفن کر دیا جاتا ہے۔

ہماری اس تاریخی جدوجہد نے مختلف دور میں وقت اور حالات کے مطابق مختلف روپ اختیار کئے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخری دور کے اندھیار سے میں جب کہ دشمن کے پنجہ کی گرفت مسلسل مشق ستم کے باعث کافی مضبوط ہو گئی تھی۔ روشنی کی ایک نئی کرن نظر آئی مسلمانوں میں ایک نیا رجحان پیدا ہوا۔ اس کے ماننے والے نئے خیالات کے حامی تھے وہ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے عقیدے کی بجائے عقل سے کام لینا چاہتے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ اس ملک کی قوموں میں جدید جمہوری خیالات پھیلیں۔ جاگیری نظام کا خاتمہ ہو وہ چاہتے تھے کہ ہم اپنے پرانے اور فرسودہ خیالات کو ترک کریں اور جو نئی اور اچھی باتیں ہمیں مغرب سے ملیں ان کو بھی اپنائیں اور اختیار کریں۔ مسلمانوں میں اس خیال کے علمبردار سر سید احمد خاں تھے اُن کی باتیں نئی تھیں اُن کے خیالات جمہوری تھے اور وہ مسلمانوں میں علم کی روشنی پھیلانا چاہتے۔

بیسویں صدی میں ہماری تحریک آزادی شہروں میں درمیانی طبقے کے پڑھے لکھوں تک محدود تھی کانگریس کا قیام عمل میں آ چکا تھا ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت لیگ اور کانگریس کی طرف سے ذمہ دار حکومت اور پورے ملک میں نمائندہ ادارے قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا لیکن جب یہ سوال اٹھا کہ یہ نمائندہ ادارے کس بنیاد پر قائم کئے جائیں تو انگریز نے کہا ووٹ دینے کا حق ان لوگوں کو ہوگا۔ جو سمجھداری سے اس حق کو استعمال کر سکیں مطلب یہ تھا کہ ووٹ صرف وہی لوگ دے سکیں گے جو دولتمند اور تعلیم یافتہ ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کی کیفیت یہ تھی کہ نہ تو وہ دولتمند تھے نہ تعلیم یافتہ۔ تعلیم میں ان کا تناسب ۲۵ فی صدی تھا۔ کانگریس اور ہندو اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ ووٹ دینے کا حق دولتمند اور تعلیم یافتہ لوگوں تک محدود ہونا چاہیئے۔ اس وقت کانگریس کا فرض تھا کہ محدود حق رائے دہی کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے خاص تحفظات وضع کرتی اور مسلمانوں کو مناسب نمائندگی کا حق دیتی اور پھر دونوں مل کر برطانیہ سے مطالبہ کرتے کہ وہ حق رائے دہی بالغاں کے اصول کو تسلیم کرے لیکن ہندو اور کانگریسیوں نے ذرا نہ سوچا کہ مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے اور وہ محدود اور مخلوط انتخاب کی حمایت کرتے رہے یہ ہماری تحریک آزادی کے دور کا سب سے پہلا الجھاؤ تھا۔ اگر تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو حق رائے دہی دیا جاتا تو مخلوط اور جداگانہ انتخاب کا مسئلہ بالکل مختلف صورت اختیار کر لیتا۔

مسلم لیگ کے پورے دور پر نظر ڈالنے سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ لیگ ہمیشہ دو مسئلوں پر زور دیتی رہی ہے۔ پہلے ہندوستان کے ان مطالبات پر جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے برطانوی حکومت کے مقابلے پر مشترکہ مطالبات تھے دوسرے اس مطالبہ کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیش کی جاتی رہی ہے کہ مسلمانوں کو چند ایسے حقوق ملنے چاہئیں جو ایک آزاد ہندوستان میں انہیں آزادی سے زندگی بسر کرنے کا موقع دیں۔ مثلاً جداگانہ انتخاب۔ مسلمانوں کے لئے مجلس قانون ساز میں نشستوں کا تحفظ۔ سرکاری نوکریوں میں ان کا مناسب تناسب ان کی زبان اور مذہب کا تحفظ۔ یہ تھے وہ مطالبات جو مسلمانوں کی آزادی کا جزو قرار دیئے گئے۔ مسلمانوں کو ان مخصوص مطالبات پیش کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں وطنی آزادی کے جذبہ کی کمی ہے اور وہ ہندوستان کے غیر مسلموں سے

ناجائز مراعات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بہت سے قوم پرور عناصر کا یہی خیال ہے وہ کہتے ہیں کہ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کے ذریعے جداگانہ انتخاب کا حق جو مسلمانوں کو ملا وہی فرقہ بندی اور تمام جھگڑوں کی جڑ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح انگریزی حکومت نے ایک زہریلا بیج بویا اور ہندو مسلمانوں کو لڑا کر اپنا الو سیدھا کیا اور اس طرح وہ ہندو مسلم اتفاق کی ذمہ داری برطانوی سامراج پر ڈال کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ حالات کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنے سے بالکل دوسری تصویر نظر آتی ہے جو یہ کہ ہندوستان کے وہ علاقے جہاں مسلمان بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ مثلاً مشرقی بنگال، مغربی پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان۔ جب یہ صنعتی تجارتی اور تعلیمی ترقی کے اعتبار سے بمبئی، کلکتہ، احمد آباد۔ اور مدراس وغیرہ سے پچھڑے ہوئے ہیں ان آگے بڑھے ہوئے خطوں میں ہندو بڑی اکثریت میں آباد ہیں اور جب یہ ہندوستان کی قومیت کی تحریک بھی ان ہی علاقوں سے شروع ہوتی ہے۔ یہی لوگ کانگرس کی بنیاد بھی رکھتے ہیں پھر اگر اس بات کو ذہن نشین کیا جائے۔ کہ جب قومی مطالبات کی صورت یہ ہو کہ صرف صاحب جائیداد نمائندگی کا حق رکھیں اور صرف انگریزی پڑھے لکھے لوگ سرکاری عہدوں پر فائز ہو سکیں تو مسلمان جو ہر اعتبار سے پچھڑے ہوئے تھے اگر اپنے لیے جداگانہ مطالبات پیش نہ کرتے تو کس طرح وہ اس قومی ترقی سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ یہ مطالبات خود غرضی اور قومیت کے اصول کے منافی نہیں بلکہ ایک پچھڑی ہوئی جماعت کے لئے جائز اور جمہوری مطالبات تھے۔

جنگ بلقان اور ترکی سلطنت پر یورپین شہنشاہیت کی یلغار سے عالم اسلام اور ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہوا۔ علی گڑھ کالج کے نوجوانوں میں ترکی کی مدد کے لیے ایک زبردست تحریک شروع ہوئی جسے مولانا محمد علی کے اخبار کامریڈ نے ایک منظم شکل دی ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی رہنمائی میں ایک میڈیکل مشن ترکی گیا۔ مولانا آزاد کے اخبار الہلال نے مسلمانوں میں آزادی کے جذبات پھیلائے دراصل بیرونی شہنشاہیت کی مخالفت کی یہ مختلف شکلیں تھیں۔

۱۹۱۲ء میں ہندوستان کے انتہا پسند انقلابیوں کا ایک گروہ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ ہندوستان سے باہر تھا اس گروہ نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے انگریزوں سے لڑنے کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کابل میں ایک عارضی حکومت قائم کی اس کے رہنماؤں میں مولانا عبید اللہ سندھی راجہ مہندر پرتاپ۔ مولوی برکت اللہ اور ویریندر چٹوپادھیائے (سروجنی نائیڈو کے بھائی) وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔

ہندوستان کے اندر بھی لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ انگریزوں سے اختیار حاصل کرنے کے لئے ایک متحدہ محاذ بنانا ضروری ہے۔ آغا خاں اور اُن کے ساتھی جو اس وقت مسلمانوں کے رہنما بنے ہوئے تھے پیچھے ہٹا دیئے گئے نئے رہنما سامنے آئے جس میں مولانا محمد علی مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر محمد علی جناح سب سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے یہی لوگ اب مسلم لیگ کی ناؤ کھینے لگے۔ کانگرس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا گیا کوشش کامیاب ہوئی چنانچہ ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور لیگ دونوں نے لکھنؤ میں اجلاس کئے اور دونوں میں سمجھوتہ ہوا اس کی توثیق کی اس معاہدہ میں متفقہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان کو سلطنت برطانیہ کے ایک آزاد رکن کی حیثیت سے مساوی حقوق اور ذمہ داریاں دی جائیں اور ایک خود مختار ریاست کا درجہ دیا جائے۔ اس معاہدہ کے ذریعہ مطالبہ کیا گیا کہ مجالس قانون ساز ممبروں کی تعداد بڑھائی جائے اور اکثریت ایسے لوگوں کی ہو جو منتخب ہو کر آئیں۔ کانگرسی لیڈروں نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو مان لیا اور اسے صوبہ متوسط اور پنجاب میں بھی نافذ کرنے پر رضامند ہو گئے۔ لیگ اور کانگرس دونوں جماعتوں کے لیڈروں کو بڑی خوشی تھی کہ سمجھوتہ ہو گیا۔ لیگ کے رہنماؤں نے کانگرس کے اجلاس میں شرکت کی اس موقع پر لوکمانیہ تلک نے تقریر کرتے

ہمیشہ کہا جاتا ہے کہ ہندو اپنے مسلمان بھائیوں کے سامنے ضرورت سے زیادہ جھک گئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہم ضرورت سے زیادہ جھک ہی نہیں سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں پوری ہندو جاتی کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہوں ہم کو جب ایک تیسری جماعت سے لڑنا ہے تو یہ ایک بہت بڑی چیز اور بڑا اہم واقعہ ہے کہ ہم اس جگہ متحد کھڑے ہوئے ہیں ہم نے نسلی مذہبی اور سیاسی تمام اختلافات کو بھلا دیا ہے۔"

اس موقعہ پر سر سریندر ناتھ بنرجی۔ گاندھی جی۔ سروجنی نائیڈو۔ اور بپن چندر پال نے تو لیگ کی کارروائی میں حصہ لیا۔ مسٹر جناح نے اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا "اگر کسی اقلیت کے سیاسی شعور کو صحیح راستہ پر لگانا ہے اور قومی انجام دہی میں اسے مل جل کر کام کرنے پر آمادہ کرنا ہے تو سب سے پہلے اس اقلیت کے دل میں یہ احساس پیدا کرنا چاہیے کہ اس کے تمام حقوق محفوظ ہیں ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ اطمینان اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ایک فرقہ کی حیثیت سے ان کے سیاسی وجود کو قائم رکھنے کے لئے مناسب اور موثر تحفظات منظور کئے جائیں۔"

جنگ عظیم کے خاتمہ پر انقلاب اور آزادی کی ایک زبردست لہر اٹھی۔ ساری دنیا میں قومی تحریکات کا ایک ابال آیا۔ انقلاب روس نے روسی شہنشاہیت کی دھجیاں اڑا دیں اور دنیا کی تاریخ میں پہلی بار محنت کش عوام (مزدوروں کی اور کسانوں) کی حکومت قائم ہوئی۔

روس کے ہمسایہ اسلامی ممالک مثلاً ترکی ایران، افغانستان وسطی ایشیا کے مسلمان نے اپنی آزادی کی جدوجہد شروع کی جس میں انہیں براہ راست روس کی پنچایتی حکومت سے مدد ملی۔ عربی ممالک میں مغربی سامراجی تسلط کے خلاف پرزور احتجاج شروع ہوا۔ اسلامی دنیا کی اس انقلابی ہلچل سے ہندوستان کے مسلمان بھی متاثر ہوئے۔ نیز ہندوستان میں برطانوی تشدد وسخت گیری ایک طرف معاشی گڑبڑ دوسری طرف ان واقعات نے عوام میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔

ہماری تحریک آزادی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی کے ملنے سے انگریزی حکومت کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم ہوا اور ایک بڑی زبردست عوامی تحریک شروع ہوئی اس تحریک کے رہنما علی برادران اور گاندھی جی تھے۔ گھر گھر سوراج کا نعرہ بلند ہونے لگا یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں نے اور میدانوں میں اگرچہ برابر ترقی نہیں کی تھی لیکن مکمل آزادی کی آواز پہلے پہل مسلمانوں نے ہی اٹھائی تھی۔ خلافت کی تحریک کے لیڈروں نے سب سے پہلے یہ مطالبہ کیا کہ سوراج کی تشریح کر دو اور اعلان کر دو کہ اس کا مطلب مکمل آزادی ہے۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو مولانا حسرت موہانی نے یہ مطالبہ پیش کیا۔ گاندھی جی نے اس کی زبردست مخالفت کی انہوں نے کہا "کہ مکمل آزادی کے مطالبہ سے مجھے تکلیف ہوئی یہ غیر ذمہ داری کی علامت ہے" اسی طرح سب سے پہلے مسلم لیگ ہی نے سنہ ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے اجلاس میں یہ تجویز منظور کی کہ مسلمان انگریزوں کی فوج میں بھرتی نہ ہوں"

سنہ ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ میں خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلمائے ہند کی مجلس عاملہ کا ایک مشترکہ جلسہ ہوا جس میں ایک قرارداد منظور ہوئی کہ "ہندوستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کا تقاضہ ہے کہ کانگریس سوراج کی بجائے مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دے"۔

اس زمانے میں کانگرسی لیڈر اس بات کی مخالفت کرتے تھے اور یہ عذر پیش کرتے تھے کہ اس کے لئے کانگریس کے دستور میں بنیادی تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسلمان گو تعداد میں کم تھے اور ان کی مالی حالت بہت خراب تھی مگر خلافت کی تحریک نے ایک کروڑ روپیہ انہوں نے جمع کیا۔ تلک سوراج فنڈ کے لئے بھی ہندوؤں نے اتنا ہی روپیہ جمع کیا تھا۔ مسلمان لاکھوں کی تعداد میں جیلوں میں گئے ہزاروں کی تعداد میں گولیوں کا نشانہ بنا دیے گئے۔ فوج کو بغاوت کی تعلیم بھی پہلے پہل مسلمان لیڈروں ہی نے محمد علی اور مولانا حسین احمد مدنی نے دی اور اس کی پاداش میں انہیں چھ سال قید فرنگ نصیب ہوئی پھر اسی کے ساتھ مالابار کے ان مسلمان موپلہ کسانوں کو بھی یاد رکھیے جنہوں نے زمینداروں اور انگریز حکمرانوں کے خلاف بغاوت بلند کیا اور نہایت بہادری سے جدوجہد اور قربانی کے میدان میں ڈٹے رہے۔ برطانوی سامراج پر لرزہ طاری ہو گیا اور اس نے خوفزدہ اور حواس باختہ ہو کر تحریک کو کچلنا شروع کیا۔

فروری سنہ ۱۹۲۲ء میں جب گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کیا تو خلافت کی تحریک کے تمام لیڈروں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا وہ انگریزی سامراج کے خلاف جدوجہد جاری رکھنا چاہتے تھے چنانچہ ایک اعلان کے ذریعہ انہوں نے جنگ آزادی کو جاری رکھنے کے لئے ایک کروڑ سپاہی مسلمانوں کے نام طلب کئے (ملاحظہ ہو مرکزی خلافت کمیٹی کی کارروائی)

مسلمانوں کے اس مجاہدانہ جوش و خروش کو گاندھی جی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں نے دبا دیا —

ترک موالات اور خلافت کی تحریک سے جہاں ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں سیاسی شعور بڑھا وہاں ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ اس تحریک کی ناکامی پر مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا خلافت کمیٹیاں ختم ہو گئیں مسلم لیگ بھی اپنی تنظیمی کمزوری کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت کو اپنے اندر نہ کھینچ سکی برطانوی شہنشاہیت اور رجعت پسند جاگیری اور سرمایہ پرست طبقے نے اس سیاسی جمود سے فائدہ اٹھایا اور ہندو مسلم فسادات کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ آئینی بحثیں ہونے لگیں اور آزاد ہندوستان کے دستور اساسی کے خاکے مرتب ہونے لگے۔ یہاں سے یہ سوال اٹھا کہ مسلمانوں کے حقوق کیا ہوں گے۔ اور آزاد ہندوستان کے جمہوری نظام میں ان کی حیثیت کیا ہو گی۔

کانگریس کا تصور یہ تھا کہ ہندوستان کی سوراجی حکومت انگریزی نمونہ کی جمہوری حکومت ہو گی جس میں صرف ایک قوم اور ایک مرکزی حکومت ہوتی ہے اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات بہت محدود ہوتے ہیں چنانچہ جب نہرو کی صدارت میں کل جماعتی کمیٹی نے دستور مرتب کرنا شروع کیا تو اس کی کوشش محض یہ تھی کہ کسی برطانوی نوآبادی سے ملتا جلتا دستور بنایا جائے۔ اس کمیٹی نے بالکل یہ نہ سوچا کہ یہ دستور ایسا ہونا چاہیئے جس میں مسلمانوں کے مطالبے پورے ہوں۔ مسلمانوں کے مطالبے کا لب لباب یہ تھا کہ ہندوستان کا دستور وحدانی نہ ہو بلکہ وفاقی ہو۔ صوبوں کو پوری خود مختاری ہو اور جن اختیارات کی تصریح نہ ہو وہ سب صوبوں کے ہاتھ میں ہوں کانگریس اور ہندو چاہتے تھے کہ ہندوستان کا دستور وحدانی ہو اور یہاں ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کی جائے انہیں امید تھی کہ انگریز مرکز میں ایک مضبوط حکومت قائم کر جائیں گے وہ مسلمانوں کے مطالبات کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور سمجھتے

کے صوبوں کو خود مختاری دینا بہت خطرناک ہے۔ دوسری طرف جب مسلمانوں نے دیکھا کہ کانگریس ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کرنے پر اصرار کر رہی ہے اور غیر تشریح شدہ اختیارات بھی صوبوں کے ہاتھ میں چھوڑنے پر تیار نہیں تو انہیں بھی بدگمانی ہونے لگی۔ کہ ہندو اپنا غلبہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کنونشن کے اجلاس ہوئے اسی اجلاس میں تمام جماعتوں کا اتحاد ہمیشہ کے لئے درہم برہم ہو گیا۔ انگریزوں کی منظوری حاصل کرنے کی غرض سے کانگریس نے اپنی اسکیم میں ہر طرح کی ترمیم اور تبدیلی کی مگر مسلمانوں کے اعتراض پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی برادران اور مسٹر جناح سب ہی ناراض ہو کر علیحدہ ہو گئے۔ کانگریسی لیڈر اسی خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ہندوستان بھی فرانس اور انگلستان کی طرح ایک قوم بستی ہے وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ یہ متعدد قوموں کا مسکن ہے اور ان میں سے ہر قوم کی زبان طرز معاشرت اور تاریخی روایات علیحدہ ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ہر قوم آزاد ہو۔ ایسے ہی دوسروں کی طرح ترقی کرنے کا موقع ملے۔ اس ملک میں ایک مضبوط حکومت صرف اس طرح قائم ہو سکتی ہے کہ خود مختار صوبے اپنی مرضی سے اپنے اقتدار اعلیٰ اور اپنے اختیار کا کچھ حصہ مرکز کو سونپ دیں۔ یہی ایک منصفانہ طریقہ ہے جس پر عمل کر کے ہندو مسلم مسئلہ کو حل کیا جا سکتا تھا یہ ایک قابل ذکر بات ہے کہ ہندوستان کے مایہ ناز انقلابی مسلمان مولانا عبید اللہ سندھی ۱۹۲۶ء میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے وہ سوویٹ یونین کو انقلاب کے بعد دیکھ چکے تھے۔

چنانچہ وہ ۱۹۲۶ء میں جب وہ قسطنطنیہ میں جلا وطنی کے دن گذار رہے تھے تو انہوں نے ہندوستان کے لئے ایک دستور کا خاکہ مرتب کیا تھا جسے وہ شروع میں "دستور یعنی عام لوگوں کی حکومت قائم کرنے والا دستور" کہتے تھے۔ ان کی رائے میں ہندوستان میں مختلف قومیں ہیں۔

سندھی، بلوچی، پختون (پٹھان)، مغربی پنجابی (دیسی پنجابی)، اور کشمیری، اور ان میں سے ہر ایک قوم کی اپنی الگ زبان ہے۔

انہوں نے ہندو مسلم مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جو تجویزیں پیش کی تھیں اس کے اہم نکتے یہ ہیں۔

(۱) ہر قوم کو حق خود اختیاری ملے۔

(۲) ہندوستان کی متحدہ ریاست ایسی ہو کہ اس میں اقتدار اعلیٰ رکھنے والی قومی جمہوریتیں اپنی مرضی سے شامل ہوں۔

(۳) زمینداری نظام مٹا دیا جائے۔

(۴) بھاری صنعتیں قوم کی ملکیت قرار دی جائیں۔

کانگریس میں اب ڈاکٹر انصاری اور ان کے ساتھ چند گنتی کے مسلمان رہ گئے تھے۔ کانگریس نے ۱۹۳۰ء میں جب عدم تعاون کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا تو ڈاکٹر انصاری کا آخر تک اصرار تھا کہ مسلمانوں سے سمجھوتہ کر لو۔ لیکن کسی نے ان کی بات نہ سنی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تحریک شروع ہوئی تو ۱۹۲۰ء کے مقابلہ میں بہت کم مسلمانوں نے اس میں حصہ لیا۔ سرحد کے پٹھانوں اور کشمیر کے مسلمانوں میں قومی تحریک کی جو لہریں اٹھیں وہ کانگریس کی کوششوں کا نتیجہ نہیں تھیں سرحد کے پانچ سو خدائی خدمتگار پٹھان پشاور کے قصہ خوانی بازار میں انگریزی گولیوں کا نشانہ بنا دیے گئے۔

جب گاندھی جی نے ۱۹۳۱ء میں لارڈ ارون سے معاہدہ کرنے کے بعد سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دی۔ تو گول میز کانفرنس میں ایک بار پھر ہندو مسلم تصفیہ کا سوال اٹھا۔ گاندھی جی کانگریس کی نمائندگی کر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ برطانیہ کی لیبر گورنمنٹ کانگریس کی مقبولیت اور ہمہ گیر اثر کو دیکھتے ہوئے صرف کانگریس سے سمجھوتہ کرے گی لیکن انگریز نے ایسا نہ کیا۔

وہ تمام مسائل جن پر ابھی تک سمجھوتہ نہ ہو سکا تھا پھر اٹھ کھڑے ہوئے متحدہ محاذ قائم کرنے کی زبردست کوششیں ہونے لگیں۔

اقلیتی کمیٹی میں مسلم رہنماؤں نے تجویز پیش کی کہ پنجاب کی

سرحد کو تبدیل کر کے انبالہ ڈویژن کو جہاں اکثریت ہندوؤں کی ہے علیحدہ کر دیا جائے تاکہ پنجاب میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہو جائے۔

یہ تجویز نامنظور کر دی گئی۔ بنگال کی مسلم اکثریت کی پوری نمائندگی کا سوال بھی حل نہیں کیا گیا۔ مہاسبھائی لیڈروں کی کوششیں کامیاب ہوئیں برطانوی وزیراعظم کو ثالث مقرر کیا گیا اور اس نے "تمام اور حکومت برطانیہ کے مقررہ اصول کی روشنی میں اپنا فیصلہ نافذ کر دیا۔

ہندو اور مسلمان دونوں جماعتوں کے لیڈروں نے دیکھ لیا کہ فرقہ وارانہ فیصلہ" دونوں فرقوں کے لئے تباہی کا پیغام لے کر آیا ہے۔ دونوں نے انگریز کی چال کو مات دینے کے لئے متحدہ محاذ بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ دسمبر ۱۹۳۲ء میں الہ آباد میں اتحاد کانفرنس ہوئی جس میں مدن موہن مالویہ اور ڈاکٹر مونجے جیسے کٹر مہاسبھائیوں نے مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم کیا کہ (۱) ہندوستان میں وفاقی حکومت بنائی جائے جس میں صوبوں کو مکمل خود مختاری اور تمام غیر تصریح شدہ اختیارات حاصل ہوں۔ (۲) سندھ شمالی مغربی سرحد اور بلوچستان علیحدہ صوبے بنا دئے جائیں (۳) بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت ان کی صحیح نمائندگی ان صوبوں کی مجلس قانون ساز میں ہونی چاہئے (۴) مرکز میں مسلمانوں کو ۳۲ فی صدی نمائندگی ملنی چاہئے۔ لیکن سرکار کے ستون اور بنگال کے مہاسبھائیوں نے اس سمجھوتہ کی سختی سے مخالفت کی۔ کانگریس نے ہتھیار ڈال دیئے مسلم رہنماؤں کا دل ٹوٹ گیا۔ انہوں نے سمجھوتہ کی تمام امیدیں منقطع کر دیں۔

۱۹۳۵ء میں بابو راجندر پرشاد اور مسٹر جناح کے درمیان ایک اور سمجھوتہ ہوا لیکن پنجاب کے مہاسبھائیوں کی مخالفت کی وجہ سے وہ بھی ختم ہو گیا۔

۱۹۳۷ء میں نئے دستور کا نفاذ ہوا الیکشن کے دوران میں عوام میں ایک نئی بیداری کے آثار پیدا ہوئے۔ کانگریس اور لیگ کو دونوں نے انتخاب میں حصہ لیا۔ یوپی میں دونوں میں یہ سمجھوتہ ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے سے انتخاب نہ لڑیں۔ کانگریس کی بہت بڑی کامیابی ہوئی اس وقت ضرورت تھی کہ کانگریس اور لیگ کی متحدہ وزارتیں بنیں۔ ہندو مسلم سمجھوتہ ہوتا۔ غریب اور محنت کش عوام کو ان کی معاشی مطالبات کی بناء پر منظم کیا جاتا۔ لیکن کانگریس نے "اقتدار اعلیٰ" کے نشہ میں سب کچھ بھلا دیا۔ کانگریسی رہنماؤں نے یوپی جیسے صوبہ میں لیگ اور کانگریس کی ملی جلی وزارت بنانا قبول نہیں کیا۔ عذر یہ پیش ہوا کہ "ایک ہی خیال" کے لوگوں پر مشتمل وزارت بننی چاہئے۔

کہا گیا کہ کانگریس لیگ کے چند ممبروں کو وزارت میں لے سکتی ہے بشرطیکہ وہ اسمبلی میں اپنی پارٹی ختم کر دیں۔ اپنا پارلیمنٹری بورڈ توڑ دیں۔ کانگریس کے عہد نامہ پر دستخط کریں۔ کانگریس کے ڈسپلن کو قبول کریں۔ یہ شرطیں کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کی طرف سے چودھری خلیق الزماں کے سامنے پیش کی گئی تھیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں میں کانگریس کے خلاف ایک عام بداعتمادی پیدا ہو گئی۔ ۱۹۳۷ء کی قرارداد کے مطابق مسلم لیگ کا نصب العین "ہندوستان میں آزاد جمہوری ریاستوں کا وفاق قائم کرنا تھا۔ جس میں مسلمان اور دوسری اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے لئے مناسب اور موثر تحفظات موجود ہوں گے۔" ورکنگ کمیٹی کو ہدایت کی گئی کہ مکمل آزادی کے لئے کوئی تدبیر نکالے اور اس خیال کی سب سیاسی انجمنوں کو باہمی حمایت کی دعوت دینا اس کا فرض منصبی قرار دیا گیا۔

لیگ نے مسلمانوں کی قومی زندگی میں مرکزی حیثیت اختیار کر لی۔ دراصل لیگ ان کی قومی بیداری کا سرچشمہ تھی۔ کانگریس والے اور ہندو یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ مسلمان کیوں اپنی اکثریت کے صوبوں۔ مثلاً سندھ، سرحد، پنجاب، بلوچستان وغیرہ کے لئے اقتدار اعلیٰ اور خود مختاری کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ دراصل اس مطالبہ کی تہہ میں ان قوموں کا یہ جذبہ کام کر رہا تھا کہ وہ اپنے وطنی علاقوں میں آزادی سے زندگی بسر کریں۔ اس وقت تک مسلمانوں نے ہندوستان سے علیحدہ ہونے کا مطالبہ نہیں کیا تھا

۱۹۲۸ء میں کل جماعتی کنونشن کی ناکامی کے بعد آل انڈیا خلافت کانفرنس نے مطالبہ کیا تھا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرح آزاد ہندوستان میں بھی آزاد جمہوریتوں کی ریاست قائم کی جائے۔

۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ نے بھی آزادی کے نصب العین کی تشریح کرتے ہوئے اسے "آزاد جمہوری ریاستوں کے وفاق" سے تعبیر کیا۔ صوبائی وزارتوں کے زمانہ میں سارا ملک سامراجی وفاق کی مخالفت پر آمادہ تھا اس وقت آزاد اور خود مختار ریاستوں کے رضاکارانہ اور جمہوری وفاق کے اصول کی بنیاد پر کانگریس اور مسلمانوں کا متحدہ محاذ بڑی آسانی سے قائم کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک لیگ کانگریس گفت و شنید کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس وقت بھی لیگ اور کانگریس فیڈریشن (انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء) کی مخالفت اور مکمل آزادی کا مطالبہ کرتے رہے لیکن دونوں آپس میں متحد نہ ہو سکے۔

۱۹۳۹ء میں لڑائی چھڑی اور جنگی ضروریات سے مجبور ہو کر برطانوی حکومت نے کانگریس اور لیگ سے اصلاحات کے سلسلے میں گفتگو کی لیکن چونکہ کانگریس اور لیگ متحد نہ تھے اس لئے دونوں طاقت سے محروم رہے۔ بار بار کی ناکامیوں نے مسلمانوں میں انتہائی مایوسی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اس جذبہ نے علیحدگی پسندی کی صورت اختیار کر لی ۱۹۴۰ء میں لیگ نے لاہور کے تاریخی اجلاس میں وہ ریزولیوشن منظور کیا جو بعد میں "پاکستان" کے ریزولیوشن کے نام سے مشہور ہوا۔ اور جس میں شمال مشرق اور مغرب کے ان علاقوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں انہیں خود مختار اور مکمل آزاد ریاستیں بنانے کا مطالبہ کیا اس تجویز میں اس امر کا اعلان کیا گیا تھا کہ "پاکستانی ریاست جن وحدتوں (یا علاقوں) سے مل کر بنے گی وہ سب "خود مختار اقتدار اعلیٰ کی مالک ہوں گی"۔ اس موقع پر مسٹر جناح نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم صاف لفظوں میں ہندوستان کی آزادی کے طالب ہیں لیکن یہ آزادی سارے ہندوستان کی آزادی ہو کسی ایک گروہ یا کانگریسی ٹولی کی آزادی نہ ہو جس کے پردہ میں مسلمان اور ہندوستان کی دوسری اقلیتیں غلام نہ بنائی جائیں۔ جمہوریت کا کوئی اصول لیگ کے اس مطالبہ کے منافی نہیں ہے۔ یہ مطالبہ دراصل ان مسلم عوام کی آزادی کا مطالبہ ہے جو جلیانوالہ باغ میں ہندو اور سکھوں کے ساتھ انگریزی گولیوں کے سامنے سینہ سپر کھڑے تھے جنہوں نے خلافت اور کانگریس کی ۱۹۲۰ء کی تحریک میں انگریزی جیل خانوں کو بھر دیا تھا اور جو قصہ خوانی بازار میں انگریزی گولیوں کی بوچھاڑ میں آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے آج وہ مسلم عوام لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہیں اور ان کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی مسلم لیگ کر رہی ہے۔

مسلم لیگ دراصل ہندوستان کی قومی تحریک آزادی کی پیداوار ہے یہاں اس حقیقت کو ہمیں کسی وقت بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ مسلم قوموں کی آزادی کا مطالبہ اور ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ ایک ہی وسیع تحریک آزادی کے دو پہلو ہیں جس طرح ہندوستان کے عوام برطانوی شہنشاہیت سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہندوستان میں بسنے والی ہر قوم کی یہ خواہش ہے کہ ان کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ اپنے حلقوں میں آزاد ہوں۔ قوموں کی آزادی کے مطالبہ کو مان لینے سے ہندوستان ہرگز ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوگا بلکہ اسی طرح روادارانہ اور مساویانہ بنیادوں پر تمام ہندوستانی قوموں کا اتحاد ہوگا اور یہ اتحاد زبردستی کے اتحاد سے ہزار گنا مضبوط اور پائیدار ہوگا۔ بیرونی حملہ آوروں سے بچاؤ کے لئے بلاشبہ اتحاد کی ضرورت ہے اور یہ کوئی ناممکن بات نہیں۔ سوویٹ روس کی شاندار مثال ہمارے سامنے ہے جہاں ہر قوم کو اپنے حلقوں میں آزادی حق خود اختیاری اور حق علیحدگی حاصل ہے۔ اور پھر وہ (۱۶ آزاد ریاستیں) بیرونی حملہ آوروں کے خلاف ایک متحدہ محاذ پیش کرتی رہی ہیں یہاں پر اس امر کی وضاحت کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ اس وقت بھی ہندوستان کی فوج میں مسلمانوں کا تناسب ۵۵ فی صدی ہے۔

اس ملک کے کروڑوں انسان جب وقت "پاکستان ہمارا حق ہے"
کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو
کبھی اور نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ اس ملک کی ہر قوم کو آزاد ہندوستان
میں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے اور اپنے تخیلات
کے مطابق اپنے حلقوں اور حدود میں آزاد جمہوری ریاستیں بنانے
کا حق حاصل ہونا چاہیئے - آئیے ذرا مسلم حلقوں کے اعداد و شمار
کا مطالعہ کریں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب میں اگر انبالہ ڈویژن کو
علیحدہ کر دیا جائے تو مسلمانوں کی آبادی ۶۰ فی صدی ہے (بقیہ میں
۱۴ فی صدی سکھ اور ۲۶ فی صدی ہندو ہیں) اور صوبہ سندھ میں
۷۱ فی صدی بلوچستان میں ۸۷ فی صدی سرحد میں ۹۲ فی صدی
اور انبالہ ڈویژن کو علیحدہ کر کے بقیہ شمال مغرب کے پورے مسلم
حلقہ میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۷۷ فی صدی ہے - اسی طرح
مشرقی بنگال (جس میں بنگال کا زیادہ حصہ شامل ہے) میں اگر
آسام کے سلہٹ اور گوالپاڑا کے مسلم ضلعوں کا الحاق کر دیا جائے
تو ستر ہزار مربع میل کی چار کروڑ کی آبادی میں ۷۰ فی صدی مسلم
اکثریت ہے - ۱۹۴۵ء کے صوبائی اور مرکزی انتخاب کے موقعہ پر
لیگ نے اپنا "منشور" "صرف مسلمانوں کے آزاد جمہوری ریاستیں
(پاکستان) قائم کیا تھا - اور اسی نام پر مسلم عوام سے ووٹ
مانگے تھے - لیگ کو صوبائی انتخابات میں ۹۵ فی صدی اور
مرکزی انتخاب میں سو فی صدی کامیابی حاصل ہوئی یہ ووٹ
دراصل پاکستان کے لئے تھے - دنیا کے کسی ملک کی جمہوری اور
سیاسی پارٹی کو آج تک اتنی بڑی اکثریت میں کامیابی
حاصل نہیں ہوئی - انتخابات کا یہ نتیجہ مسلمانوں کے احساسات
وجذبات اور ارادوں کا پورا ترجمان ہے -

بعض حلقوں کی طرف سے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ پاکستان اقتصادی
حیثیت سے بدحال رہے گا اور اس کی آمدنی کے ذرائع اتنے نہیں
ہوں گے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے - مناسب ہوگا کہ

کہ آزاد پاکستانی حلقوں کا عوام کے ہاتھ میں ایک خود مختار ریاست
کی حیثیت سے چنگی - ایکسائز ڈیوٹی - نمک - کرنسی - ڈاک تار
نیز ریلوے کی آمدنی ہوگی - چار آزاد مسلم ریاستوں سے موازنہ کیجئے

سالانہ آمدنی	ریاست
۱۴ کروڑ	ترکی
۳۵ کروڑ	مصر
۱۵ کروڑ	ایران
۹ کروڑ	افغانستان
۵۳ کروڑ	مغربی پاکستان
۳۵ کروڑ	مشرقی پاکستان

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس اعتراض کے وقت ثبوت میں
بلوچستان صوبہ سرحد اور سندھ کو پیش کیا جاتا ہے کہ وہ
مرکزی حکومت سے قرض لے کر کام چلاتے ہیں لیکن حقائق اس
سے مختلف جواب رکھتے ہیں -

آئیے ان حلقوں کی حالت کا بھی جائزہ لیں سب سے پہلے بلوچستان
اور صوبہ سرحد کو لیجئے جن کو مجموعی طور سے ۱½ کروڑ روپیہ مرکزی
حکومت سے لینا پڑتا ہے لیکن یہ روپیہ ان کو اپنے یہاں کے
اندرونی نظام کے لئے درکار نہیں ہوتا - صوبہ سرحد کے ۱۹۴۲ء کے
اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ۲ کروڑ ۴۴ لاکھ کے اخراجات میں سے
۴۴ لاکھ ۸۵ ہزار روپیہ سیاسی مقصد پر خرچ ہوا - ایک کروڑ
۲۷ لاکھ روپیہ سرحد کے حفاظتی انتظامات پر - ۳۴ لاکھ
روپیہ پولیس پر اور ۲۸ لاکھ ۱۴ ہزار روپیہ سول کاموں کے لئے
اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ ان اخراجات کا بڑا حصہ دراصل مرکزی
حکومت کے محکمہ مدافعت سے تعلق رکھتا ہے -

سندھ کو اپنے زائد خرچ کے لئے ایک کروڑ روپیہ سالانہ
لینا پڑتا ہے - ماہرین کا اندازہ ہے کہ بیراج اسکیم کا نفاذ عمل
آنے سے نہ صرف یہ خسارہ پورا ہو جائے گا بلکہ آمدنی بڑھ جائے

دریائے سندھ کے پانی سے پیداوار کے قابل زمینوں کو سیراب کرنے سے نہ صرف پانی کا ٹیکس حاصل ہوگا بلکہ پیداوار سے مالگزاری بھی حاصل ہوگی۔ سندھ کے اس خسارہ کو گنوانے والے اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اس وقت سندھ سے کروڑ ۲۶ لاکھ روپیہ چنگی اور انکم ٹیکس کی صورت میں مرکزی حکومت کو دے رہا ہے ریلوے کی آمدنی اس کے علاوہ ہے جو سندھ کے علاقے سے مرکزی حکومت کو حاصل ہوتی ہے اگر اس کا بیس فی صدی بھی سندھ کو دے دیا جائے تو اس کے اخراجات نہایت آسانی سے پورے ہو جاتے ہیں پاکستان کی ایک آزاد وحدت کی صورت میں یہ کل آمدنی سندھ کی ہوگی۔

اگر ہم مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کا نفسیاتی طور سے جائزہ لیں تو ہمیں وہ جذبہ صادق نظر آ جائے گا۔ جس نے اس مطالبے کو اس قدر تقویت دی ہے۔ وہ ہے اپنی پستی کا احساس اور اپنی معاشی بدحالی اور اس کا مداوا وہ صرف اسی طرح دیکھتے ہیں کہ اپنی وحدتیں بنا کر اپنی اقتصادی حالت کو نہ صرف بہتر بنایا جائے بلکہ دنیا کی دوسری قوتوں کی طرح ترقی کے میدان میں آگے بڑھا جائے اور یہ ترقی بغیر حد بندی کے قطعی ناممکن ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہندوستان میں صنعتی فروغ ہوا اور اس سے ایک سرمایہ دار قوت کے باعث صرف ہندو مستفید ہوئے کانپور۔ احمد آباد۔ بمبئی۔ مدراس اور ہندوستان کے دیگر مقامات پر بڑے بڑے صنعتی مراکز قائم ہوئے ان سب کے خالق ہندو تھے اور ان خالق نے ہندوستان میں اس مال کی فروخت اور تقسیم کے لئے جس مخلوق کو منتخب کیا وہ بھی ہندو تھے۔

آج متحدہ ہندوستان اور ایک مرکزی حکومت کی صورت میں مرکزی حکومت ایک اقتصادی نقشے بندی کرے گی۔ اس وقت جب کہ ہندوستان کی کیفیت یہ ہے کہ ہندو اکثریت والے علاقے صنعتی اعتبار سے بہت آگے ہیں اور مسلم علاقے صنعتی اعتبار سے بالکل ویران پڑے ہیں مرکز میں اکثریت کی حکومت قائم ہونے کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ اپنے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو برقرار رکھنے کے لئے نقشہ بندی کے وقت اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ صنعتی ترقی یافتہ علاقوں کی نہ صرف مرکزیت برقرار رہے بلکہ وہ برابر ترقی کرتے رہیں پھر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ باقی ماندہ علاقوں کو کچا سامان مہیا کرنے کا ذریعہ بنایا جائے اور کچے مال کی کھپت کی منڈی قرار دیا جائے ایسی صورت میں مسلم اکثریت والے صوبوں کا استحصال کیا جاتا رہے گا ان کی بدحالی قائم رہے گی اور مسلم علاقوں کی دولت ہندو علاقوں کو برابر منتقل ہوتی رہے گی۔

یہاں یہ امر یقیناً قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے سیاسی رہنما قائد اعظم محمد علی جناح مسلمانوں کی آزاد جمہوری ریاستوں (پاکستان) کے لئے اپنے ذہن میں ایک نہایت ترقی پسند خاکہ رکھتے ہیں۔

۰۰ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوشی ایٹڈ پریس ءامریکہ کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ "پاکستان جمہوری ریاستیں ہوں گی"۔ "پاکستان کی جملہ وحدتیں خود مختار ہوں گی۔ اقتصادی حیثیت سے پاکستان کی ریاستیں دنیا کی مضبوط ترین ریاستوں میں سے ہوں گی"۔ انہوں نے فرمایا "ہمارے پیش نظر ایک شاندار مستقبل ہے"۔ "پٹرول، لوہا، گندھک، کوئلہ، اور دیگر معدنیات کے خزائن اس وقت بھی ہمارے سامنے آ چکے ہیں"۔

"پنجاب میں دنیا کا سب سے بڑا ہیڈرو الیکٹرک پاور اسٹیشن قائم ہو سکے گا جو نہ صرف دیہی علاقوں کی زرعی پیداوار میں انقلاب عظیم پیدا کرے گا بلکہ صنعتی پروگرام کو ترقی دینے میں بڑا معاون ثابت ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اس ترقی کے دور میں تمام بنیادی صنعتیں اور عوام کے کام آنے والے ادارے جمہوری ریاست کے ملکیت قرار دئے جائیں گے"۔

لیکن قائد اعظم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جس وقت ہندوستان

آزاد نہ ہو پاکستان ہیں بن سکتا اسلئے اب اپنے سیاسی پس منظر پر ایک نظر پھر ڈالیں۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۶ء تک ہندوستان کی کیفیت ناٹک کے ایک اسٹیج کی سی رہی ہے جس میں تماشہ دکھا کر کھلاڑی جاتے رہے اور آتے رہے۔ کرپس تشریف لائے اور مسکرا مسکرا کر میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے۔ لیکن شطرنج کی بساط پہان کے ہاتھ کی حرکت ڈاؤننگ ہاؤس کے اشاروں کے مطابق تھی۔ شملہ کانفرنس ہوئی سامراج شاہی کا گماشتہ دونوں سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں کو علیحدہ علیحدہ خلوت میں بلا کر محبت بھری باتیں کرتا رہا اور جب دونوں اس کو اپنا عاشق صادق" سمجھنے لگے تو الوداع کہتا ہوا داغ مفارقت دے گیا۔ اس دل سوزی کے لیے کچھ دلجوئی کی ضرورت تھی۔ پارلیمنٹری ڈیلیگیشن آیا وہ متحدہ ہندوستان کے گیت بھی گاتا تھا اور پاکستان کے حق میں قصیدہ خوانی بھی کرتا تھا۔ گاندھی جی کی روحانی کرامات، ابو الکلام آزاد کی علمیت اور مسٹر جناح کی سیاسی سمجھ بوجھ ہر ایک کی تعریف کی۔ ہر ایک کے راگ الاپتا ہر ایک کو خوش کرتا۔ مسخروں کا کامیاب پارٹ ادا کرتا چلا گیا۔ ہندوستان کی قوموں کو کافی عرصہ تک بیوقوف بنانے کے باوجود برطانی ملوکیت کے خلاف بے پناہ جذبہ تھا۔ آپس کے اتحاد کی باتیں ہونے لگی تھیں کہ کیبنٹ مشن کو بھیجا گیا اس نے نہایت عیاری سے ہندوستان میں بسنے والی اقوام کا رخ برطانیہ کی طرف سے موڑ کر ایک دوسرے کی طرف کر دیا۔ اور فتح و کامرانی کے جھنڈے اڑاتا لندن سدھارا۔

انگریزی سامراج اپنی عادت کے مطابق ابتدا سے اس وقت تک مکاری اور فتنہ پردازی سے کام لیتا رہا ہے یہ تو وہ بھی سمجھتا ہے کہ ہندوستان کی قومیں اس حد تک بیدار ہو چکی ہیں کہ ان کو اب زیادہ دیر تک غلام نہیں رکھا جا سکتا اس لئے ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے اور ان کی قوتوں کو مختلف محاذ پر بانٹے رکھنے میں ان کی جیت ہے سامنے اس کے لئے وہ ہر وقت ہر طرح کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں۔

یہ بات ہم خوب اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ انگریز مسلمانوں کی آزاد جمہوری ریاستیں آسانی سے نہیں بننے دیگا بلکہ اس کو آزادی کی مشترکہ لڑائی کے بعد ہی حاصل کیا جا سکے گا۔

آج کے حالات میں ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کو بھی یہ دیکھنا چاہیے کہ اسی ملک کی ایک چوتھائی آبادی کو آزادی کی اس آخری جنگ میں جو برطانی ملوکیت کو دفن کرنے کے لئے لڑی جانے والی ہے کیسے شریک کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ آج اگر اس حقیقت سے روگشتی کی گئی تو جنگ عظیم ثانی کی پیدا کردہ خلش آزادی اور عوام کا بڑھتے ہوئے جوش و خروش سے مناسب فائدہ نہ اٹھایا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کو اسی شعور جو پروان چڑھ چکا ہے عہد طفلی کی طرف لوٹ جائے گا۔

(س۔ ل)

پرچھائیاں

کچھ چہرے جو میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ھیں

(۱)

مسکراتی ہوئی ایک مشفق و ہمدرد عورت
ناتواں — بوڑھی — ضعیف!
جاگ کر جو کاٹ دیا کرتی تھی۔
اُف وہ جاڑے کی سیاہ، سرد، وہ لمبی راتیں!
میں اگر کچھ بھی جو بیمار ہوا۔
میری آیا — وہ مجھے دودھ پلانے والی —!
کون تھا میرا اس کا؟

۲

خوب غصیل — بڑے سرخ — بڑے موٹے سے
میرے استاد — کہ قرآن پڑھایا مجھ کو۔
سب کو ہی مارتے تھے مجھ کو کبھی کچھ نہ کہا۔
کیوں کہ میں ان کے لئے روز چھپا کر گھر سے
کچھ نہ کچھ باندھ کے لیجاتا نذر کرنے کو۔
پان — خربوزے — ملیح آباد کے آم!

۳

میرے کوچہ میں سرِ شام چلا آتا تھا۔
ایک اندھا کبابی — کہ وہ بیچارا غریب —
ہم شریروں سے تو بے حد تنگ تھا۔
اس پہ پل پڑتے تھے ہم سب مل کر۔
اور جھپٹ لیتے تھے سارا چھپا۔

اور وہ اندھا غریب
چیختا، گالیاں دیتا رہ جاتا ہیں۔

۴

ایک بڑی پیاری سی ننھی لڑکی
اُس کی آنکھوں میں سمندر کی سی نیلاہٹ تھی۔
آمنہ — وہ میرے بچپن کی شریک!
اُف وہ بچپن کی سہانی یادیں —!
کھیل ہی کھیل میں ہم شادی رچانے لگتے تھے
وہ تو بن جاتی دلہن گھونگھٹ منہ پر آنچل —
اور میں دولہا — کوئی موٹا سا لڑکا قاضی۔
اور لوگ دیکھتے ہی دیکھتے گھر بس جاتا۔
آہ — مگر وقت کے تند اور اتھاہ دھارے
لے گئے ہم کو بہا کے الگ سمتوں میں
کون جانے کہ کہاں ہے اب وہ؟

۵

میرا ہم مکتب و ہمدم — وہ میرا دوست خلیل۔
کیسا خوش خلق، شریر اور ہنس مکھ۔
دیئے ہاتھوں میں ہاتھ ساتھ پھرا کرتے تھے۔
لمحہ بھر کو بھی جدا ہونا تھا کتنا دشوار
ہم نے یہ عہد کیا تھا کہ سدا ساتھ رہیں گے دونوں۔
وہ مگر عہد کا کچا نکلا — پھیر لیں یوں نظریں جیسے کہ کچھ تعلق ہی نہیں
مجھ کو تنہا ہی یہاں چھوڑ کے وہ چل بھی دیا۔
میں نے دیکھی ہے وہ ننھی سی لحد
اور اس مٹی کے تودے پر اُگا ایک مہکدار حسیں سرخ گلاب۔

طاہرہ بیگم

چور!

گرمی کی ایک اداس اور اندھیری شام کو دل افروز کے مغربی گوشے والے کہکشاں نامی کمرے میں جیا قرمزی کے گدے بچھے ہوئے لاجورد رنگ کے صوفے پر بیٹھی ایک انگریزی ناول پڑھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اچانک دروازہ کھلا اور روحی خلاف عادت چپ چاپ آرام کرسی پر دھنس گئی۔

"کیا ہوا روحی" — میں نے اس کے سنہرے بالوں پر پھونک مارتے ہوئے کہا۔

"کم بخت تم تو ہر وقت مطالعہ کے عذاب میں گرفتار رہتی ہو اور ادھر عارف نجمی کو نگلنے کی فکر میں لگا ہوا ہے"

"تمہیں معلوم ہے میں ان سطحی باتوں سے ہمیشہ بیزار رہتی ہوں — اور میں نے غصے سے ناول دور پھینک دیا —— اور پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"کیوں نہ دادا ابا سے شکایت کی جائے" روحی نے ناراضگی کے لہجے میں کہا۔

"مگر آخر کوئی وجہ بھی —— اگر عارف اور نجمی شادی کے لئے تیار ہیں تو ہمارا دخل دینا بالکل حماقت ہے"

"خوب — اور ہماری چیزیں جو نجمی کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں وہ بھی بلا سے" روحی نے کہا۔

"ہائیں" اور میں گھبرا کے کھڑی ہو گئی۔

"جی وہ آپ کے ہیرے جڑے بندے جو ڈان ڈی تارلس سے تم نے ساحل سسلی پر خریدے تھے اور وہ قیمتی ہیرے کا ہار جس کے خاطر تم نے اپنی پیاری سہیلی فلک پیما سے لڑائی مول لی۔ سبھی کے نجمی کی نذر ہو چکے ہیں۔ خود میری شہزادی بشیر کی کتابیں اور تاشقندی سوداگر سے خریدی ہوئی تین آسمانی ساڑیاں غائب ہیں"

"روحی" — میں بے قرار ہو کے چلائی "خدا کے واسطے کوئی حل سوچو۔ میں تباہ ہو گئی برباد ہو گئی"

"دادا ابا سے شکایت" روحی کا مختصر جواب تھا۔

"لیکن دادا ابا سے شکایت اور وہ بھی عارف کی۔ کوئی معمولی بات تو نہیں روحی ڈیر"

میں سوچ میں پڑ گئی۔

"اچھا تم یہ گلدان دینے کا وعدہ کرو تو میں دادا ابا سے شکایت کرنے کو تیار ہوں"

میں نے میز کی طرف گھوم کر دیکھا — "ارے صرف دو گلدان بقیہ دو کہاں گئے"

"نجمی کی نذر ہو چکے ہیں —— آج صبح عارف کو میں نے تمہارے کمرے سے لیجاتے دیکھا تھا۔ اور وہ تمہارا چاندی والا سیف جو تمہارا فرانسیسی سے منگوایا تھا اور وہ نقرئی فریم جس میں تمہارا فوٹو لگا ہوا تھا اب اس میں نجمی کا فوٹو لگا ہوا ہے"

میں دوڑ کر گلدان اٹھالائی — رد حی خدا کے واسطے تم یہ لیجاؤ لیکن عارف نے میرا وہ نقرئی فریم دلوا دو — وہ میرے ایک دوست کی نشانی ہے۔

ردحی نے مسکرا کر دونوں گلدان اٹھا لیے — اب ایک فریم تو کیا میں تمہاری تمام چیزیں دلوا دوں گی۔

دوسرے دن جو میں کسی کام سے دادا ابا کے کمرے کی طرف گئی تو ردحی اُن کے پیٹ پر لوٹ لوٹ کر عارف کی شکایت کر رہی تھی۔ میں سننے کی غرض سے دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی — لیکن اف بدبخت ردحی وہ تو مجھے ہی ذبح کرنے کی فکر میں تھی — میں کہہ رہی تھی۔

"دادا ابا۔ عارف کی شادی کر دیجئے نا۔"

دادا ابا ہنسے "ہاں میری چڑیا میں تمہاری شادی عارف سے ضرور کر دوں گا۔"

ردحی دادا ابا کے پیٹ پر بیٹھ گئی — "لیکن دادا ابا میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ میں تمام عمر آپ کی خدمت کروں گی اور شادی نہیں کرنے کی۔"

ہا ہا ہا دادا ابا بری طرح ہنسنے لگے۔

"آپ عارف کی شادی نیلوفر سے کر دیجئے نا۔"

یا اللہ وہ پاگل تو میری ساری جائداد ایک دن میں نیلام کر دے گا مجھے ردحی کی بیہودگی پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ میں سر پکڑ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

شام کو ردحی اور عارف میرے کمرے میں آ دھمکے۔ "ارے بھئی چلو شادی کے لئے کچھ سامان وغیرہ خرید لائیں" عارف نے کہا۔

"ردحی میں چلاتی — "یہ تم نے کیا کیا — میں عارف سے ہرگز شادی نہیں کرنے کی۔"

عارف مسکرایا۔ "لیکن بھئی اگر تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی تو ردحی کا کیا بنے گا۔ میرے پاس تو تم جانتی ہو ایک پیسہ بھی نہیں ہے اور ردحی بغیر دولت شادی کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اس لئے میرا ارادہ ہے پہلے تم سے شادی کروں اور جب تمہارا کروڑوں روپیہ میرے ہاتھ آ جائے تو ردحی سے —"

میں نے کتاب اٹھا کر اس کے منہ پر دے ماری۔ عارف میرے برابر والی کرسی پر آ بیٹھا۔

"اچھا بھئی میں پانچ ہزار پر فیصلہ کرنے کو تیار ہوں۔" عارف نے کہا۔

"وہ کیسے" میں نے ترشی سے دریافت کیا۔

"ردحی اتنی سخت گرمی برداشت نہیں کر سکتی وہ کشمیر جانا چاہتی ہے اور میرے پاس پیسہ نہیں ہے۔ تمہارے بندے اور نکلس فروخت کر کے کاروبار کے لئے کچھ روپیہ بنک میں جمع کرا دیا ہے۔ تمہارے کل کے گلدان جو ردحی نے اپنی خداداد ذہانت سے حاصل کئے تھے بیچ دئے گئے لیکن چند جوڑے کپڑے سے زیادہ کفیل نہ ہو سکے۔ اب اگر تم پانچ ہزار دیدو تو ہم اطمینان سے کشمیر کی دلکش وادیوں میں ہنی مون منا آئیں اور پھر کون کرتا ہے تم ایسی مزدور لڑکی سے شادی۔"

میں نے چپ چاپ پانچ ہزار کا چیک اُن کے ہاتھ میں دے دیا اور وہ ہنستے ہوئے چلے گئے۔

[illegible] لیکن کتنے کامیاب اور کتنے ترقی پسند۔

[illegible] ماہنامہ [illegible]

رفتارِ زمانہ

عبدالہی
سابق ... جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر (دہلی)

نوّے سال پہلے انگریزی سنگینوں کی مدد سے ہرایا جانے والا آزادی کا جھنڈا فضاؤں میں گم ہوجانے کے لئے آخری ہلکورے لے رہا ہے افق پر شفق پھولی ہوئی ہے۔ سرزمین ہند دو لوں درجانب داروں کی اتحادوں کی بجائے منتظر جماعت تبدیلیوں کا پُرعظمت منظر پیش کررہی ہے۔ کانگرس کہتی ہے انگریز جلے گا۔ مسلم لیگ کہتی ہے انگریز جا رہا ہے۔ انگریز کہتا ہے کہ وہ جا رہا ہے۔ سامراجیوں کی اس تبدیلی کو دیکھ کر ہر ایک دماغ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ کانگرس اور مسلم لیگ تو عوام ترجمان کی حیثیت سے جو کچھ کہہ رہی ہیں وہ ٹھیک ہے۔ لیکن زمین کے ان مالکوں نے انقلاب میں آزادی مدد کئے پیدا ہوگئی کہ اس ملک پر قبضہ رکھنے کے لئے کوئی بھی نئی انسانیت حرکت اٹھا کر نہ رکھی تھی۔ آج اس کو محض ہم آزاد کر رہے ہیں کہ ہندوستانی اپنی حکومت خود بنانا چاہتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے پس منظر پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہے۔ انگریزی شہنشاہیت کے ہندوستان سے دو بڑے مقاصد وابستہ تھے۔ ایک اقتصادی لوٹ دوسرا مشرقی وسطیٰ پر اقتدار۔ موجودہ حالات کچھ ایسے بدل گئے ہیں کہ گرشنشاہیت کا ڈھانچہ ہی رہتا ہے تو یہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے بلکہ الٹی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً اقتصادیات کو لیجئے۔ غیر منظم اور گرے ہوئے ہندوستان پر انگریز کا یہاں کے تمام وسائل پر قبضہ تھا۔ وہ ہندوستان سے ہر طرح تجارت کے ذریعہ ٹیکسوں کے نام سے، نوجوانوں سے ضبطیوں کے بہانے دولت لوٹتا تھا۔ اور اپنے شہنشاہی کارخانے کو چلاتا تھا۔ لیکن آج حالت یہ ہے کہ ہندوستانی ہر شعبہ زندگی میں منظم ہیں ان کو اندھا دھند لوٹا نہیں جاسکتا۔ ان سے ٹیکس اور دیگر ذرائع آمدنی سے جو کچھ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا بڑا حصہ ان کی فلاح بہبود یا اُن کے مصروف رکھنے پر خرچ کرنا ضروری ہے۔ ہندوستانیوں نے انگریزی راج کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔ اس لئے ایک کثیر رقم ان نوجوں پر صرف کرنی پڑتی ہے جو حکومت قائم رکھنے میں مدد دیں۔ پھر ہندوستان کو بیرونی حملوں سے بچانے کا سوال۔ انگریز اس بات کو خوب سمجھتا ہے کہ اس ملک کے قبضے والے اس وجہ نالاں ہیں کہ ہر ایک بیرونی طاقت کو ان کے اس جذبے سے مدد ملتی ہے اس کے لئے آمدنی کا بڑا حصہ صرف کرنا پڑتا ہے۔

حکومت کے انتظامی شعبہ جات کے آمد و خرچ کا اندازہ ہم سنٹرل اسمبلی کے بجٹ سے لگا سکتے ہیں جو گزشتہ سالوں سے ڈیڑھ دو ارب سالانہ سال گھاٹے میں جا رہا ہے۔ اس کمی کو اب تک ہندوستانیوں سے قرض لیکر پورا کیا جاتا رہا۔ لوٹ کا دوسرا ذریعہ تجارت ہے۔ اس سلسلہ میں ہندوستانی کافی مضبوط ہیں۔ ان کی اپنی صنعت و حرفت اس درجہ پر ہے کہ ولایتی تجارت کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ حالات کے معمول پر آتے ہی وہ مقابلہ پر نہیں ٹھہر سکتی۔ جہاں تک مشرق وسطیٰ پر قبضہ رکھنے کا سوال ہے وہ بھی ان حالات میں بے معنی ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا ملک جس پر اقتدار برقرار رکھنا مشکل ہے۔ کیا امداد کرسکتا ہے بلکہ الٹا یہ خطرہ درپیش ہے کہ ہندوستان کی سیاسی تحریکات اپنی مضبوطی کے لحاظ سے اتنی اہمیت رکھتی ہیں کہ ان ممالک کے جذبۂ آزادی کو براہ راست مدد دیں گی اور کسی بھی ایسے عالمگیری جدوجہد کے پیدا ہوجانے کا ہر وقت امکان ہے جس کا ایک سرا انڈونیشیا میں ہوگا تو دوسرا مصر میں جس کا ایک ہی دھچکا برطانوی شہنشاہیت کو ہمیشہ کے لئے فنا کے گھاٹ اتار دیگا۔ پرانے تعمیر شدہ ڈھانچے حکومت چلانے سے ملی فائدہ نہ تو حکومت سے حاصل ہوتا ہے نہ تجارت سے بلکہ وہ تمام قرضہ ادا کرنے کا بار سر پر ہے جو اب تک لے کر کام چلا

گئے۔ موجودہ حالت میں ہندوستانی سرمایہ [illegible] سے عدم تعاون کی بنا پر حکومت کوئی بڑی نقشہ بندی نہیں کر سکتی جس کے ذریعے عوام [illegible] ہونے والی بیکاری کو روک سکے جو بر دست انقلاب کا پیش خیمہ بنا کر [illegible] چلی آ رہی ہے، ورنہ ہندوستانیوں کی دلی نفرت کے سبب کسی بھی وقت اس کے خلاف ایک [illegible] تحریک پیدا کر سکتی جو مشرق لیبیا قریب کو اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔ اور اس کے وجود کو مٹا دے گی۔

انگریز کہتا ہے کہ وہ جا رہا ہے [illegible] ان حالات میں اگر سامراجی [illegible] نعرہ لگانے لگے ہیں تو یہ ان کی ایمانداری نہیں بلکہ مجبوری ہے لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ آج بھی اپنے نقاب کے [illegible] کچھ کر سکتے ہیں [illegible] کلائیو۔ گلیڈ اسٹون، میکالے کی جگہ اٹلی، لارنس، کرپس اور [illegible] لیں کے جانے [illegible] وہ فطرت نہیں بدل سکتی وہ آج بھی شہنشاہیت کی بقا کی کوشش میں مصروف ہیں ان کی سب سے بڑی عیاری ان کا [illegible] ہے [illegible] ستانی جنگجوؤں کے [illegible] کے [illegible] ان کے [illegible] طرف سے ہٹ کر ایک دوسرے کی طرف ہو گئے ہیں۔ اس موقعہ [illegible] ایسی شرائط سے [illegible] چاہتا ہے جو اس کی شہنشاہیت کو مزید ایک سو سال تک چلنے میں مدد دیں

وہ کہتا ہے کہ ہندوستان [illegible] کو تجارتی [illegible] دی جائیں۔ وہ اس [illegible] بڑی بڑی کمپنیاں قائم کر سکیں اس طرح وہ [illegible] اور [illegible] زندگی کے شعبہ حیات میں اثر رکھ سکیں [illegible] اور ملک کی اقتصادیات میں ان کا ایک درجہ ہو اور اس [illegible] ہندوستانیوں کی [illegible] انگلستان بھیجی جا سکیں۔ دوسری طرف [illegible] سارے مشرقی منڈیوں کو اپنے جال میں پھنسا رکھیں۔ ہندوستان کے بچاؤ کے [illegible] انگلستان [illegible] رکھنے کا حق ہوگا جس کا پورا خرچ ہندوستان کو برداشت کرنا پڑے گا

یہ فوج ہندوستان کی سلامتی کی [illegible] وہ تو ظاہر ہے البتہ برطانوی سرمایہ داروں کی حفاظت اور مشرقی ممالک کی [illegible] کی ذمہ دار ہوگی۔ اس کے [illegible] انگریزی [illegible] ہندوستانیوں کے [illegible] کا نظم و نسق سونپ دے گا جس کو وہ اب خود چلانے کا [illegible] ہے [illegible] وہ سب کچھ حاصل کرلے گا جو وہ حکومت کے [illegible] حاصل نہیں کر سکتا۔

انگریز جانتا ہے کہ [illegible] زیادہ [illegible] جماعت [illegible] کانگریس پر ہے [illegible] مجبوریوں کو جانتی ہے۔ اس کو [illegible] تاریخ [illegible] تنظیم پر بھروسہ ہے۔ آج اس کا ہر قدم انگریز کے [illegible] اٹھ رہا ہے۔ کانگریس نے ان کی سامراجی روایات کو [illegible] آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ کانگریس میں گاندھی [illegible] اس کی ایمانداری پر بھروسہ کئے ہوئے [illegible] نظر آتے ہیں کہ جو کچھ بھی [illegible] کے ہاتھ میں [illegible] کا نتیجہ ملک میں جماعتوں کو انفرادی خیال کا بیج و پیدا ہو گیا۔ ہندوستان کی ہر قوم [illegible] کہ کانگریس ایک قوم [illegible] اقوامِ ہند کو غلام بنانا چاہتی ہے۔

کیبنٹ مشن نے آئندہ کے ہندوستان کے لئے والیان ریاست کو شامل کرکے ایک قانون بنانے کی جو اسکیم پیش کی تھی [illegible] تھا۔ کہ ہندوستان کی ذمہ دار جماعت کی حیثیت سے اس پر اعتراض کرتی اور اس شیطانی چال کو توڑنے کے لئے مسلم لیگ [illegible] لیکن اس نے آپس کی رقابت کے پیش نظر اس کو منظور کر لیا۔ اس طرح سے انگریز کو بچا کر خود زد پر آ گئی آج کانگریس [illegible] کامل کی لڑائی کے بجائے ایک طرف تو انگریزوں کو نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے مشرق پر قبضہ رکھنے میں مدد دے رہی بلکہ [illegible] بڑی قوموں یعنی مسلمان اور اچھوتوں کو دبائے رکھنے کا کام بھی کر رہی ہے کیا ہمارا ملک ایسی آزادی چاہتا تھا۔ یا اسے [illegible]
[illegible]

کہہ سکتے ہیں اس کا جواب ہم کو غلامی کی زنجیروں کا وہ کساؤ دے گا جو مستقبل میں ہمارے گرد اور کس جائے گا۔

انگریز کو جانا پڑے گا ۔ مسلم لیگ نے یہ کوئی نیا نعرہ بلند نہیں کیا بلکہ مسلمانوں نے یہ نعرہ انگریزی سامراج کا سایہ دیکھ ہی بلند کر دیا تھا۔ پلاسی میں دھوکے سے ہرایا گیا۔ سرنگاپٹم کی خاک لالہ زار بنا دی گئی۔ [illegible] دہلی اس کی لاشوں سے پاٹ دیے گئے، روہیل کھنڈ کے میدانوں میں اس کے خرمن جلے گھر مسمار ہوئے [illegible] مستاصل کیا گیا لیکن یہ نعرہ بند نہ ہوا۔ جب جلیانوالہ باغ میں اس نے کمی اور کاسی تو انگریز کی سنگینوں پر سے [illegible] دیا۔ [illegible] نے قصہ خوانی بازار میں اپنے خون سے وہ داستان لکھی جس کی رنگینی قیامت تک ختم نہ ہوگی [illegible] آزادی کی سربلندی اور وطن عزیز کا استقلال رہا ہے جس جماعت نے اس کی ترجمانی کی وہ [illegible] آج ہمیں بڑی حیرت ہوتی ہے کہ مسلم لیگ نے چونکہ جماعت کے نام سے کوئی [illegible] آزادی اور سربلندی کی ترجمانی کا حق نہیں۔ اعتراض کرنے والے اس حقیقت سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ مسلمان [illegible] ہمت اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان منظم ہو کر اپنی تنظیم کے نام سے اپنا حق منوانا چاہتے ہیں [illegible] قربانیوں کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کی قربانیاں کیسے فراموش کی جا سکتی ہیں [illegible] کیا جا سکتا ہے کہ وہ انگریز دل سے دشمنی کا سبب تھی مسلم قوم کی آزادی کا جذبہ [illegible] تھا

مسلم لیگ نے [illegible] کا تہیہ کر لیا ہے۔ مسلمان اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ انگریز اپنی شہنشاہیت کو برقرار رکھنے [illegible] سے کام لیتے ہیں۔ آج وہ ہندوستان اور مشرق کے علاقہ جات پر قبضہ رکھنے کے لئے [illegible] کارفرما ہیں تو دوسری طرف لیڈروں کی وجاہتیں تھیں۔ [illegible] ایک ہی راستہ تھا کہ اس زہریلے درخت کی جڑ پر کلہاڑا چلایا جائے [illegible] مسلم لیگ نے [illegible] یہ اعلان کر کے اس نیت کی ایک زبردست خدمت کی ہے لیکن یہ اعلان [illegible] عملی قدم اس کے ساتھ ہی بروئے کار لانے کی ذمہ داری ہمارے لیڈر لے چکے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تنظیم قائم رکھیں۔ [illegible] ناکامی کا سبب ہماری عدم تنظیم رہا ہے ہم اکثر بے موقع جوش میں آنے سے نقصان اٹھا چکے ہیں [illegible] ہیں۔ تجربات ہمارے سامنے ہیں ہم کو پکے ارادے کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔ ہمیں اپنے رہنماؤں سے پورا [illegible] تاریخی کارنامہ کو انجام دینا ہے جس کا پورے مشرق کو انتظار ہے۔

ڈائرکٹ ایکشن کے لئے تیار رہئے

اسلام کی حفاظت کے لئے مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے کھڑے ہو کر آپ کو سب کچھ قربان کرنا ہے

گرلز اسکول سب کمیٹی

(زیر سرپرستی انجمن وکیل قوم پنجابیان)

۱۔ خان بہادر حاجی حافظ محمد صدیق صاحب ملتانی (صدر)

۲۔ حاجی محمد دین صاحب (سیکریٹری)

۳۔ شیخ عمر الٰہی صاحب (نائب سیکریٹری)

۴۔ شیخ عبد السلام صاحب

۵۔ حاجی محمد صدیق صاحب ٹبلہ

۶۔ شیخ فضل مبین صاحب

۷۔ حاجی عبد الکریم صاحب ملتانی

ادارہ کا خیال ہے کہ خاص نمبر کے شائع ہونے [illegible] آپ اپنا فرض ادا کر چکیں ہوں گے۔

خاص نمبر ماہنامہ پنجابی گزٹ [illegible]

سلمان الارشد کہتا ہے۔ کہ

زندگی بجائے خود نہ رجائی ہے نہ قنوطی۔ بلکہ ایک مسلسل کشاکش اور پیہم جدوجہد ایک خوشگوار مستقبل کی رہنما بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ ترقی پسند ادیب ماحول کی تلخی کو اپنے ذہن کی بھٹی میں پگھلا کر اس طرح پیش کریں کہ انسانیت اپنی قدر و قیمت جان لے۔

"نئے تیور"

کے افسانے اِن ہی نقوش کے آئینہ دار ہیں۔

یہ کتاب ہندوستان کے حسب ذیل انقلابی اور ترقی پسند ادیبوں کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے:-

منظور احمد ، ارشاد چغتائی ، تصدیق سہاوری ، امین شرقپوری ، سلمان الارشد فاروقی ، سید محمد تقی ، وحشی آروی ، پرتھوی ناتھ شرما

مقدمہ سید حسن عسکری لکھ رہے ہیں۔

خاص نمبر ماہنامہ پنچایت کرنال ۱۹۴۶ء

منتظمہ کمیٹی

پنجابی اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول

۱۔ خانؒ بہادر حاجی حافظ محمد صدیق ملتانی (صدر)

۲۔ خانؒ بہادر حاجی رشید احمد صاحب

۳۔ شیخ عبد السلام صاحب (سکریٹری پنجابی اسلامیہ ہائی اسکول)

۴۔ شیخ عمر الٰہی صاحب (سکریٹری پنجابی اسکول شاخ باڑہ ہندوراؤ)

۵۔ شیخ فضل مبین صاحب (سکریٹری پنجابی اسکول پھاٹک حبش خاں دہلی)

۶۔ شیخ منظور احمد صاحب

۷۔ شیخ عبد المتین صاحب [انسلئے ادارہ کا خیال ہے کہ خاص نمبر کے شائع ہونے سے پیشتر آپ اپنا خطاب واپس کر چکے ہونگے۔]

۸۔ شیخ خلیل الرحمٰن صاحب

[illegible] پنجابی گزٹ [illegible]

منظور

اپنی انجم سے

(۱)

نئی دہلی کہ ہو روماں و محبت کی زمیں انجمؔ تجھے دیکھا تھا وہیں محوِ خرام

اپنی بھولی سی تھی سرخ دوپٹہ اوڑھے بصد اخلاص و محبت محوِ کلام

کیف بردوش نگاہیں جو اٹھائیں تو نے مِلا فی الفور مجھے تیری محبت کا پیام

کاش انجمؔ تو مجھے پھر وہیں ایک بار مِلے

(۲)

عشق اور مشک چھپائے سے چھپیں یا نہ چھپیں

تیری بے تابیٔ فطرت کا گلہ ہے مجھ کو

ہوں ناراض ہے احباب سے شکوہ سنجی

یہ تیرے عشق کا انعام ملا ہے مجھ کو

رضوی خیر آبادی

غریب الوطن کی عید!

آئی ہے [illegible] مثلِ بہارِ عید
یعنی ہے بے قرار دلوں کا قرارِ عید

گردش میں ہیں شرابِ مسرت کے جام پھر
ہر تشنہ کام خیر سے ہے شاد کام پھر

ہو دل [illegible] ہو غم سے بے نیاز
اہلِ جہاں ہیں فکرِ دو عالم سے بے نیاز

[illegible] ہے مبارک بلند آج
پہنے ہوئے لباس ہیں سب دلپسند آج

یوں عید کی خوشی [illegible] اک باغ باغ ہے
اہلِ زمین کا عرش پہ گویا دماغ ہے

ہمدم! نہ پوچھ مجھ سے کہ کیوں بے قرار ہوں!
یوں بے قرار ہوں کہ غریب الدیار ہوں۔

یوں آج آتا ہے مجھے پھر وطن کی یاد
بلبل کو جیسے آئے قفس میں چمن کی یاد

ہوں آہ دور عید کے دن بھی کسی سے میں
بیزار اسی لئے تو ہوں اب زندگی سے میں

کیا خاک ہمنشیں! ہو خوشی مجھ کو عید کی
پوری جب آرزو نہ ہوئی آہ دید کی

بن جائے کاش بادِ صبا نامہ بر مری
ان سے کہے کہ ڈھونڈ رہی ہے نظر مری

اتنا کسی کے نام ہے میرا پیامِ عید
کر لیجئے قبول خدارا سلامِ عید

تجھ کو دیکھ کر

یاد آئی ہے خدا کی شان تجھ کو دیکھ کر
ہو گیا تازہ مرا ایمان تجھ کو دیکھ کر

مطمئن ہیں کچھ امنگیں، آرزوئیں حسرتیں
دل کو چین آیا ترے قربان تجھ کو دیکھ کر

رہتا تھا افسردہ سا میں تیرے بغیر
جان میں آئی ہے گویا جان تجھ کو دیکھ کر

ہے غضب کا حسن تیرا جاذبِ قلب و نظر
دیکھتا رہ جائے ہے انسان تجھ کو دیکھ کر

مدعائے دل مرے ہونٹوں تک آ کر رہ گیا
کیا کہیں جاتے رہے [illegible]

ہجر میں تھا موت کا ہر لمحہ مجھ کو انتظار
ہو گئے جینے کے [illegible]

کاش دیکھے جائے ایسے خواب رضوی [illegible]
جاگ اٹھے سوئے ہوئے ارمان تجھ [illegible]

خاص نمبر ماہنامہ پنجابی [illegible] ۱۹۴۳ء

سلطان احمد

ایک مختصر ڈرامہ

ٹیگور کے ایک بنگالی افسانہ کا ترجمہ افسانہ
اردو ڈرامہ کے روپ میں

چٹکتی روحیں —!

کردار

سلیمہ بیگم — زینت بیگم — حضور جہاں پناہ

کنیز ساقی — اور خدام

(پہلی جھلک)

سلیمہ بیگم کے سنگ مرمر کے ستونوں اور رنگین محرابوں والے محل کا ایک پر تکلف دالان۔ خوشبوؤں اور ریشمی پردوں کے اڑتے ہوئے آنچلوں نے فضا کو بے حد رومانی بنا دیا ہے — ایک گرم شام ہے مگر روشن:

سلیمہ بیگم کچھ بیزار بیزار سی اپنی مسہری پر نیم دراز ہیں خوبصورت اور کمسن کنیز ساقی بربط کے تاروں کو چھیڑ رہی ہے اور فضا تھرتھرا اٹھتی ہے۔

سلیمہ۔ (بڑبڑاتے ہوئے) ہمیں خبر دو کب زینت — نہ ہم غم سے خالی

جلوس ہو چکا ملن، نہ تم خالی، نہ ہم خالی — اُف!

ساقی: (چونک کر) مجھ سے کچھ فرمایا حضور نے؟

سلیمہ: (چونک کر) نہیں تو اور وہ نہ جانے کیا کہہ گئے ہم ہے — طبیعت اداس اداس ہے کچھ دم گھٹ رہا ہے ہمارا — میری ساقی! محل کے سب دریچے اور کھڑکیاں کھول دے — مومی شمعیں روشن کر دے اور یہ نرم تکیئے میری کمر کے نیچے لگا دے — شاید کچھ سکون نصیب ہو — آہ! — (وقفہ) کیسی اندھیری راتیں ہیں اور کس قدر طویل —! جو کاٹے نہیں کٹتیں، در و دیوار کھانے کو آتے ہیں — اُف رے تنہائی —! ایسے میں ان طویل و عریض محلوں کے جالیں بھائیں کرتے دالانوں میں کس کا جی نہ اکتا جائیگا؟ بتا ساقی ہم کس سے بولیں چالیں؟ — اری تو ہی کچھ نہیں بول — آج تیری رباب کو کیا ہوا؟

ساقی (اداسی سے) گستاخی معاف — حضور کی توجہ نہ جانے کدھر ہے؟ میں ڈری کہ حضور کھٹک نہ دیں — کچھ دنوں سے حضور کچھ اداس اور کچھ کبھی کبھی سی نظر آ رہی ہیں — یہ میری بدنصیبی ہے کہ آپ سے اتنے قریب رہ کر بھی آپ کے دکھ درد سے واقف نہیں۔ کاش میں آپکے کسی کام آ سکتی۔

سلیمہ۔ بتا ساقی! — کبھی ہم نے تجھے کڑوے تیوروں سے دیکھا ہے؟ ایک تو ہی اس ویرانے میں ہمارے حال کی شریک ہے — اللہ کو معلوم ہے کہ ہم تجھے کس قدر عزیز رکھتے ہیں — کبھی تجھے کچھ کہا؟ کبھی تجھ سے اپنے دل کی بات چھپائی؟ تو ناحق دل میلا کرتی ہے۔ ہماری طبیعت تو کچھ اس سبب مکدر ہے کہ حضور جہاں پناہ کی توجہ ہم سے ہٹ کر کسی اور کے قبضے میں چلی گئی ہے — یہاں کشمیر کی حسین وادیوں میں لا کر ہمیں تنہا چھوڑ دیا ہے اور خبر نہیں لیتے۔ کئی دن ہوئے مگر حضور نے صورت تک نہیں دکھائی۔ زینت بیگم کے نصیب —! سرکار کی توجہ کچھ ادھر ہی ہے آجکل — (آہ سرد) خیر ہم بھی صبر کئے بیٹھے ہیں۔ اگر ہمارا جذبۂ محبت بھی سچا ہے تو ایک نہ ایک دن خود سے کھنچے چلے آئیں گے —!

ساقی (آہ سرد) آپکا دکھ بھی سچا ہے — بتوں کی بے پروائی یوں ہی اثر پایا کرتی ہے — محبت کہیں کا نہیں رکھتی — اور

اور وہ محبت جو پاؤں میں بیڑیاں ڈال دے، دل کہے آگے بڑھ اور مصلحتیں پاؤں پکڑ لیں — ہونٹ کچھ کہنا چاہیں اور پھر پھڑپھڑا کر رہ جائیں۔ آنکھیں اٹھیں اور جھک جھک جائیں۔ اُف وہ مجبور محبت!

سلیمہ۔ میرے آپ آ ساقی! — کیا تو بھی کسی کی محبت میں گرفتار ہے؟ کون ہے وہ؟ ہمیں اُس کا نام بتا — ہم اُسے طلب کریں گے اور اُس سے پوچھیں گے کہ وہ کیوں ہماری کنیز کا دل دکھا رہا ہے۔ اگر وہ پھر بھی نیا نہ ہوگا تو ہم اُسے مجبور کر دیں گے کہ وہ تجھے اپنے ساتھ لے لے۔

ساقی (گھبرا کر) نہیں نہیں حضور غلط سمجھ رہی ہیں — میں آپ کے قدموں سے دور نہیں جانا چاہتی۔

سلیمہ۔ تو جھوٹ بولتی ہے — ہم سے اپنے دل کی بات چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہم تیری آنکھوں میں اداسی اور بے چینی صاف دیکھ رہے ہیں۔ تیری کنپٹیاں دھک دھک کر رہی ہیں۔ تیرے گلابی ہونٹ کانپ کانپ کر رہ جاتے ہیں۔ کیا تو اس سے انکار کر سکتی ہے —— کیوں؟ آخر ایسا کیوں ہے؟ جب سے تو ہمارے حرم میں داخل ہوئی ہے کچھ کھوئی کھوئی سی اور چپ چاپ رہتی ہے۔ دوسری باندیوں کی طرح ہنستے بولتے یا آپس میں چہلیں کرتے ہم نے تجھے کبھی نہیں دیکھا۔ راتوں کو ہم نے تیرے رباب کی غمگین لے ہوا میں تیرتی سنی ہے — اور تیرے اداس گیت بھی —! جو مجھے ان نرم بچھونوں میں بھی بے چین کر دیتے ہیں — کیا اب بھی ہم یہی سمجھیں کہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے؟

ساقی۔ کیا اچھا ہوتا اگر آپ مجھے بتلانے پر مجبور نہ کرتیں۔ آپ مجبور کرتی ہیں تو سنئے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ محبت کی ہے اور صرف ایک ہستی سے — اور وہ ہیں آپ!

سلیمہ۔ ہم؟ — (بڑے زور سے ہنستی ہے) ہم مانتے ہیں ساقی! تو باتوں میں ٹال جانا خوب جانتی ہے۔

ساقی۔ کچھ سنئے گا؟

سلیمہ۔ ہاں کوئی ایسا نغمہ جو تیرے اور میرے تشنہ لبوں کو سکون بخش سکے — ہمارے پیاسے ہونٹوں کو تر کر دے اور میں سکون سے تھوڑی دیر سو سکوں۔

(ساقی رباب چھیڑ دیتی ہے اور جب تانیں اپنے شباب پہ آتی ہیں تو ایک گیت شروع کر دیتی ہے۔ جو بے حد اداس بھی ہے اور پُر تاثیر بھی۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکا میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں۔)

سلیمہ۔ بس بس ساقی یہ تو نے کیا چھیڑ دیا؟ نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں — [illegible]

ساقی:۔ آپ کو شربت دوں؟

سلیمہ:۔ ہاں ایک مختصر پیالہ — بس اتنا کہ لب تر ہو جائیں اور میں پینے کے بعد حلق میں انڈیل سکوں۔

(وقفہ — شیشے ٹکرانے اور شربت انڈیلنے کی آواز)

ساقی۔ نوش جان فرمائیے۔

(دو تین چسکیاں چڑھانے کی آواز — اور پیا منظر میں ستار کی دھیمی دھیمی،

سلیمہ۔ ساقی —! یہ تو نے ہمیں کیا ملا دیا؟ — ہماری آنکھیں مندھی جا رہی ہیں — ہم —؟ ہم چاہیں بھی تو آنکھیں کھلی نہیں — ہم گم ہوئے ہو رہے ہیں — تو — تو کہاں ہے ساقی؟ تو کہاں ہے؟

(آواز ڈوب جاتی ہے)

ساقی:۔ (دھیمے دھیمے قدم سے) کھلے دریچے [illegible] چل کر قالینوں پر پھیل گئی ہے۔ باغ کی روشوں میں گلاب [illegible] تیز جھک کے جھکے اٹھنے چلے آ رہے ہیں [illegible] اور شہزادی سو گئی ہے۔ نرم تکیوں میں سر رکھ کر —! وہ کتنی حسین نظر آ رہی ہے — اور کس قدر پُر جلال۔ مگر بے خبر! اُس کا لباس بے ترتیب ہے۔ اور ڈھلکی ڈھلک آئی ہے — [illegible] اور تیرے گلابی ہونٹ نیم وا — (گھبرا کر) یہاں [illegible] یہ مجھے کیا ہو رہا ہے — میرے اندر یہ کیسی خواہش کروٹ لے [illegible]

مجھ اپنے آپ پر قابو نہیں رہا — میں؟ — میں! (وقفہ —
بن میں ساقی گہرے گہرے سانس لیتی ہے اور پھر جھک کر سلیمہ بیگم
منہ چوم لیتی ہے — (یکایک جیسے بہت سے ستار جھنجھنا اٹھے ہوں -

شہنشاہ (ریشمی پردوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آکھڑے ہوتے ہیں)
شہنشاہ :- (گرج کر) کون ہو؟ ملکہ بیگم کی مسہری پہ کون جھکا ہوا ہے؟
— خبردار — بھاگنے کی کوشش مت کرو — کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ
کر وہیں کھڑے ہو جاؤ -

ساقی (کانپ کر) جہاں پناہ ! (اپنے قدموں پر جھک جاتی ہے)

شہنشاہ :- گستاخ چھوکری ؟ — کون ہے تو؟ - (گرج کر) معدوم!
(محلسرائے کی ڈیوڑھی کا محافظ معدوم دوڑتا ہوا آتا ہے)

معدوم :- (آداب بجا لا کر) حاضر باش جہاں پناہ !

شہنشاہ :- فانوس روشن کر دو — دریچے کھول دو اور باندی
کو کھینچ کر ہمارے قریب لاؤ -

ساقی :- (گڑگڑا کر) جہاں پناہ — جان کی امان دیجئے -!

شہنشاہ :- تم انکار کر سکتی ہو؟ ہم نے تمہیں ملکہ بیگم کی مسہری
پہ جھکا ہوا دیکھا ہے — سلیمہ کا منہ چومتے ہوئے — اس گستاخی
کا مطلب ؟

ساقی (لرز کر) جہاں پناہ — بخش دیجئے — خدارا بخش دیجئے

شہنشاہ :- (گرج کر) ہم کچھ نہیں سننا چاہتے - لیجاؤ اسے —

ساقی :- (یکایک سنبھل کر) جہاں پناہ کچھ بھی سزا دے لیجئے - مگر مجھے
ننگا نہ کیجئے — میں مرد ہوں -!!!

شہنشاہ :- مرد؟ — (چلا کر) بدبخت ! کون ہے تو؟ سلیمہ
کہاں ہے؟ اسے جگاؤ — ہم کہتے ہیں اُسے کھینچ کر کھڑا کر دو -

معدوم :- وہ بے سدھ پڑی ہیں -

شہنشاہ (کانپ کر) اف فاحشہ عورت - ہماری سمجھ میں
کچھ نہیں آرہا — ہم؟ — ہم کیا کریں؟ — معدوم! اس
بدبخت کو سنبھالتے ہوئے لیجاؤ اور سڑنے کے لئے زنداں میں ڈال دو
— سلیمہ جاگے تو اس سے کہہ دو کہ اب ہم اس کی صورت نہیں
دیکھنا چاہتے — بہتر ہو گا وہ کچھ کھا کے سو رہے — اس محل
کے دروازے پہ پہرے بٹھا دو - سلیمہ ہماری حراست میں ہے -!

دوسرا (۲) سین

(زینت بیگم کے محل کی خواب گاہ)

شہنشاہ :- (روندھے ہوئے گلے سے) خدایا -! تو بڑا غفور الرحیم ہے
سب ظاہر و باطن کو جانتا ہے - تجھ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں -
آج ہم ایک بڑی آزمائش میں مبتلا ہیں - ہماری رہنمائی کر —
ہمیں سیدھی سمجھ دے کہ غصہ میں ہم کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھیں ہمیں
ہمت دے تاکہ ہم اپنی کمزوریوں پر غالب آسکیں — آمین -!

زینت :- جہاں پناہ ؟ -

شہنشاہ :- تم زینت بیگم ؟ سوئی نہیں ابھی ؟

زینت :- دل کو دھڑکا سا لگا ہے جہاں پناہ — ڈرتی ہوں کہ نصیب اعدا
کہیں آپ کی تندرستی پر کوئی برا اثر نہ پڑے - جب بھی آنکھ کھلی آپ کو
سجدہ میں گڑگڑا گڑگڑا کر اللہ سے کچھ مانگتے پایا - بیچینی سے ادھر اُدھر ٹہلتے
ہوئے - بستر کی شکنیں بتلا رہی ہیں کہ حضور رات میں ایک لمحہ کو بھی نہیں
سو سکے ہیں -

شہنشاہ (آہ سرد) ہاں زینت بیگم — ہم بہت تھک گئے ہیں — آنکھوں
کے پپوٹے بوجھل ہیں اور دل ویران — مگر نیند کوسوں دور ہے - ہم کوشش
کے باوجود سو نہیں سکے - ہمیں بتاؤ بیگم کہ اس دنیا میں اپنے پرائے کی پہچان کیا
ہے -؟ کس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے - اور کس پہ نہیں کس کی
باتوں پر یقین کریں اور کس کو فریبی گردانیں؟ کیا آستینوں کے پالے ہوئے
سانپ موقع پا کر ڈس بھی لیا کرتے ہیں؟ اور اس طرح؟ —

زینت :- میں سمجھی نہیں جہاں پناہ —

جہاں پناہ :- ہم خود بھی نہیں جانتے یہ سب کچھ کیا ہوا؟ —
ہمیں سمجھنے دو - اپنے تصورات سے بغاوت کرنے دو — ہم کانپ

کانپ جاتے ہیں یہ سوچ کر کہ ہم نے بڑے بڑے منہ زور دشمنوں کے قلعے قمع کرتے پھرے، خطرناک سازشیوں سے لوہا منوا کے پھرے اور ان کی جڑیں تک اکھاڑ پھینکیں مگر جلنے کی کوشش کبھی نہ کی کہ خود ہمارے گھر میں ہمارے خلاف ایک بڑی سازش ہو رہی ہے۔ ہمارے سر پر تلوار لٹکتی رہی اور ہم پاؤں پھیلائے سویا کئے — ہم نے جسے اپنا سمجھا اسی نے ہماری کمر میں خنجر گھونپ دیا۔ ہماری محبت کو کھلونا بنایا گیا۔ ہمارے جذبات کو منہ چڑایا گیا ہماری وفاؤں کا گلا گھونٹ دیا گیا اور وہ بھی ہمارے سب سے محبوب حرم میں — ! ہم کیسے یقین کریں کہ سلیمہ نے ہمیں دھوکہ دیا — اس سلیمہ نے جو ہمارے انتظار میں جو کھٹ پر نظریں لگائے پہر لے گذار دیا کرتی تھی۔ جو ہمارے قدموں پر پلکیں بچھایا کرتی تھی۔

مگر ہم اس کا کیا کریں۔ کہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے اُسے شراب کے نشے میں دھت پڑے دیکھا ہے اور ایک نامحرم کو اس کی مسہری پر جھکے اس کا منہ چومتے ہوئے — ! اے اللہ، تو نے اس سے پہلے ہی ہمیں اٹھا کیوں نہ لیا؟ —

زینت:۔ صبح صادق نمودار ہو رہی ہے اب آپ کچھ دیر آرام کیجئے آپ کو سکون کی ضرورت ہے —!

(خادمہ اندر آتی ہے)

خادمہ:۔ (آداب بجا لا کر) جہاں پناہ کا اقبال بلند رہے۔ حرم سرا کا داروغہ فوری باریابی چاہتا ہے۔

زینت:۔ جہاں پناہ آرام میں ہیں — اس سے کہو پھر آئے۔

شہنشاہ:۔ نہیں بیگم — اسے آنے دو — تم ذرا ادھر ہٹ جاؤ —

(وقفہ — داروغہ گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

داروغہ:۔ (آداب بجا لا کر) جہاں پناہ کا اقبال بلند رہے — حرم سرا کی چاردیواری ایک تشویشناک خبر دے کر بھیجا گیا ہوں اجازت ہو تو عرض کروں! —

شہنشاہ:۔ جلد کہو —؟

داروغہ:۔ نورمحل کی باندیوں نے خبر دی ہے کہ حضور ملکہ سلیمہ بیگم نے اپنی

شہنشاہ:۔ جلد کہو —؟

داروغہ:۔ عرض کرتا ہوں — حضور ملکہ سلیمہ بیگم نے اپنی انگشتری کا ہیرا چاٹ لیا ہے اور اب ان کی حالت غیر ہے —!

شہنشاہ (چیخ کر) سلیمہ یہ تم نے کیا کیا —؟

(تیسرا سین)

(سلیمہ بیگم کے ایوان کا ایک دالان)

شہنشاہ:۔ (روندھے ہوئے گلے سے) سلیمہ یہ تم نے کیا کیا؟

سلیمہ:۔ جہاں پناہ — میں شرمندہ ہوں — آپ آئے ہیں اور بدن میں اتنی سکت نہیں کہ سروقد کھڑے ہو کر آپ کا استقبال کر سکوں۔ مجھے معاف کر دیجئے —

شہنشاہ:۔ (رو کر) سلیمہ — ہمیں شرمندہ نہ کرو۔

سلیمہ:۔ جی چاہتا ہے آپ سے بہت سی باتیں کروں مگر معلوم ہوتا ہے کہ اب اتنا وقت نہیں ہے — میری انتڑیاں کٹنے لگی ہیں، اور خون کی ننھی دھاریں میرے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے کونوں سے رس چلی ہیں — بس اتنا وقت ہے کہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنے قصور کی معافی چاہوں اور کہوں "مجھے درگذر کر دیجئے" —!

شہنشاہ:۔ سلیمہ۔ ہماری سلیمہ —!

سلیمہ:۔ میں نہیں جانتی کہ میری خطا کیا تھی؟ شاید اس روز جب آپ آئے تو میں سر پیر سے بے خبر گہری نیند میں گم تھی اور آپ کے استقبال کے لئے بیدار نہ ہو سکی — اسی پر شاید جہاں پناہ کبیدہ خاطر ہو کر واپس لوٹ گئے اور فرما گئے کہ سلیمہ اٹھے تو اس سے کہہ دو کہ اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ کچھ کھا کے سو رہے۔

شہنشاہ:۔ (چونک کر) سلیمہ؟ یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تو وہ سب کچھ کیا تھا؟ اف یہ ہم نے کیا کیا؟

سلیمہ:۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ میری عزیز کنیز ساقی بھی اسی جرم کی پاداش میں تاریک زنداں میں ڈال دی گئی ہے — آپ مجھے جو بھی سزا دیں مگر

آنکھوں پر۔ مجھے اُف کی مجال نہیں — مگر ہاتھ باندھ کر اتنا ضرور عرض کروں گی کہ ساقی بے قصور ہے۔ اُسے آزاد کر دیجئے۔

شہنشاہ :- تو کیا تم نہیں جانتیں کہ وہ کون ہے؟

سلیمہ :- وہ میری جانثار کنیز تھی اور میری سچی رفیق —! یہ دن میرا منہ تکا کرتی تھی۔ میری مسکراہٹ سے کھل اٹھتی تھی - اور میری کبیدہ خاطری سے اداس ہو جاتی تھی — اس کی خدمتوں کا یہ صلہ ہرگز نہ ہونا چاہیئے جو اسے دیا گیا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں دنیا سے شرمسار نہ جاؤں تو اسے آزاد کر دیجئے۔

شہنشاہ :- (روکر) ہماری سلیمہ — ہمارا دل پھٹا جا رہا ہے - ہم نے وہ جرم کیا ہے جو کبھی معاف نہ ہو سکے گا — ہم تمہارے مجرم ہیں - ہمیں سزا دو — ایسی سزا جو آج تک کسی نے دیکھی ہو نہ سنی ہو - دیکھو ہمیں معاف نہ کرنا — کہو سلیمہ میں نے آپ کو معاف نہیں کیا - کہو نا — کہو میں نے تجھے معاف نہیں کیا۔

سلیمہ :- خدا آپ کو صحیح سلامت رکھے۔ میں اور میرے خدا نے آپ کو معاف کیا —

شہنشاہ :- (چیخ کر) سلیمہ —!

(چوتھا سین : زندان خانہ)

شہنشاہ :- بدبخت انسان! کیا جاگتے ہو؟

ساقی :- کون؟

شہنشاہ :- تمہارا بادشاہ!

ساقی :- آپ؟ کیسے تشریف لائے؟ مجھے ہی کھینچ بلایا ہوتا کیا تعظیم کروں؟ اس اندھیری اور بدبودار کوٹھڑی میں۔ تو ٹاٹ کا بالشت بھر ٹکڑا بھی نہیں —!

شہنشاہ :- تمہاری کہانی جو نہیں سنا سکتی تھی وہ سننے آیا ہوں — سنا سکو گے؟

ساقی :- میری کہانی — کیا مرے منہ پر تھوکنے آئے ہیں — خدا کی قسم! یہ راز ہونٹوں پر کبھی نہ آ سکے گا۔ آپ چلے جائیں

شہنشاہ :- قیدی — اگر تم سنانا نہیں چاہتے تو مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تمہیں مجبور کروں۔ مگر سوچو تو کہ تمہاری خاموشی سلیمہ بیگم کی بدنامی کا سبب نہیں بن جائے گی؟ اگر نیچے لے ہیں — ہاتھ ہیں تو سلیمہ بیگم کے لئے تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہئے۔ —
— وہ مظلوم عورت!

ساقی - سلیمہ بیگم؟ — وہ بے قصور ہیں - وہ نہیں جانتی تھیں کہ ایک مرد عورت کے روپ میں ان سے اس قدر قریب موجود ہے۔
— خدا کی قسم وہ اتنی ہی پاکیزہ ہیں جیسے حضرت مریم —
آپ کا مجرم میں ہوں — مجھے سزا دیجئے۔

شہنشاہ :- ہم منتظر ہیں —!

ساقی :- سوچا تھا کہ یہ راز قبر میں ساتھ جائے گا - اللہ کی یہی مرضی ہے تو سنیئے — (وقفہ) — ہم ننھے ننھے سے تھے — میں اور سلیمہ! خوب کھیلتے کودتے تھے ہاتھوں میں ہاتھ دئے خوب گھومتے پھرتے تھے خوب باتیں کرتے تھے — سلیمہ کے نانا ابا کی حویلی اور ہمارے گھر میں بس ایک دیوار کا پردہ تھا اور پھر دونوں گھروں میں خوب اچھے تعلقات تھے — ہم آٹھوں پہر ساتھ ساتھ پھرنے پر ابا کبھی کبھی ناراض ہو جاتے اور ڈانٹتے بھی — مگر ہم کسی نہ کسی طرح آنکھ بچا کر روز ملتے گھر سے کچھ دور آموں کے ایک ننھے سے باغ کے ماہر مٹی کی مینڈھ پر بیٹھے ہوئے پہروں باتیں کیا کرتے۔ بہت باتیں — جانے کہاں کہاں کی —! باتیں ختم ہو جاتیں تو ٹکر ٹکر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگ جاتے — اور پھر خود بخود ہنس دیتے ——
— ایک اندھیری شام کو ہاتھوں میں ہاتھ دے کر ہم ننھی ننھی لڑکھڑاتی زبانوں سے عہد کیا کہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔
— سدا ساتھ رہیں گے اور ساتھ ہی مریں گے —! — سلیمہ اپنا دوپٹہ منہ پر کھینچ کر دلہن بن جاتی اور میں ننھا سا دولہا — پھر خود ہی دولہا بن کر پاس پاس ہو جاتے۔ یہ ہماری معصوم شادی تھی
— بے فکری اور مسرت کے دن اُڑتے چلے گئے — ہم نے ہوش سنبھالا

کانپ جاتے ہیں یہ سوچ کر کہ ہم نے بڑے منہ زور دشمنوں کے قلعے قمع کرتے پھرے، خطرناک سازشیوں سے لوہا منواتے پھرے اور ان کی جڑیں تک اکھاڑ پھینکیں مگر یہ حاسد کی کوشش کبھی نہ کی کہ خود ہمارے گھر میں ہمارے خلاف ایک بڑی سازش ہو رہی ہے۔ ہمارے سر پر تلوار لٹکتی رہی اور ہم پاؤں پھیلا کے سو گئے ۔ ہم نے جسے اپنا سمجھا اسی نے ہماری کمر میں چھرا گھونپ دیا۔ ہماری محبت کو کھلونا بنایا گیا۔ ہمارے جذبات کو منہ چڑایا گیا ہماری وفاؤں کا گلا گھونٹ دیا گیا اور وہ بھی ہمارے سب سے محبوب حرم میں ۔ ! ہم کیسے یقین کریں کہ سلیمہ نے ہمیں دھوکہ دیا ۔ اُس سلیمہ نے جو ہمارے انتظار میں چوکھٹ پر نظریں بچھائے پہر ہا گزار دیا کرتی تھی۔ جو ہمارے قدموں پر پلکیں بچھایا کرتی تھی۔

مگر ہم اس کا کیا کریں۔ کہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے اُسے شراب کے نشے میں دھت پڑے دیکھا ہے اور ایک نامحرم کو اس کی مسہری پر جھکے اس کا منہ چومتے ہوئے ۔ ! اے اللہ، تو نے اس سے پہلے ہی ہمیں اٹھا کیوں نہ لیا ۔

زینت :۔ صبح صادق نمودار ہو رہی ہے اب آپ کچھ دیر آرام کیجئے آپ کو سکون کی ضرورت ہے ۔!

(خادمہ اندر آتی ہے)

خادمہ :۔ (آداب بجا لا کر) جہاں پناہ کا اقبال بلند رہے۔ حرم سرا کا داروغہ فوری باریابی چاہتا ہے۔

زینت :۔ جہاں پناہ آرام میں ہیں ۔ اُس سے کہو پھر آئے۔

شہنشاہ :۔ نہیں بیگم ۔ اسے آنے دو ۔ تم ذرا ادھر ہٹ جاؤ ۔

(وقفہ ۔ داروغہ گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

داروغہ :۔ (آداب بجا لا کر) جہاں پناہ کا اقبال بلند رہے ۔ حرم سرا کی چاردیواری ایک تشویشناک خبر دے کر بھیجا گیا ہوں۔ اجازت ہو تو عرض کروں ! ۔

شہنشاہ :۔ جلد کہو ۔؟

داروغہ :۔ نور محل کی باندیوں نے خبر دی ہے کہ حضور ملکہ سلیمہ بیگم نے اپنی

شہنشاہ :۔ جلد کہو ۔؟

داروغہ :۔ عرض کرتا ہوں ۔ حضور ملکہ سلیمہ بیگم نے اپنی انگشتری کا ہیرا چاٹ لیا ہے اور اب ان کی حالت غیر ہے ۔!

شہنشاہ (چیخ کر) سلیمہ یہ تم نے کیا کیا ۔؟

تیسرا سین

(سلیمہ بیگم کے ایمان کا امتحان)

شہنشاہ :۔ (روندھے ہوئے گلے سے) سلیمہ یہ تم نے کیا کیا ؟

سلیمہ :۔ جہاں پناہ ۔ میں شرمندہ ہوں ۔ آپ آئے ہیں اور بدن میں اتنی سکت نہیں کہ سروقد کھڑی ہو کر آپ کا استقبال کر سکوں۔ مجھے معاف کر دیجئے ۔

شہنشاہ :۔ (رو کر) سلیمہ ۔ ہمیں شرمندہ نہ کرو۔

سلیمہ :۔ جی چاہتا ہے آپ سے بہت سی باتیں کروں مگر معلوم ہوتا ہے کہ اب اتنا وقت نہیں ہے ۔ میری انتڑیاں کٹنے لگی ہیں، اور خون کی ننھی دھاریں میرے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے کونوں سے رس چلی ہیں ۔ بس اتنا وقت ہے کہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنے قصور کی معافی چاہوں اور کہوں "مجھے درگزر کر دیجئے" ۔ !

شہنشاہ :۔ سلیمہ۔ ہماری سلیمہ ۔!

سلیمہ :۔ میں نہیں جانتی کہ میری خطا کیا تھی ؟ شاید اُس روز جب آپ آئے تو میں سر پیر سے بے خبر گہری نیند میں گم تھی اور آپ کے استقبال کے لئے بیدار نہ ہو سکی ۔ اسی پر شاید جہاں پناہ کبیدہ خاطر ہو کر واپس لوٹ گئے اور فرما گئے کہ سلیمہ اُٹھے تو اُس سے کہہ دو کہ اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ کچھ کھا کے سو رہے۔

شہنشاہ :۔ (چونک کر) سلیمہ ؟ یہ کیا کہہ رہی ہو ؟ تو وہ سب کچھ کیا تھا ؟ اف یہ ہم نے کیا کیا ؟

سلیمہ :۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ میری عزیز کنیز ساقی بھی اسی جرم کی پاداش میں تاریک زنداں میں ڈال دی گئی ہے ۔ آپ مجھے جو بھی سزا دیں مگر

آنکھوں پر۔ مجھو اُف کی مجال نہیں — مگر ہاتھ باندھ کر اتنا ضرور عرض کروں گی کہ ساقی بے قصور ہے — اُسے آزاد کر دیجئے۔

شہنشاہ:۔ تو کیا تم نہیں جانتیں کہ وہ کون ہے؟

سلیمہ:۔ وہ میری جانِ نثار کنیز تھی اور میری بچپن کی رفیق —! پہروں میرا منہ تکا کرتی تھی۔ میری مسکراہٹ سے کھل اٹھتی تھی۔ اور میری کبیدہ خاطری سے اداس ہو جاتی تھی — اس کی خدمتوں کا یہ صلہ ہرگز نہ ہونا چاہیئے جو اسے دیا گیا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں دنیا سے شرمسار نہ جاؤں تو اُسے آزاد کر دیجئے۔

شہنشاہ:۔ (روکر) ہماری سلیمہ — ہمارا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ ہم نے وہ جرم کیا ہے جو کبھی معاف نہ ہو سکے گا — ہم تمہارے مجرم ہیں۔ ہمیں سزا دو — ایسی سزا جو آج تک کسی نے دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ دیکھو ہمیں معاف نہ کرنا — کہو سلیمہ میں نے آپ کو معاف نہیں کیا۔ کہو نا — کہو میں نے تجھے معاف نہیں کیا۔

سلیمہ:۔ خدا آپ کو صحیح سلامت رکھے۔ میں اور میرے خدا نے آپ کو معاف کیا —

شہنشاہ:۔ (چیخ کر) سلیمہ —!

(چوتھا سین: زندان خانہ)

شہنشاہ:۔ بدبخت انسان! کیا جاگتے ہو؟

ساقی:۔ کون؟

شہنشاہ:۔ تمہارا بادشاہ!

ساقی:۔ آپ؟ کیسے تشریف لائے؟ مجھے ہی کھینچ بلایا ہوتا کیا تعظیم کروں؟ اس اندھیری اور بدبودار کوٹھری میں۔ تو ٹاٹ کا بالشت بھر ٹکڑا بھی نہیں —!

شہنشاہ:۔ تمہاری کہانی ادھوری تھی وہ سننے آیا ہوں — سناؤ گے؟

ساقی:۔ میری کہانی — کیا مرے منہ پر تھوکنے آئے ہیں — خدا کی قسم! جو راز ہونٹوں تک کبھی نہ آ سکے گا آپ چلے جائیں

شہنشاہ:۔ قیدی — اگر تم سنانا نہیں چاہتے تو مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تمہیں مجبور کروں۔ مگر سوچو تو کہ تمہاری خاموشی سلیمہ بیگم کی بدنامی کا سبب نہیں بن جائے گی؟ اگر اپنے لئے نہیں — ہاں کے لئے نہیں تو سلیمہ بیگم کے لئے تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہیئے۔ —

— وہ مظلوم عورت!

ساقی۔ سلیمہ بیگم؟ — وہ بے قصور ہیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ ایک مرد عورت کے روپ میں ان سے اس قدر قریب موجود ہے۔ — خدا کی قسم وہ اتنی ہی پاکیزہ ہیں جیسے حضرت مریم — آپ کا مجرم میں ہوں — مجھے سزا دیجئے۔

شہنشاہ:۔ ہم منتظر ہیں —!

ساقی:۔ سوچا تھا کہ یہ راز قبر میں ساتھ جائے گا۔ اللہ کی یہی مرضی ہے تو سنئے — (وقفہ) — ہم ننھے ننھے سے تھے — میں اور سلیمہ! خوب کھیلتے کودتے تھے ہاتھوں میں ہاتھ دئے خوب گھومتے پھرتے تھے خوب باتیں کرتے تھے — سلیمہ کے نانا ابا کی حویلی اور ہمارے گھر میں بس ایک دہلیز کا پردہ تھا اور پھر دونوں گھروں میں خوب اچھے تعلقات تھے — آٹھوں پہر ساتھ ساتھ پھرنے پر ابا کبھی کبھی ناراض ہو جاتے اور مارتے بھی — مگر ہم کسی نہ کسی طرح آنکھ بچا کر دور نکلتے گھر سے کچھ دور آموں کے ایک ننھے سے باغ کے اس پار مٹی کی مینڈ پر بیٹھے ہوئے پہروں باتیں کیا کرتے۔ بہت باتیں — جانے کہاں کہاں کی —! باتیں ختم ہو جاتیں تو ٹکر ٹکر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگ جاتے — اور پھر خود بخود ہنس دیتے ——————

— ایک اندھیری شام کو ہاتھوں میں ہاتھ دے کر ہم ننھی ننھی لڑکھڑاتی زبانوں سے عہد کیا کہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

— سدا ساتھ رہیں گے اور ساتھ ہی مریں گے۔! — سلیمہ اپنا دوپٹہ منہ پر کھینچ کر دلہن بن جاتی اور میں ننھا سا دولہا — پھر خود ہی دولہا بن کر پاس پاس ہو جاتے۔ یہ ہماری معصوم شادی تھی — بے فکری اور مسرت کے دن اڑتے چلے گئے — ہم نے ہوش سنبھالا

شروع کیا ــ اب ہماری ملاقاتوں میں وہ پہلی سی لاپرواہی اور بلنیازی نہ ہوتی تھی ۔ بلکہ کچھ جھجک، کچھ حجاب، کچھ گھبراہٹ سی سما ہم باتیں اب بھی کرتے مگر کم کم ۔ خاموش بیٹھے خلا میں گھورا کرتے ۔ مگر ہمیں اطمینان تھا کہ ہم ایک دوسرے سے دور نہیں ــــــــ

ــــــ مگر جلد ہی ایسے حالات سامنے آنے لگے کہ ہمیں اپنا تصور خواب بنتا نظر آیا ۔ سلیمہ کے ابا جان شہر چھوڑ کر کہیں دور جا بسنے کا ارادہ کرنے لگے ــــــــــــــ

ـــ ایک دن سامان چھکڑوں پر لاد دیا گیا ۔ اور وہ سب گھر والے کھلے کواڑ کھڑے ہوئے ۔ میرا دل اٹھا جا رہا تھا ۔ سلیمہ سے دو لمحوں کا بات کرنے کا موقع ملا ــ وہ بھی اداس تھی ــ

ــ میں نے اُس کا عہد یاد دلایا وہ رندھے ہوئے گلے سے بولی "میں مجبور ہوں" ! اور وہ چلی گئی ــ ! ــــــــ

میں ان لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھتا کھڑا رہ گیا ۔ دل رو رہا تھا ــــ طبیعت کو بہلانے کی بہتیری کوشش کی مگر وہ اچاٹ تھی ـــ دن گزرتے گئے مگر دل سے یاد محو نہ ہوتی تھی ۔ گھر والوں نے بہترا سر پٹکا، علاج معالجے کئے، میری شادی کی فکر کی مگر میں نے انکار کر دیا ۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ تمام زندگی یوں ہی گزار دوں گا ۔ مگر جب ان کا اصرار حد سے بڑھ گیا اور مجھے کوئی چارہ کار نظر نہ آیا ۔ تو ایک رات ستو ڈالے اور کھجوروں کی چھوٹی سی پوٹلی باندھ کر میں گھر سے نکل کھڑا ہوا ۔ ادھر کو منہ اٹھتا چلتا رہا ــ آخرکار میں نے کھوج نکالا ۔ ــــــــــــــــــ

مجھے معلوم ہوا کہ سلیمہ کے والد ترقی کر کے دربار میں اچھی حیثیت پا گئے ہیں ۔ ایک جھلک دیکھنے کی تمنا میں دل تڑپ گیا ۔ مگر قدم نہ اٹھے ــــ پھر اطلاع ملی کہ سلیمہ حرم میں داخل کر لی گئی ۔ مجھے صبر کرنا چاہئے تھا ۔ مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا ۔ میں نے ایک ذریعہ سے حرم تک رسائی حاصل کی اور اپنی کم عمری، خوش روئی اور صاف چہرے کی مدد سے ایک کنیز کے بھیس میں سلیمہ کے نزدیک تر پہنچ گیا ــــ اس کی صورت سامنے ہوتی تو دل کو قرار ہوتا ۔ بس اب مجھے کوئی تمنا نہ تھی ــ ارادہ تھا کہ زندگی اسی طرح نبھا دوں ــ مگر میری بے قراریاں رنگ لائیں ۔ دل کو مار چکا تھا مگر وہ چاندنی رات خوشبو، تارے، میرے دل کا جنون، خاموشی، تنہائی اور سلیمہ کا ہوش ربا حسن مجھے بہکا گئے ــ میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار ہو کر سلیمہ کی پیشانی چوم لی ۔ شربت کے پیالے میں نیند آور دوا میں پہلے سلیمہ کو پلا چکا تھا اور وہ بے سدھ پڑی تھی ــ ایسے موقعہ پر آپ نمودار ہو گئے ۔

اور آپ نے وہ سب کچھ دیکھا ۔ یہ تھی میری کہانی ــ اور بس ــ

شہنشاہ : (آواز رندھے ہوئے گلے سے) قیدی ۔ اپنے ہاتھ بڑھاؤ میں تیری زنجیریں خود اتاروں گا ــ تو بے قصور ہے ــ سلیمہ بھی بے قصور تھی دروازہ کھلا ہے ــ تم جا سکتے ہو ــ سنو ! کبھی کبھی ہمارے لئے بھی دعا کرنا کہ خدا ہمارے گناہوں کو معاف کر دے ــــــ میں بھی دعا کروں گا کہ خدا تمہاری بھٹکتی روحوں کو قرار نصیب کرے ۔ تم کو ــ اور سلیمہ کو وہ جہاں کہیں بھی ہو ــ !!! ۔

(پردہ گرتا ہے)

(عباسی)

تجارت

"اس کے کیا دام ہیں"
"آپ کے واسطے صرف پانچ روپے۔
ورنہ یہ مال تو بازار میں سستا نہیں
عورتیں اور بھی مل جائیں گی لیکن سرکار
آپ کی مست جوانی کی قسم
ایسی مل سکتی نہیں۔
میں نے تو دیکھے ہیں بازار
عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں"

"آپ کیا کام کیا کرتے ہیں؟"
"چند افسانے مضامین اور ڈرامے ناول۔
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ سب مال نکلا
آپ کو ذوقِ ادب ہے تو کہیں
پہلے کچھ اپنے نمونے تو ہمیں دکھلا دو۔
آپ نے چند رسالوں میں میرا نام تو دیکھا ہوگا۔
مجھ کو دفتر ہی سے فرصت نہیں ہے صاحب
تم سے پہلے ہی بازار میں بیچ آیا ہوں
اور اب اپنے خریدار کی مرضی سے
مدح کو مرثیہ کئے جاتا ہوں"

یہ جنوں آیا ہے شاعر کا دماغ
اس سے شعلے بھی اٹھا کرتے ہیں۔
اس پہ چاندی کا تم ایک خول چڑھا دو
کہ اگر شعلے اٹھیں کبھی تو دب جائیں یہیں۔
اور بازار کو نقصان نہ ہونے پائے"

"کون"؟
"مجھ کو بتنی کیا ہے تعارف کی ضرورت اب تک
میں کہ ایک قوم کی باگیں ہیں مرے ہاتھوں میں
اور وہ قوم جو طوفان اٹھا سکتی ہے
ایک لمحے میں گرا سکتی ہے یہ اونچے محل
لیکن اس میں قوم میں احساس نہیں۔
میں جو چاہوں تو یہ احساس جگا سکتا ہوں
آپ کو منہ مانگی ملے گی قیمت
اور وہ قوم کہ ہیں جس کے نمائندہ جناب
اب کبھی سر نہ اٹھانے پائے"

ہر طریقے سے قابل اعتماد

شیروانی اور سوٹنگ کا

کپڑا

پنجابی کلاتھ ملز لمیٹڈ کا تیار کردہ لیجئے

ہرگز نہ بھولیں

پی - سی - ایم دیکھ لیں

مٹر کے پلاؤ

سلمان الارشد فاروقی

زیر تحریر کتاب "پیچ و خم" کا ایک افسانہ

شیروانی اتار کر وہ بڑے شوق سے باورچی خانہ کی طرف بڑھا جہاں چولہے پر رکھی ہوئی ایک بڑی پتیلی اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ اس میں کوئی ایسی چیز پک رہی ہے جو نہ صرف پیٹ کی آگ بجھانے کا کام دے گی بلکہ ایک خاص لذت بھی مہیا کر سکے گی۔

اس خیالی غذا کے تصور نے اس کی زبان میں چٹخارے پیدا کر دیئے اسے خود بخود یہ یقین ہو گیا کہ اس پتیلی میں ضرور مٹر پلاؤ پک رہا ہے شاید اسی لئے بازار میں مٹر کی پھلیاں دیکھ کر اس کو خریدنے کے لئے وہ دن بھر رہا تھا مگر جیب میں دو آنہ بھی نہ نکلے کہ وہ اس کو خرید لیتا۔ مٹر بھی کیا چیز ہے معمولی سی، پھلی کے یہ چند دانے جس چیز میں ڈال دیئے جائیں وہ چیز اس قدر مزہ دار ہو جاتی ہے کہ نہ صرف زبان ہی محسوس کرتی ہے بلکہ روح کی قوت حس تک اس سے لطف اندوز ہوتی ہے ——— مٹر اسے بچپن ہی سے پسند تھے جب وہ بچہ تھا اس وقت بھی وہ ہفتہ میں اپنے ایک پیسہ کی مٹر کی پھلیاں خرید کر کھایا کرتا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں اس نے کبھی امرود، بیر یا چنے چرانے کی کوشش نہیں کی نہ اس نے کبھی املیاں توڑ کر کھائیں مگر جب کبھی کھیت میں اسے مٹر کی پھلیاں لگی نظر آ جاتیں تو وہ سب کچھ بھول جاتا اور چوری کو بری بات سمجھنے کے باوجود صرف ان قاتل اور ظالم پھلیوں کی وجہ سے چوری کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ اپنے گھر میں بھی مٹر پسند مشہور تھا۔ جس دن اس کی ماں مٹر پلاؤ پکاتی اس دن اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا اور یہ دن اس کے لئے کسی بڑے تہوار سے کم نہ ہوتا اس کا تو یہ دل چاہتا تھا کہ شب برات پر حلوے اور عید پر سویوں کی بجائے مٹر پلاؤ پکا کرے بھلا حلوے اور سویوں میں سوائے مٹھاس کے

اور رکھا ہی کیا ہے اور مٹھاس کی خواہش کی صورت میں تھوڑی سی شکر پھانک لینا اس کی رائے میں کافی تھا۔ شکر کا مصرف اس نے صرف چائے تک محدود کر دیا تھا۔

یکایک اس کی بیوی ہمسائی کے گھر سے واپس آ گئی اور اس کی التجا بھری نظروں کی مجبوری محسوس کر کے اس نے سوال کیا۔

"کھانا نکالوں؟"

"ہاں بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے اور یہ مٹر کی پھلیاں کہاں سے آ گئیں؟" اس نے بیتابانہ سوال کیا سوائے مٹر پلاؤ کے دنیا کی ہر چیز سے خالی الذہن ہو کر۔

"مٹر کی پھلیاں!" اس کی بیوی نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا "کیسی مٹر کی پھلیاں کہاں ہیں؟" اور متعجب ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی

"تو اس میں کیا ہے؟" اس نے پتیلی کی طرف اشارہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی بیوی کہے گی مٹر پلاؤ! مگر اس نے ذرا ترش لہجے میں جواب دیا۔

"ہوتا کیا؟ ——— سوکھے روٹی کے ٹکڑے ہیں تھوڑی سی پاؤ بھر ادھر کی دال ڈال کر اس کو پکایا ہے۔ پیٹ تو بھرے کسی طرح مجھ سے تو بچوں کی بلبلاہٹ نہیں دیکھی جاتی"

"روٹی کے سوکھے ٹکڑے!!" جیسے ایک حسین خواب دیکھتے دیکھتے یکایک اس کی آنکھ کھل گئی ہو۔

"کھانا کھائیں گے آپ!" اس کی بیوی نے اپنے پیٹ میں کھرچن محسوس کرتے ہوئے مکرر سوال کیا۔ "نہیں مجھے ابھی ایک جلسہ میں جانا ہے" وہ اپنی کھادی کی میلی شیروانی اور مسلی ہوئی کنٹوپ

ٹکٹ میں لگی ٹوپی پہن کر باہر آ گیا۔

جلسے سے تو وہ ابھی واپس آیا تھا جہاں تو اس نے صرف احتجاجاً ایکٹ کر دیا احتجاج بیوی کے مقابلے میں نہیں بلکہ خود اپنے مغالطے میں تھا کیونکہ اس کے دماغ میں تو سرٹیفکیٹ کا تصور بپا ہوا تھا —— گلی کے نکڑ پر وہ خاموش کھڑا ہو گیا۔

نیم کے درخت کے تنے میں بہت سے کتے کے پلے کلبلا رہے تھے کھوکھلے تنے میں ایک غار سا ہو گیا تھا کسی کتیا نے اس کو اپنا زچہ خانہ قرار دے لیا۔ اور بچے دیدیے۔ کتیا کا اس سے زیادہ آرام دہ اور کوئی زچہ خانہ نہیں ہو سکتا تھا شاید یہ کتیا کی قدامت اور رجعت پسندی کے خلاف بغاوت تھی مگر لیا وہ سوچتا —— وہ سوچنے لگا۔ لوگ اسے خواہ مخواہ باغی سمجھتے ہیں۔ حکومت کا دشمن تصور کرتے ہیں۔ ملک کا خادم اور قوم کا ہمدرد جان نثار اس کی [illegible] کرتے ہیں۔ صرف عزت افزائی کرنے میں کوئی روپے تھوڑی خرچ ہوتے ہیں حالانکہ نہ وہ باغی تھا نہ اسے حکومت سے کوئی بیر تھا۔ ملک کی خدمت کی تو اس نے کبھی اپنے میں ہمت نہیں پائی اور قوم کی ہمدردی کا تو وہ کالج میں اسی دن خیرباد کہہ چکا تھا جس دن اسٹرائک کے سلسلے میں اس کے ساتھیوں نے اس کے ساتھ غداری کر کے اسے کالج سے چار سال کے لئے نکلوا دیا تھا اب تو وہ پیٹ بھرتا ہے جب حکومت نے اسے کلرکی تک کا اہل نہیں سمجھا تو اس نے بقول اکبر الہ آبادی پڑھ لکھ کر لیڈر بننے اور دولت نہ چلنے سے پہلے ہی لیڈر بننے کی کوشش شروع کر دی تاکہ وہ ——

رنج لیڈر کو بہت ہی مگر آرام کے ساتھ! کا تجربہ کر سکے مگر مشکل یہ آن پڑی کہ لیڈری کی صنعت پر بھی سرمایہ دار قابض ہو چکا تھا اس لئے وہ سہارے لیڈر کے ایک مقامی قوم پرست جماعت کا اسسٹنٹ سکریٹری بن گیا اور قوم نے پچیس روپے ماہوار کی گراں قدر رقم دینا منظور کر کے گویا اس کی خدمات کا اعتراف کر لیا۔ اس کا اصلی عہدہ تو اسسٹنٹ سکریٹری تھا مگر عہدہ اور کام میں بہت فرق ہوتا ہے وہ تو دراصل والنٹیروں کا داروغہ تھا بالکل میونسپلٹی کے داروغہ صفائی کی طرح! حالانکہ میونسپلٹی کا داروغہ ہمیشہ داروغہ رہتا ہے اور مہتر کا کام وہ کبھی خود نہیں کرتا ہے۔ مگر اس کو والنٹیروں کی کمی کی صورت میں اکثر بہت سے کام والنٹیروں کی طرح خود کرنا پڑتے۔ مثلاً فرش بچھانا، ڈائس تیار کرنا، جلسے کا اعلان کرنا تقریروں کے درمیان میں زندہ باد کے فلک شگاف نعرے بلند کرنا اور کبھی کبھی بڑے بڑے لیڈروں کو پانی پلانا ان کے لئے بازار سے اعلیٰ و قیمتی سگریٹ لانا اور اکثر چائے بنانا مگر لالہ چیدی لال رئیس جو جماعت کے پریذیڈنٹ تھے ہمیشہ اس کی تعریف کرتے اور کہتے یہ بیچارہ قوم کا سچا خادم اور شمع آزادی کا سچا پروانہ ہے

وہ یہ سن کر مسکرا دیتا کیونکہ اس تعریف کے بعد بطور شکریہ اس کا مسکرانا فرض تھا یکایک اس کی آنکھوں کے سامنے قوم وہ ایک کتیا کی شکل میں پھیلنے لگا اور اسے محسوس ہوا کہ یہ سب اس کتیا کے بچے ہیں جو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دودھ پینے کی بجائے تو کاروں میں رہتے ہیں اور پھر اس کے تخیل میں لالہ چیدی لال اور ان کی نئی پندرہ ہزار روپے والی کار گھومنے لگی اس تیزی سے جیسے لالہ جی یہ کار خود اس کے دماغ میں چلا رہے ہوں۔ دوسری طرف جماعت کے سکریٹری حاجی نبی بخش سوداگر کی موٹر دوڑتی نظر آئی جو اکثر اس سے خوش رہتے تھے اکثر اس لئے کہ یہ خوشی ہمیشہ اس وقت ختم ہو جاتی جب کہ اس کی ویسے کبھی کبھی غیرت وغیرہ سے متاثر ہو کر کم ہو جاتی۔ یکایک اسے اپنے ذہن میں موٹروں کا ہولناک تصادم محسوس ہوا ——

مگر صدر اور سکریٹری مرنے کی بجائے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔

ہندو مسلم بھائی بھائی!

کی مکمل تفسیر بن کر اسے نفرت سے اپنے ذہن میں ان دونوں

دیکھ —!

کتے کے پلے ! ———

وہ بڑبڑایا —

سامنے رجیا کی کوٹھری نظر آرہی تھی۔ رجیا محلہ بھر کی سب سے حسین لڑکی تھی نل پر پانی بھرتے ہوئے اُس نے اُس پر اکثر اپنی حریصانہ نظریں پھینکیں مگر کامیابی نہیں ہوتی نہیں کیونکہ دن بھر وہ آوارہ ہوگئی جس کی آوارگی کی ساری ذمہ داری خود اس کے بھائی پر تھی۔ ایک ہی کوٹھری میں سارا خاندان رہتا تھا بالکل اسی طرح کلبلاتے ہوئے جیسے درخت کی کھوہ میں کتیا اور اس کے پلے! — بھائی کو نوکری کیا ملی گویا جوانی جاگ اٹھی اور جوانی کا جاگنا قیامت ہوگیا۔ قیامت تو قیامت ہوتی ہے نفسی نفسی کا عالم ہوتا ہے چنانچہ اسی نفسی نفسی میں اس نے شادی کرلی ایک ہی کوٹھری میں ایک طرف ماں باپ اور جوان بہن کا خدا نہ تھا اور دوسری طرف نصف کوٹھری میں ٹاٹ کا پردہ ڈال کر حجلۂ عروسی تیار کیا گیا۔

ٹاٹ کے پیچھے ہر شب کیا ہوتا رہا۔ رجیا اپنی نظروں سے تو نہ دیکھ سکی مگر ہلکی ہلکی لذیذ سسکیوں اور میٹھی میٹھی آہوں نے اس کی معصوم جوانی میں تھرتھری پیدا کردی بالکل ان سسکیوں کی طرح اس کی جوانی مرتعش ہوگئی اور بالآخر اس تلاش نے ایک دن سکون حاصل کرلیا۔ نجو کی آغوش رجیا کے لئے گہوارۂ سکون ثابت ہوئی

——— بھائی کے یہاں لڑکی پیدا ہونے کے دو ہی ماہ بعد رجیا کے ہاں ایک عجیب سا لڑکا ہوا۔ عجیب اس لئے کہ لوگوں نے اس لڑکے کو عجوبہ سمجھا۔ دور دور کے محلوں سے بڑے بوڑھوں نے آکر اس کو اس غور سے دیکھا جیسے وہ کسی فن کار کا کوئی خاص شاہکار ہو۔ بچہ کا خیال آتے ہی اُسے رجیا کی گود میں اس کا دودھ پیتا بچہ دکھائی دینے لگا اُسے وہ بالکل کسی اصیل کتے کا پلہ معلوم ہوتا تھا۔ عام کتوں کی طرح وہ بھی اپنے باپ کو نہیں پہچان سکتا تھا

کیونکہ رجیا کی منت وسماجت کے باوجود نجو نے اس سے شادی کرنے سے انکار کردیا۔ کیونکہ اگر وہ رجیا سے شادی کرلیتا تو اُس کے دونوں بڑے بھائی اُسے مار ڈالتے اُسے رہ رہ کر نجو اور اس کے بھائیوں پر غصہ آنے لگا ———

سالے کتے کے پلے ہیں ! ———

اس خیال نے اس کے غصہ کی تلخی کو بڑی حد تک کم کردیا۔ کتے کے پلے مختلف شکلوں میں اس کے ذہن میں گھومنے لگے، نیلے، کالے چتکبرے سفید، گتھی، کھورے، نئے نئے رنگ کے۔

"یہ گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے کس جلسہ کا انتظام کررہے ہو؟"

وہ بیوی کی آواز سن کر چونک پڑا۔ دروازہ میں سے اس کی بیوی آدھا جسم باہر نکالے اُسے دیکھ رہی تھی۔

وہ چپ چاپ کمرے میں داخل ہوگیا۔ بیوی نے کھانا سامنے رکھ دیا۔ رکابی کے اندر دال میں پڑے ہوئے روٹی کے ٹکڑے اُسے ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی بہت چھوٹی کتیا نے ننھے ننھے بچے دیئے ہوں ان کے جسم کے چاروں طرف آلائش لگی ہوئی ہے وہ بغیر کچھ سوچے ہوئے آنکھیں بند کرکے ان ٹکڑوں کو نگلنے لگا جیسے وہ واقعی "کتے کے پلے" کھا رہا ہو اور اسی لئے وہ ان کو اس ڈر سے نہیں چبا رہا تھا کہ کہیں وہ چیں چیں نہ کرنے لگیں۔ چند منٹ بعد اُس نے اپنی بائیں نصف آنکھ کھول کر دیکھا۔ اس کے دونوں بچے اُس کی بیوی کے دائیں بائیں خاموش بیٹھے ہوئے تھے اس وقت اُسے اپنی بیوی بالکل کتیا معلوم ہورہی تھی اور دونوں بچے اس کے پلے۔

یکایک اُسے محسوس ہوا جیسے وہ خود بھی کتا ہے !!

لیلیٰ لکھنوی

"نسرین"

میں کیسے کہوں نسرین نے میری زندگی تباہ کر دی ہے مجھے اجاڑ دیا میں تو اب بھی اس کو پیار کرتی ہوں اسی طرح جس طرح ہم دونوں کالج میں ایک دوسرے کو چاہتے تھے ہنستے تھے کھیلتے تھے اور ایک ہی کمرے میں سو جاتے تھے اسی طرح ہنستے کھیلتے کالج کا زمانہ ختم ہو گیا نسرین کی جدائی میرے لئے تکلیف دہ تھی میں ہر چیز میں کمی محسوس کرتی اب میں اپنے گھر میں بالکل اکیلی تھی سوائے ممی کے اور نسرین مجھ سے کوسوں دور —— ہم دونوں ایک دوسرے کو خط لکھا کرتے لمبے لمبے خطوط جو دنیا بھر کی باتوں سے پر ہوتے۔ ایک خط میں نسرین نے مجھے لکھا "بی اے تو کر لیا مگر اس کا فائدہ یہ ہے کہ بس اخبار یا کتابیں پڑھا کرتی ہوں۔ اور ممی نوکری نہیں کرنے دیتیں ہر وقت گھر میں بند ہوں بس پڑی رہتی ہوں اور ممی ایک اعلیٰ خاندان کے لڑکے کے لئے ہر وقت پریشان رہتی ہیں تاکہ وہ اپنی زندگی میں اپنی نسرین کو دلہن بنا دیکھ لیں اور چاہتی ہیں زندگی بھر اس بدھو کو رو دیا کروں جس کو میں جانتی تک نہیں کہ وہ ہیں کیسے، اُن کا مذاق کیا ہے اُن کے خیالات کیسے ہیں۔ اچھی نگار ذرا سوچو تو کس قدر ظلم ہے ہم ہمیشہ کے لئے اپنے جذبات و دل کے خلاف کام کرنے اور زندگی بھر کے لئے ذمہ داریاں اُٹھانے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں میں سوچتی ہوں میں ایسی شادی ہرگز نہ کروں گی جو میرے معیار کے مطابق نہ ہو۔ کہو آج کل کیا شغل ہیں ؟ کوئی رومانس تو نہیں کر رہی ہو؟ جو اتنے دیر کے بعد میرے خطوط کا جواب دیتی ہو؟" اور میں مسکرا اٹھی۔ تھا بھی کچھ ایسا ہی ایک ہفتہ سے میرے خالہ زاد بھائی آصف گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے میرے گھر آئے ہوئے تھے۔ کیا محبت کرنا واقعی عورت کی زندگی کا جز ہے؟ میں نے تو اپنی زندگی میں صرف نسرین اور ممی سے محبت کی تھی اُن کی آغوش میں مچل مچل کر سوئی تھی۔ جذبیں کی تھیں مگر معلوم نہ تھا کہ ایک مرد کی مسکراہٹ جس کو نگاہوں نے چاہا ہو اور دل نے اپنایا ہو عورت کو کس قدر مدہوش بنا دیتی ہے۔ جو نگاہیں کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر کچھ بھی نہ کہہ سکیں اگر بے خبری کے عالم میں کسی کو گھوریں تکا کریں اور وہ پھر چونک کر اُن نگاہوں کو دیکھ لے اور گھبرا کر کوئی بہانے سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور یہی حال آصف کا تھا اور پھر ایک روز وہ خاموش نگاہیں بول اٹھیں۔

"نگار اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا میں مر جاؤں گا"

"اور میں بھی تمہارے بغیر جی نہ سکوں گی آصف"۔

"پھر ہم دونوں شادی کیوں نہ کر لیں"۔

"آپ ممی سے کیوں نہیں کہتے"

"اگر انکار کر دیا تو ؟"

"تو میں زندہ نہ رہوں گی"۔ اور پھر اُسی کے کچھ مہینے بعد میری شادی آصف سے ہو گئی۔ اور میرا دل مسکرا دیا۔ ہم دونوں ملتے ہنستے تھے اور کائنات نغمہ زن تھی جیسے کہہ رہی ہو "آصف نگار" "آصف" ہم ایک دوسرے کو پیار کرتے مر جائیں گے۔

ایک سال بعد میری گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا۔ بالکل آصف کا جیسا وہی بڑی بڑی آنکھیں کتابی چہرہ اور سنہرے بال

ایک روز نسرین کا مجھے تار ملا کہ وہ صبح کی ٹرین سے لاہور آ رہی ہے اور میرے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی ۔ کالج کا ساتھ اور نسرین کی شریر نگاہیں ایک دم میرے سامنے آ گئیں ۔

" نسرین آ رہی ہے آصف "

" تو پھر میں کیا کروں "

" اُف آصف تم نہیں جانتے میں اُس کو کس قدر پیار کرتی ہوں "

صبح کی ٹرین سے نسرین کھٹ کھٹ کرتی آ گئی اور میں اُس سے چمٹ گئی ۔ کمبخت بالکل ویسی ہی لگ رہی تھی جیسے دو سال پہلے تھی ۔ میں نے نسرین سے آصف کا تعارف کراتے ہوئے پوچھا " کہو نسرین میری پسند کیسی ہے ؟ "

" تمہارے انتخاب پر داد دینے کو جی چاہتا ہے " نسرین پھر ہم تینوں ہنس دئے ۔

ایک ہفتہ بعد ہم لوگ پکنک پر گئے بہت تفریح رہی ۔ آم کے پیڑ میں جھولا پڑا تھا بیچ میں ہم لوگوں نے آصف کو بٹھایا ۔ میں نے اور نسرین نے پینگ بڑھانے شروع کئے اتنے لمبے لمبے پینگ بڑھا کہ ہم لوگوں کے سر شاخوں سے چھو جاتے تھے ۔ آصف گھبرا گھبرا کر کہہ رہے تھے خدا را بس کرو ورنہ زندہ گھر تک جانا مشکل ہے مگر نسرین نے ایک نہ سنی اور برابر پینگ بڑھاتی رہی پھر گانے کا پروگرام شروع ہوا ۔ نسرین نے حفیظ جالندھری کا گیت " جاگ سوز عشق جاگ " گایا جو ہم لوگوں نے بے حد پسند کیا ۔ شام کو ہم لوگ واپس آئے رات کو سخت بارش ہوئی ۔ بادل گھر گھر کر چھا گئے ۔ دوسری رات عارف کو نمونیہ ہو گیا ۔ رات بھر میں ببلا کے پلنگ کے پاس بیٹھی جاگا کی ۔ آصف اور نسرین سو چکے تھے جب عارف کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو میں پریشانی کے عالم میں آصف کو جگانے اُن کے کمرے میں گئی مگر ان کا پلنگ خالی تھا میں نے زور سے پکارا تو میری آنکھوں کے سامنے آصف نسرین کے کمرے سے گھبرائے ہوئے نکلے وہ ابھی تک رات کے کپڑوں میں ملبوس تھے مگر اس وقت مجھے ذرا

سا شک تک نہ ہوا کیونکہ میں عارف کی بیماری سے سخت پریشان تھی ۔ صبح پھر ڈاکٹر آئے مگر اس کی طبیعت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی ۔ قریب ۱۱ بجے میں سو گئی اور جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں سوائے عارف کے اور کوئی نہ تھا جو ابھی تک اکیلا پڑا کراہ رہا تھا میں نے گھبرا کر آنکھیں ملیں ۔۔۔ پھر میرے کانوں میں نسرین کی آواز آئی جو قریب ہی کے کمرے سے بول رہی تھی ۔

" ہٹیے بھی آپ بھی کس قدر شریر ہیں "

" سچ کہتا ہوں نسرین اب تو راتیں جاگ کر بسر ہوتی ہیں "

" اچھا تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے آپ کی نیند بھی چھین لی ہے "

" حقیقت تو یہ ہے نسرین میں پاگل ہو جاتا ہوں جس قدر میں تم سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں اسی قدر تم میرے قریب آتی جاتی ہو میں ہر طرح چاہتا ہوں کہ تمہارا خیال اپنے دل سے نکال دوں مگر اب تو یہ سب کچھ میرے بس کا نہیں " ۔

" آصف للہ یہ ۔۔۔ ورنہ ۔۔۔ سن چھوٹ جائے گا " ۔

" نسرین میری زندگی "

اور میرا سر چکرا گیا میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ یہ آصف بول رہے تھے وہ جو مجھ پر مرتے تھے میری یاد میں راتوں نظمیں لکھا کرتے تھے ۔ راتوں کو ٹہلا کرتے تھے اور میری ہر آہٹ پر چونک جاتے تھے جو مجھے چھپ چھپ کر دیکھا کرتے تھے اور آج وہ نسرین کو اپنی محبت کا یقین دلا رہے تھے مجھے اس کا احساس تک نہ رہا کہ نسرین کا شباب مجھے اُن سے جدا کر دے گا ۔ وہ شوہر ہوتے ہوئے بھی ایک مرد ہیں اور نسرین میری محبت اور خوشیوں کی راہ میں دیوار بن کر کھڑی ہو جائے اور پھر ۔۔۔ میں بلبلا کر اس سے چمٹ گئی وہ آخری بار ۔۔۔ دیا اور پھر ہمیشہ کے لئے سو گیا ۔ ننھی سی گردن تکیہ کے نیچے گر گئی اور میں روتی رہ گئی میری آغوش خالی ہو گئی اور پھر آصف بھی آئے اور نسرین بھی ہمانے نفرت سے

منہ پھیر لیا۔ نسرین نے اپنی گردن نیچی کر لی۔ آصف بار بار میرے
پاس آتے "نگار اب نہ روؤ دیکھو تو تم نے اپنی حالت کیا بنا لی" مگر
میری محبت نفرت سے بدل چکی تھی میں آصف کی زندگی میں حائل
ہونا نہیں چاہتی تھی اگر میری زندگی میں خزاں آ گئی تو کیا ہوا۔
دنیا کا دستور یہی ہے۔ انقلاب کا دوسرا نام ہے زندگی۔

دوسرے روز صبح نسرین اپنے گھر واپس جا رہی تھی۔
"نگار میں جا رہی ہوں" میں نے دیکھا اُس کی نگاہیں شرمندہ ہو رہی
تھیں "مجھے معاف کر دو"

"نسرین تم مجھ سے معافی مانگ رہی ہو۔ تمہیں معلوم ہے تم
نے مجھ سے میری زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی چیز چھین لی۔ میری
محبت میں کانٹا بن کر چبھ گئیں۔ اب مجھے آصف سے کوئی مطلب
نہیں میں آج شام کو اپنے گھر واپس جا رہی ہوں تم ہمیشہ کے
لئے اُن کے ساتھ رہ سکتی ہو"

"نگار للہ یہ نہ کہو"۔

"نسرین مجھے زیادہ نہ چھیڑو شاید میرے منہ سے کچھ ایسے الفاظ
نکل جائیں جو ہماری دوستی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں تم جا سکتی ہو"
نسرین کے جانے کے بعد کئی بار آصف میرے پاس آئے مگر
میں نے بات نہیں کی میں نے اُن سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ
نسرین کے ساتھ شادی کر لیں اب میں اُن کے ساتھ نہیں رہ سکتی
دو برس بعد میں نے سنا نسرین ٹی بی میں مر گئی وہ آصف
کی محبت میں فنا ہو گئی مگر سنت دی نہ کی کہ کہیں ہماری دوستی ہمیشہ
کے لئے نہ ختم ہو جائے اور میں نے اُس کو معاف کر دیا۔

لیلیٰ لکھنوی

کی شگفتہ تحریر سے لطف اندوز ہونا
چاہتے ہیں تو آپ کے افسانوں کا مجموعہ
"کرڑیاں" پڑھیئے۔

ادارہ تعارف

مونس شبیر:۔ قوم کی واحد بیدار مغز خاتون آپ کے مضامین میں
انقلابی رہنما کا تفکر اور فنکارانہ حسن پایا جاتا ہے۔

لیلیٰ لکھنوی:۔ ملک کی مشہور افسانہ نگار خاتون آپ نے عروس ادب
کی مشاطگی میں جمال و جلال کا حسین امتزاج پیدا کیا ہے۔

طاہرہ بیگم:۔ برادری کی نو آموز مضمون نگار آپ کے خیال میں
ندرت اور انداز نگارش میں لاابالی پن کی خفیف جھلک پائی جاتی ہے۔

ارشاد چغتائی:۔ ہندوستان کا ذہین نوجوان جس کو قدرت نے
فلسفیانہ شعور ودیعت کیا ہے ان دنوں آپ مختلف فلم کمپنیوں کے کنٹریکٹ لیتے ہیں

سلمان الارشد:۔ بے تاب اور مضطرب افسانہ نگار جنہ ماحول کی
شدت سے پریشان ہو کر متعدد بار اپنا دماغ فروخت کیا لیکن روح کی حفاظت کی

منیر انصاری:۔ نووارد افسانہ نگار آپ سنجیدہ اور مزاحیہ ہر
دو قسم کے اصناف پر حاوی ہونے کی سعی فرما رہے ہیں۔

عمر الٰہی:۔ قوم کا درِ یتیم۔ ترقی پسند۔ زاویہ نگاہ کا مالک۔ آپ
بے حد اصرار کے بعد مضمون لکھتے ہیں۔

عبد الٰہی:۔ قوم کا سیاسی مبصر آپ کے مضامین میں تعمق نگاہ
اور محاسبانہ سختی کے پہلو بہ پہلو ضبط فن کی ہم آہنگی قابلِ تعریف ہے۔

احمد سعید:۔ قوم کا وہ فرد جسے حصولِ علم سے عشق ہے
آپ کے مضامین انتہائی مدلل اور مبسوط ہوتے ہیں۔

یونس باغپتی:۔ قوم کا بیدار نوجوان۔ آپ کو ادبیات سے ایک
خاص لگاؤ ہے آپ کے افسانہ شگفتہ اور انوکھی طرز تحریر کے مالک ہوتے ہیں

جعفری:۔ ہندوستان کے واحد مزاحیہ شاعر آپ کے کلام میں
مزاح کے ساتھ مقصد اور اصلاح مدنظر ہوتی ہے۔

رضوی خیرآبادی:۔ آپ نے طرزِ قدیم میں جدید
خیالات کو سمویا ہے۔ عنقریب آپ کا دیوان شائع
ہو رہا ہے۔

ارشاد بیگ چغتائی

غیر فانی

(ایک ایسا مضمون جو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے نہیں ہے بلکہ نظر انداز کرنے کے لئے ہے ارشاد)

وہ ان آدمیوں سے تھا جو زندگی کی پیہم شکستوں بڑے بڑے صدموں اور اعتقادی طلسم شکنیوں کے ہاتھوں کبھی نہیں مرتے ، جو زندگی سے کبھی نفرت نہیں کرتے ۔ ہاں بوسیدہ عمارات ، بے روح انسان ۔ توہم پرست اعتقادات ، جبر مشیت بے پرواہ خدا ، ظالم تقدیر اور اندھے اقوال اسے پسند نہیں تھے ۔ وہ محدود ۔ مجبور حقیر اور مفلوک الحال زندگی سے اکتا گیا تھا ۔ اس کی روح ان بلندیوں پر پہنچنا چاہتی تھی جہاں موت اور مجبوری کی آغوش میں سونے والے عاجز رہ جاتے ہیں تغافل سے ۔ انا کی سچائی کی خاموشی اور محدود ذہانت کی بے حسی ، روح ارتقا کے لئے ایک کھلا چیلنج معلوم دیتی تھی ۔ . . . .

. . . .

اب تک اس کی داستان زندگی یہ تھی کہ اس کے خواب ٹوٹ گئے ۔ عقائد توہمات نکلے ۔ خدا خاموش رہا ۔ مجبور بہ تغافل برتتی رہی ۔ حکومتیں لٹیری بن گئیں ۔ دوست احباب اور رشتہ دار جنبی ثابت ہوئے . . . . . . لیکن اسے زندگی سے نفرت نہیں ہوئی ۔ زندگی کی یہ سرود انگیز کائناتی لہریں ہر شکست کے بعد اسے لوریاں دیتی ہیں جس طرح کوئی بچہ تھک کر ماں کی گود میں سو جائے ۔ سرمست اور ابدی لہریں احساسات کا روپ اختیار کر کے انسانی جسم میں قوت حیات ۔ لطفِ صحت اور سرمستی بن کر مسکراتی ہیں ۔ چنچل رہتی ۔ اور احساس جو کائنات میں گھلا ہوا ہے کبھی نہیں مرتا ۔ جسم مرجاتے ہیں لیکن یہ نئے جسموں کی شکل میں زندگی اختیار کر لیتا ہے ۔ انسانی زخموں کو اس طرح بھر دیتا ہے جس طرح کوئی محبوبہ اپنی آمد سے محبوب کے سارے غم کو دور کر دے ۔ زندگی کی رگ رگ میں ایک نشہ ۔ بالیدگی ۔ کیف اور گردش رقصاں ہو ۔ موسموں کی لطیف تمازت کائنات کے حسین اور دلکش مناظر ۔ انسانی حسن غذا اور خون کے خمار سے جو توانائی اور تازگی پیدا ہوتی ہے ۔ اس کے سامنے زندگی کی بڑی سے بڑی کلفت ہار ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے ۔ جسمانی صحت زندگی کا وہ شجر ہے جس سے رومان ، ذہانت ، لذت ہر چیز گویائی حاصل کرتی ہے ۔ قوت حیات غیر فانی ہے اور فرد کا منہ چڑھاتی ہے اس فرد کا جو احساس زندگی کی ابدیت سے ہم آہنگ نہیں ہوتا ۔ اس فرد کا جو احساس کی لطیف پرواز کے دوش بدوش سفر نہیں کرتا ۔ بلکہ زماں اور مکان یہاں اور وہاں ، ہاں اور نہ میں اپنے فکر کو قید کر دیتا ہے ۔ وہ زندگی جو حسن کے کسی ایک پیکر کے سامنے سر جھکا دیتی ہے جو قدرت کے ایک مخصوص سانچے سے فانوس سے انس رکھتے ہیں ۔ اس کی روح اپنا عجز ، اپنی فنائیت اور اپنی مختصر حیات کا احساس کر کے تڑپ جاتی ہے ۔ گویا اس چیلنج کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرے گی جو ابدی بقا نے فرد کے فانی جسم کو دیا ہو اسے زندگی کی یہ گردش پسند تھی جو اس کی رگ و پے میں جاری و ساری تھی وہ خود اس ابدی لہر کا جز محسوس کرتا تھا جو اس کائنات کی معمار اور معلم ہے جو صدیوں سے ذہنی اور شعور کے تعاون سے مچلتی ، تڑپتی اور ابھرتی چلی آئی ہے ۔ وہ اپنی محبوبہ سے اس طرح محبت کرتا تھا گویا بجلی کی دو متضاد لیکن باحساس اور مسرور لہریں ایک دوسرے میں پیوست ہونے کے لئے تڑپ رہی ہیں اور اس کی محبوبہ ایک مخصوص پیکر نہیں تھا بلکہ یہ رواں دواں حسن جو ان گنت جسموں کی شکل میں جنم لے رہا تھا اور جنم لے چکا تھا ۔ اس کی محبت جسم اور گوشت پوست تک محدود

محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ خود کو ایک مرئی کائناتی کرن محسوس کرتا تھا جو ان پیکروں کی قیدی نہیں ہے جو عملات میں بستے ہیں جو ہنستے بولتے، گاتے اور روتے ہیں اس کی زندگی ایک ایسی حیاتیاتی لہر تھی جو کائنات میں بے جسم اور وزن کے تیرتی ہے ایک سرمدی احساس تھا ایک پراسرار وجدان جہاں تڑپنا اور مچلنا مقدم ہے اور غور و فکر۔ موخر مقدس ہستیاں کہتی ہیں کہ محبت میں جسمانی قرب معیوب ہے۔ وہ کیا ارتعاش ہے جو محسوس ہوتا ہے اور کیا مقناطیس ہے یہ جو حسن کہلاتا ہے ایک لہر دوسری لہر کی طرف کھنچی جا رہی ہے اور اس میں مدغم ہونے کے لئے تڑپ رہی ہے، اس تڑپ میں عاقبت ہے، شہزوری، مدہوشی ہے یہ بھی حیات کی ایک جان اور حقیقت ہے۔ شعور اور فکر اس احساس کے پرتو ہی ہیں۔ جذبے کبھی احساسات سے الگ نہیں ہوتی اور احساسات کبھی ساکن اور بے جان نہیں ہوتے وہ کسی ان جانے جذبہ۔ ناقابلِ تسخیر قوت کے زیرِ اثر مچلتے ہیں اور شمع کا طواف کرتے ہیں وہ بے جان پتھر نہیں ہیں۔ کائنات کی متحرک لہریں ہیں۔ شعور ابھر اور مٹ گئے لیکن یہ ارتعاش باقی ہے یہ والہانہ حرکت۔ کیسا کیوں ہے۔ جب اس نظام عالم نے سایہ میں مذہب، حکومت اور جنسیاتی محبت کے سہارے جنم لے نکلے تو آج سے زندگی کا یہ سب سے پیارا سہارا لیا تھا۔ یہ شیریں ارتعاش، یہ سرور انگیز کیف۔ نہ معلوم کہاں سے رگوں میں آ جاتا ہے۔ رگوں میں قوت حیات کی دوشیزہ انگڑائی لیتی ہے۔ لطف صحت کا پرچم لہراتا ہے اور ایک عجیب نشہ زندگی کا سہانا گیت سناتا ہے۔ انسانی حسن کی شمیم حیات کے نوشگفتہ پھول کو ایک دلکش تازگی اور پاکیزگی عطا کرتی ہے اسے زندگی کی صحت مند انگڑائیاں۔ روح انسانی کی بے ساختہ اور معصوم مسکراہٹیں، بھوک اور جنس کی آمیزش۔ زندگی کی جان معلوم ہوتی تھیں لیکن اس کے نزدیک ان کی حیثیت وہی تھی جو کسی بالاخانہ پر پہنچانے والے زینہ کی ہے۔ ذہن کی پرواز جو ارض و سماکی بے کرانی اور سرکش شے کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتا ہے اور ایک احساس اور اسے مرکز بنا چاہتی ہے۔ وہ عادات، اعتقادات، حسن اور حکومت کا شکار ہونا نہیں چاہتی۔ وہ جینا چاہتا تھا اپنی ہر لاعلمی کے علم میں بدلنے کے لئے اپنی شکست کو فتح میں تبدیل کرنے کے لئے اور زندگی کے لازوال اور شیریں سانسوں اور دلکش فضاؤں کی موسیقی کے لئے جینا چاہتا تھا۔

سلطان احمد

رنگین پنکھی!

چین کے ساحلی شہر شنگھائی کی وہ ایک بیحد گرم شام تھی۔ گندے اور تنگ تنگ کوچے اور بازار دھول سے اٹے ہوئے تھے اور حسبِ معمول لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے قہوہ خانہ کی میزیں اور سڑک کی پٹریاں غلیظ اور بدحال مزدوروں سے پٹی پڑی تھیں۔ محاذ سے آئے ہوئے چینی سپاہی اپنے سینوں پر ربن کے فیتے لگائے اکڑتے پھر رہے تھے، دودھ کے پیپے لٹکائے ہوئے گوسی، گلے پھاڑ پھاڑ کر چلاتے ہوئے اخبار بیچنے والے، بڑی بڑی ٹوکریاں اٹھائے ہوئے قلی اور راہی کے دوش بدوش چرمی بیگ تھامے ہوئے غیر ملکی تاجر اور سیاح، سجی ہوئی رکشاؤں میں پھولدار چغے پہنے ہوئے رئیس، اخباروں کے نامہ نگار اور پالکیوں کے رنگین پردوں کے پیچھے بیٹھی ہوئی رقاصائیں اور بہت سے لوگ ـــ دوکانوں کے شوکیس، خوبصورت پھولدار برتن، باریک ریشمی کپڑوں کے تھان، جھم جھم کرتے ہوئے زیورات اور رنگین قالین اپنے اندر لئے دھک دھک کر رہے تھے۔ کوچوں کی فضائیں اور قہوہ خانوں سے اٹھتے ہوئے قہوہ کے بھبکوں سے بوجھل تھی۔ شام اونگھ چلی تھی، دوکانوں کی سوئی قندیلیں روشن کی جارہی تھیں اور بازاروں سے، لوگوں کے ٹھٹ اپنے گھروں کی طرف لوٹنے لگے تھے۔

سڑک پر لگی ہوئی سرکاری لالٹین سے کمر لگائے ایک خوبصورت نوجوان چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کے کپڑے بے ترتیب تھے اور پرانے کوٹ کے کالر بدرنگ اور آستینیں گھسی ہوئی ـــ پتلون پر کوئی کریز نہ تھی اور داڑھی کچھ بڑھی ہوئی۔ سر کے بال بے ترتیب سے تھے اور دو انگلیوں کے درمیان سگریٹ کا ایک ادھ جلا ٹکڑا ـــ وہ نیم وا آنکھوں اور کچھ بیزار ادا سے چلتے ہوئے بازار کے ہر آنے جانے والے پر نگاہ ڈالتا تھا اور پھر سڑک کے اُس طرف اُس مداری کو دیکھنے لگتا تھا جو لوگوں کی ایک بھیڑ کو اپنے گرد اکٹھا کئے تاش کے کھیل دکھا رہا تھا ـــ آخر وہ اس چھوٹے سے چوبی پل کی طرف چل پڑا جو ایک تنگ جوہڑ پر کچھ مضبوط لٹھوں کو باندھ کر بنایا گیا تھا۔ اور کچھ دور چلکر ایک ٹوٹی ہوئی منڈیر پر بیٹھ گیا اور پل کے نیچے بہتے ہوئے گندے پانی میں تکنے لگا جس پر کچھ زہریلے مچھر منڈلا رہے تھے۔

وہ ایک غریب چینی طالب علم تھا جو پہاڑوں کے اس طرف ایک دور دراز گاؤں سے پڑھنے کے لئے شنگھائی آیا ہوا تھا یہاں نہ اسکا کوئی شناسا تھا، نہ دوست نہ رشتہ دار۔ اس نے خود بھی کبھی دوست پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ طبعاً ایک خاموشی پسند اور سنجیدہ لڑکا تھا۔ اسے اس ہنگامہ پرور شہر میں آئے ہوئے تین سال گذر چکے تھے۔ تین طویل اور بیحد طویل سال ـــ! اور شاید ابھی ایک سال اسے اور یہیں ٹھہرنا تھا۔ اس کا نام تخالی آن ـــ اس کے بوڑھے

ماں باپ بیحد غریب تھے اور اپنے چھوٹے سے گاؤں میں اپنی آبائی زمینوں کی کاشت کر کے پیٹ پالتے تھے۔ آمدنی نہایت قلیل تھی اور پھر ہر ماہ ایک معقول رقم انہیں اپنے لڑکے کو اس کی پڑھائی کے لئے شہر بھیجنی پڑتی تھی اسی لئے بوڑھی عورت باقی وقت میں گاؤں والوں کے کپڑے سینے کے لئے لے آتی تھی اور کمالستا بوڑھا رنگین کاغذ کی پتنگیں بنا کر میلوں ٹھیلوں میں بیچنے کے لئے لیجاتا تھا اور اسطرح جو رقم جڑتی وہ اسے اپنے لڑکے کو شہر اس کی لکھائی پڑھائی اور خرچ کے لئے بھیج دیتے تھے۔ اگرچہ انہیں خود ہفتہ میں کئی وقت روٹی پانی کے ساتھ کھانی پڑتی اور کبھی کبھی بھوکا بھی رہنا ہوتا۔ اپنے بوڑھے ماں باپ کی حالت کا لی آن کو پورا علم تھا۔ اگر اسے پڑھائی کے ادھورا رہ جانے کا خیال نہ ہوتا تو وہ کبھی کا اپنے گاؤں کو لوٹ گیا ہوتا وہ جب رات کو اپنے بستر میں لیٹتا تو اس کے سامنے اس کے گھر والے اور اسکا چھوٹا سا گاؤں آ کھڑا ہوتا۔ ایک اونچی پہاڑی پر لکڑی کا وہ خوبصورت جھونپڑا جسکے دروازے اور دریچے گہرے سبز تھے اور جسکی چھت کے ساتھ کاغذ کی رنگین قندیلیں لٹک رہی تھیں اور ان میں ننھے ننھے موم کے شعلے یوں کانپ رہے ہوتے جیسے جھیل کے ساکن پانی میں چاندنی۔ اور نیچے اترتی ہوئی ڈھلوانوں پر اس کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اور پانی سے لبالب بھری ہوئی [illegible] کی کیاریاں ـــ اس کی بوڑھی شفیق ماں، لکڑی کے سہارے جھکی ہوئی کمر لئے بوڑھا باپ اور ننھی بہن۔ جس کے بال سنہرے تھے اور آنکھیں گہری نیلی۔ بھوکے اور زرد ــ نڈھال اور بے دم ـ تھکے ہوئے اور بے حال۔ اور وہ آبدیدہ ہو جاتا۔ سوچتا کہ صرف اس کی وجہ سے اس کے گھر والوں کو اتنی محنت اور مشقتیں کرنا پڑتی ہیں جنہوں نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا بنا دیا ہے۔ اور وہ عہد کرتا کہ میں اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر جب بڑی جگہ پر لگ جاؤں گا تو اپنے بوڑھے ماں باپ اور ننھی بہن کی بس پھر خدمت کروں گا۔ اور انہیں اتنا آرام پہنچاؤں گا کہ وہ اپنے سب اگلے پچھلے دکھ اور پریشانیاں بھول جائیں گے ۔ نہ کبھی کبھی اداس شاموں کو وہ تنہا اور بیزار سا بازار کی طرف نکل جاتا اور یونہی آوارا پھرتا رہتا، اُکتایا اُکتایا سا اور بے مقصد۔ اور جب وہ تھک کر سرکاری باغ کی کسی تنہا بینچ پر یا چوبی پل کی ٹوٹی ہوئی منڈیر پر کچھ دیر کیلئے ٹک جاتا تو اس وقت بھی اس کے تصور میں وہ لوگ ہوتے۔ اس کے بوڑھے ماں باپ اور ننھی بہن جس کے بال سنہری تھے اور آنکھیں گہری نیلی۔

لی آن کتنی ہی دیر تک یونہی سر جھکائے بیٹھا رہا مگر کچھ دیر بعد جب اس نے سر اٹھایا تو چونک اٹھا۔ اس نے دیکھا کہ پل کی اسی منڈیر کے پاس ایک خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔ اور اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی ـــ وہ شام کی دھندلائی ہوئی روشنی میں بیحد حسین نظر آ رہی تھی۔ بہت پیاری! اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور ہلکی بھوری، سمندر کی گہرائی لئے ہوئے ـــ اس کے بال گہرے سیاہ تھے اور بہت چمکیلے شانوں پر بکھرے بکھرے سے ـــ اس کے ہونٹ پتلے پتلے تھے۔ سرخ اور نازک۔ وہ ایک ڈھیلا ڈھالا چغہ پہنے ہوئے تھی اور چھوٹے چھوٹے گلابی ہاتھوں کو اس نے سینوں پر لپیٹے یوں سینہ پر باندھے ہوئے تھی جیسے کوئی پجاری بدھ دیوتا کے حضور ادب سے کھڑا ہو۔ اس کے جوڑے میں سفید گلاب کا ایک بڑا سا پھول دمک رہا تھا۔ اور چپ چاپ، خاموش، سیدھی اور ایستادہ کھڑی لی آن کو یوں دیکھ رہی تھی۔ لی آن اسے یوں مسلسل اپنی جانب تکتا ہوا دیکھ کر بوکھلا سا گیا۔ اس نے ایسا لافانی حسن آج تک نہ دیکھا تھا وہ رقاصہ تو یقیناً نہ تھی کیونکہ اس کے چہرے پر کچھ ایسی بات تھی جو رقاصاؤں کے مسخ چہروں پر کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ وہ تو

ایک ایسا نرم و تازہ جنگلی پھول تھی جو کسی ٹھنڈے آبشار کے کنارے خود سے خود اُگ آیا ہو۔ نکھرا ہوا اور شوخ ـــ! لی آن اس کی تیز گھورتی ہوئی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا وہ احمقوں کی طرح اس کی طرف منہ پھاڑے دیکھ رہا تھا اور وہ لڑکی بھی مسلسل اسے تکے جا رہی تھی اس کے پتلے پتلے سرخ ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ جاں بخش اور پر بہار!

لی آن نے دیکھا کہ وہ لڑکی اپنے گھٹنوں پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور اس نے ایک مسکراتی ہوئی نگاہ لی آن پر ڈالی اور جھومتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ چند قدم چلکر کچھ ٹھٹکی پیچھے مڑ کر اس نے لی آن کو دیکھا اور اپنے ریشمین رومال کو ہوا میں ایک جھٹکا دیا اور ایک تنگ گلی کی طرف چل پڑی جو اندھیری تھی ـــ خدا معلوم اس کے کیا معنی تھے؟ مگر لی آن نے یہی سمجھا کہ وہ اسے اپنے پیچھے آنے کے لئے کہہ رہی ہے اور وہ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا اس لڑکی کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

اس تنگ اور اندھیری گلی سے گذر کر وہ بڑی سڑک پر آ گئے اور اس پر چلتے رہے۔ لڑکی گاہے گاہے مڑ کر لی آن کو دیکھتی اور مسکرا دیتی اور لی آن وحشیوں کی طرح اس کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ اسے خود بھی نہ معلوم تھا کہ وہ کیوں ایک انجان لڑکی کا تعاقب کر رہا ہے اور اس بھدّے طریقہ سے ـــ! وہ سڑک بھی طے ہو گئی اور اب وہ پھلوں کی مارکیٹ میں نکل آئے۔ لڑکی پورے اطمینان سے بازار میں اِدھر اُدھر نظر ڈالتی ہوئی اور کبھی کبھی پیچھے مڑ کر ایک عجیب طریقہ سے مسکراتے ہوئے آگے بڑھی جا رہی تھی اور لی آن اس کے پیچھے پیچھے کتے کی طرح دم ہلاتے ہوئے چلا جا رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی چال میں کس غضب کی دلکشی ہے ـــ سڑک کی بتیاں جھلملا اٹھی تھیں۔ اور اب وہ مزدوروں کی بستی سے گزر کر چھاؤنی کے خوبصورت بازار میں نکل آئے تھے جس کی سڑکیں تارکول کی تھیں اور شیشے کی طرح چمکتی ہوئی ـــ نفیس دوکانیں قیمتی اور خوبصورت سامانوں سے پُر تھیں اور بازار میں گھومتے ہوئے لوگوں کے لباس عمدہ اور نفیس تھے اور خوشبو میں بسے ہوئے ـــ وہ خوبصورت لڑکی چلتے ہوئے ایک بڑی دوکان کے آگے ٹھہر گئی۔ جس پر ایک بڑا سا بورڈ لٹک رہا تھا اس پر لکھا تھا "فرم چی چی لائی چو" وہ شیشے کی الماری میں رکھی ہوئی ایک خوبصورت پنکھی کو دیکھ رہی تھی جو رنگین تنکوں اور ریشمی دھاگوں سے بنی ہوئی تھی۔ اس کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا اور کلابتوں کی سنہری دھاریوں سے وہ اور بھی شوخ اور چمکدار ہو گئی تھی۔ وہ ایک نہایت خوبصورت پنکھی تھی ـــ اور مخملی چوکی پر رکھی ہوئی دھک دھک کر رہی تھی۔ لی آن نے دیکھا کہ وہ لڑکی بے پروا اردگرد سے بے نیاز ہو کر بڑی پُر شوق نظروں سے اس پنکھی کو تک رہی ہے اور وہ کتنی ہی دیر تک کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ بوڑھا دوکاندار دوکان کے اندر اپنی میز پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ لڑکی نے اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر اپنے اردگرد اور پھر اس پنکھی کو تکنے لگی۔ لی آن نے دیکھا کہ لڑکی کی لمبی لمبی انگلیاں غیر ارادی طور پر الماری کی طرف بڑھیں اور پھر ایسا معلوم ہوا گویا پنکھی اس کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اپنے ہاتھوں کو چہرہ کے گرد لا کر اس نے اس طرح حرکت دی گویا پنکھی کو جھل رہی ہو ـــ اس کی یہ محویت کچھ لمحوں تک ہی رہی۔ اور پھر وہ چونک پڑی ـــ اس نے گھبرا کر اپنے اردگرد دیکھا۔ پیچھے مڑ کر لی آن پر ایک نظر ڈالی اور پھر تیز تیز چلتی سامنے کی گلی میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ سب کچھ اتنا جلد ہوا کہ لی آن اپنی جگہ ہی سہما کھڑا رہ گیا۔ لڑکی جا چکی تھی اور لی آن کھڑا فضا میں یوں تک رہا تھا۔ جس طرح کوئی غمزدہ بلبل بہار کے بیت جانے پر درختوں کی ننگی شاخوں کو پُر حسرت نظروں سے تکا کرے۔

خاص نمبر ماہنامہ پنجابی گرمت ستمبر ۱۹۴۲ء

لی آن آگے بڑھ آیا۔ اس نے الماری میں نمی چوکی پر رکھی ہوئی خوبصورت پنکھی پر نظر ڈالی اور پھر اپنے خیال میں۔ جہاں ایک عجیب سی خواہش کروٹیں لے رہی تھی۔ لی آن کو یقین تھا کہ وہ لڑکی انہی بازاروں میں اسے ایک مرتبہ پھر ملے گی۔ اگر اس موقع پر لی آن اسے یہ پنکھی پیش کر سکے؟؟ وہ سوچنے لگا۔

وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے دکان میں گھسا۔ اونگھتا ہوا بوڑھا دکاندار اپنی چوکی پر اچھل پڑا۔ اور دوڑا دوڑا آیا۔ لی آن نے اسے وہ پنکھی نکالنے کو کہا۔ بوڑھے باتونی دوکاندار نے پنکھی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیئے۔ لی آن نے اسے روکتے ہوئے قیمت دریافت کی۔

"صرف ساڑھے بارہ روپے جناب!"

"ساڑھے بارہ روپے!!؟" لی آن نے چیختے ہوئے کہا اور وہ دوکان سے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔۔۔ چند آنے پڑے تھے۔ صرف!

وہ دوکان سے باہر دیوار سے کمر لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوچا "کاش! میں اسے یہ پنکھی پیش کر سکتا!" اور اسے اسی طرح کھڑے کافی دیر ہو گئی اس کے ماتھے پر بل تھے اور ہونٹ بھینچے ہوئے۔

بازار کے اس ٹکڑے سے کچھ عجیب سا شور اٹھا جو بڑھتا چلا گیا۔ لی آن نے دیکھا کہ لوگ بھاگ رہے ہیں۔ دوکانداروں نے جھٹ پٹ اپنی دوکانیں بند کرنی شروع کر دیں۔ قلی اپنی رکشائیں گھسیٹتے ہوئے بھاگ پڑے۔ لوگ بھاگ کر گھروں میں چھپنے لگے اور پھر کچھ ہوائی فیر سنائی دیئے۔ کچھ پہاڑی لٹیرے آ پڑے تھے جو دوکانوں کو لوٹ رہے تھے۔ اور ہوائی بندوقیں سر کر کے لوگوں کو خوفزدہ کر رہے تھے۔ پولیس ان کے تعاقب میں تھی۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے لٹیرے سامنے آ گئے۔ انہوں نے دکانوں کے شیشے توڑ کر سامان لوٹنا شروع کر دیا۔ ایک غضبناک شور تھا۔ کہ جس میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی اور لوگ بے دم ہو کر بھاگے جا رہے تھے۔ لی آن اسی دوکان کی پچھلی دیوار کی اوٹ میں لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک موٹا سا آدمی جو ایک لمبی سی ٹوپی اور کھال کے مرے کوٹ میں لپٹا ہوا تھا اس بڑی دوکان کی طرف بڑھا اس نے اپنی بھاری بندوق کے کندے مار مار کر دوکان کی الماریوں کے شیشے چکنا چور کر دیئے جن میں قیمتی سامان بھرا ہوا تھا اور پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ لوٹ مار میں مشغول ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ بوڑھا دوکاندار پیٹ پکڑا پکڑا دوکان میں ادھر سے ادھر بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ اس کا چہرہ عجیب دہشت زدہ ہو رہا تھا۔ اور گھگی بندھی ہوئی تھی۔ وہ گڑگڑا کر لٹیروں سے درخواست کر رہا تھا کہ اس کا سامان چھوڑ دیا جائے۔ آخر وہ روتا ہوا موٹے آدمی کے پیروں میں گر پڑا جو لٹیروں کا سردار معلوم ہوتا تھا اور چیخیں مار کر اس کے پیروں سے چمٹ گیا۔ وہ موٹا آدمی بڑے زور سے ہنسا۔ اس نے بوڑھے دوکاندار کو ایک زور کی لات ماری اور وہ لڑھک کر صوفہ میں جا دھنسا جو دوکان کے ایک کونے میں رکھا تھا۔ اور وہیں پڑے پڑے چیخ چیخ کر انہیں گالیاں دینے لگا۔

اتنے ہی میں پولیس آ پہنچی۔ لٹیرے سامان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے وہ بندوقیں سر کرتے ہوئے بازار کی پچھلی طرف ہٹنے لگے تاکہ پولیس کے آگے بڑھنے میں کچھ دیر لگے اور وہ پچھلی پہاڑیوں کی طرف نکل جائیں۔ پولیس

جمعیت نے جواب میں اپنی بندوقیں داغیں اور بازار کی فضا بندوق کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ آخر لٹیرے بھاگ پڑے۔

لی آن دوکان کی پچھلی دیوار کے سہارے چپکا کھڑا تھا۔ وہ یہ سب کچھ دم سادھے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر یکایک اس کی نظر دوکان کی الماری پر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ الماریوں کے شیشے چور چور تھے۔ سامان بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا۔ بہت سی قیمتی چیزیں ادھر ادھر لڑھکی ہوئی تھیں — پھولدار ریشمیں تکیے اونی قالین — قیمتی برتن۔ کتابیں — اور وہ خوبصورت پنکھی —! لی آن کی نگاہ پنکھی پر جم کر رہ گئی — الماری کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کے باہر سڑک کی پٹری پر پڑی تھی — لی آن سے کچھ ہی دور — بس اتنا کہ اگر لی آن باہر آ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھا سکے تو وہ اس کی انگلیوں کو چھو جائے — مری پرانی خواہش لی آن کے سینے میں جاگ اٹھی نہ جانے آج اسے کیا ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک غیر اخلاقی فعل ہوگا۔ مگر وہ اسے چرا کر بھاگ جانے پر تیار ہو گیا۔ ماحول اور خطرات سے بے پرواہ ہو کر وہ اوٹ سے باہر نکل آیا۔ گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا وہ پنکھی کی طرف بڑھا اور اس نے پیٹ کے بل جھک کر پنکھی کو مٹھی میں بھینچ لیا — مگر اسی لمحہ وہ ایک چیخ مار کر اوندھے منہ گر پڑا۔ پولیس مین کی بندوق کی گولی اس کی پسلیوں کے پار ہو گئی تھی — وہ سڑک پر اوندھا پڑا تھا اس کے گھٹنے مڑے ہوئے تھے اور مٹھیاں بھنچی ہوئی —!

پہاڑی سلسلوں تک لٹیروں کا تعاقب کرتے ہوئے پولیس جب واپس لوٹی تو بازار سنسان پڑا تھا۔ لوگ گھروں کے دروازوں کی روزنوں سے جھانک رہے تھے اور دوکاندار ڈرتے ڈرتے اپنی دوکانوں کے کواڑوں سے سر نکالے کھڑے تھے۔ پولیس کے آ جانے پر لوگوں کی ہمتیں کچھ بڑھیں۔ وہ بازار میں نکل آئے۔ دوکانیں الٹی پلٹی پڑی تھیں۔ کواڑ ٹوٹے ہوئے — الماریاں چور چور — اور سامان بکھرا ہوا۔ اس بھاگ دوڑ میں کچھ لوگوں کے چوٹ بھی آگئی تھی اور وہ اپنے گھٹنے سہلاتے آنکھیں میچے گھروں کو جا رہے تھے۔ اور مشہور دوکان "چی چی لائی چو" کے آگے پٹری پر ایک نوجوان اوندھے منہ پڑا تھا۔ خاک و خون میں تھڑا ہوا — وہ مر چکا تھا۔ بیچارہ لی آن! پولیس کے ایک سپاہی نے بازار کے آدمیوں اور "چی چی لائی چو" کے بوڑھے مالک کے آگے شیخی مارتے ہوئے کہا "اس لفنگے کو میں نے اپنی بندوق کا نشانہ بنایا ہے جب میں نے اسے دیکھا تو یہ لوٹ مار کر رہا تھا بس وہیں رکھ کر بھون دیا" مگر جب اس کی لاش دیکھی گئی تو فرم "چی چی لائی چو" کا بوڑھا مالک چلا اٹھا "یہ لٹیرا نہیں ہو سکتا — کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور جب اس پولیس والے کو اپنی غلطی کا علم ہوا تو اس نے گردن ہلا کر افسوس سے کہا "آہ — ایک بیگناہ مارا گیا" آخر اس بیگناہ نوجوان کی لاش کو دوکان "چی چی لائی چو" کے ایک کونے میں چوبی تخت پر سیاہ لبادے سے ڈھک کر لٹا دیا گیا۔ پولیس کانسٹبل نے جاتے ہوئے دوکان کے مالک سے کہا "جب تک ایمبولینس کار بھیجی جائے — اس لاش کو یہیں رہنے دیجیے" اور اس تمام رات وہ لاش دوکان کے چوبی تخت پر پڑی رہی — اکڑی ہوئی اور سخت !

دوسری صبح جب بازار کھلا اور دوکانداروں نے اپنی دوکانیں ترتیب دینی شروع کیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے رات کو کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لوگ اسی طرح چل پھر رہے تھے، آ جا رہے تھے۔ خرید و فروخت کر رہے تھے۔ فرم "چی چی لائی چو" میں ایک مرد اور ایک لڑکی ہاتھ میں ہاتھ دیئے داخل ہوئے۔ مرد ایک موٹا امریکن تھا جو اپنی نفیس وردی میں جچ رہا تھا

اور اس کی بغل میں ایک چینی لڑکی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور ہلکی بھوری، سمندر کی سی گہرائی لئے ہوئے۔ اس کے بال گہرے سیاہ تھے اور بہت چمکیلے، شانوں پر بکھرے بکھرے سے۔ اس کے ہونٹ پتلے پتلے تھے، سرخ اور نازک۔ وہ ایک ایسا ترو تازہ جنگلی پھول تھی جو کسی ٹھنڈے آبشار کے کنارے خود سے خود اگ آیا ہو۔ نکھرا ہوا اور شوخ! یہ وہی لڑکی تھی۔ انہوں نے بوڑھے دوکاندار سے وہی پنکھی مانگی جو رنگین تنکوں اور ریشمی دھاگوں سے بنی ہوئی تھی۔ اس کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا اور کلابتوں کی سنہری دھاریوں سے وہ اور بھی چمکدار اور شوخ ہو گئی تھی۔ مگر دوکاندار نے افسوس کیسا تھ گردن ہلاتے ہوئے کہا "وہ پنکھی اب نہیں مل سکتی۔ شاید لٹیرے مال غنیمت کے ساتھ اسے بھی لے گئے۔"

موٹے امریکن نے چینی لڑکی کو گدگداتے ہوئے کہا "ڈارلنگ۔ چھوڑو بھی۔ میں تمہیں اس سے بھی زیادہ خوبصورت زیادہ پائیدار اور زیادہ پیاری پنکھیاں لے دوں گا۔"

لڑکی نے جاتے جاتے دوکان کے اس کونہ میں بچھے ہوئے چوبی تخت پر سیاہ لبادے سے ڈھکی ہوئی چیز کے متعلق پوچھا مگر اتنے میں ہی موٹے امریکن نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اور وہ دونوں ہنستے ہوئے دوکان سے نکل گئے۔ اگر وہ پوچھتی تو ژم چی چی لائی چو کا بوڑھا مالک اسے بتاتا کہ وہ ایک نوجوان کی لاش ہے۔ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی۔ وہ سیاہ لبادے کے نیچے اوندھے منہ پڑا ہے۔ گھٹنے مڑے ہوئے اور مٹھیاں بھینچی ہوئی۔ اور بھینچی ہوئی مٹھیوں میں ایک خوبصورت چھوٹی سی پنکھی، جو رنگین تنکوں اور ریشمی دھاگوں سے بنی ہوئی ہے۔ اس کا دستہ ہاتھی دانت کا ہے اور کلابتوں کی دھاریاں اور خون کی چھینٹوں سے وہ اور بھی چمکدار شوخ اور رنگین ہو گئی ہے۔

"برقعہ" بقیہ صفحہ کا

میں نے کہا اللہ رکھے تمہارے دولہا آج گھر میں ہوں گے۔ اب تو جاؤں تم کہو گی بڑھیا وقت بے وقت آ جاتی ہے۔ ابھی ذرا دیر پہلے کیواڑ کھلے دیکھے تو آ گئی کہ چلیں ہنڈیا روٹی کا وقت ہو گیا ہے۔ میاں کے جوتے دروازے پر رکھے دیکھے تو میں نے جانا تم ابھی اندر آئی ہو۔۔۔۔۔"

گلشن نتھے کو صحن میں چارپائی پر لٹاتے ہوئے تعجب سے بولی۔ بڑی بی میں تو دوپہر سے فرحت کے ہاں گئی ہوئی تھی ابھی ابھی وہیں سے چلی آ رہی ہوں تم نے مجھے کب آتے دیکھا؟"

بڑھیا نے کہا اے ہے دولہن بھلا میں تمہارا برقعہ پہچانتی نہیں۔ میرے ہاتھ ہی تو تم نے سلوایا۔ میں ہی کر لائی تھی۔"

گلشن کو یقین نہ آیا۔ بولی۔ تم نے مجھے اپنی آنکھوں اترتے دیکھا تھا۔ بڑھیا کو اپنی یادداشت پر پورا بھروسہ تھا۔ جھنجھلا کر بولی اے اللہ کیا میں جھوٹ بک رہی ہوں یا میرا دماغ خراب ہوا ہے۔ اسا نہیں تو" گلشن حیرت سے اس کا منہ تک رہی تھی۔ بڑھیا نے اس کے ہاتھ میں سیاہ برقعہ دیکھ کر کہا "اے اب یہ میں کیا جانوں کہ تم دوبارہ گئی تھیں اس وقت تو تم اپنا وہی کڑھا ہوا برقعہ پہنے اتری تھیں لو اب مجھے نکال دو ہنڈیا بگھارنے کو دیر ہو رہی ہے۔" گلشن نے انار بند سے چابیوں کا گچھا کھول کر صحن میں پھینک دیا اور ہاتھ میں برقعہ لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ افتخار مسہری پر بے خبر سو رہا تھا۔ پیشانی پر بال بکھرے ہوئے تھے۔ تکیئے بے ترتیب پڑے تھے اور سفید چادر کی شکنوں میں سرخ چوڑیوں کے ٹکڑے چمک رہے تھے۔ گلشن کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور سیاہ ریشمی برقعہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

مونس شبیر

برقعہ

دوپہر کے کھانے سے فراغت پاکر گلشن کو ذرا کنگھی چوٹی کی فکر ہوئی کیونکہ آج خلاف معمول افتخار دوکان سے کھانا کھا کر گھر آ گئے تھے اور اب کمرے میں پنکھے کے نیچے مسہری پر لیٹے کروٹیں بدل رہے تھے۔ گلشن غسلخانہ سے نکلی تھی۔ نہ جلچلاتی دھوپ میں اس کی پیاری سہیلی بانو بنی سنوری چھم چھم کرتی آن پہنچی اور آتے ہی چلانے لگی، ائے ہے بہن تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ دیکھو تمہیں ہماری قسم جلدی کپڑے بدل لو۔ بیچاری فرحت اور اس کی سہیلیاں انتظار کر رہی ہوں گی۔

گلشن نے اسے تخت پر بٹھایا اور پاندان کھولتے ہوئے بولی۔ "اہو بڑے ٹھاٹھ ہیں آج تو بس پری معلوم ہو رہی ہو بن سنور کر تو تم غضب ڈھاتی ہو اور یہ سرخ چوڑیاں کہاں سے لیں۔ بانو نے بڑے زور دار انداز سے اس کی طرف دیکھا" بس مل ہی گئیں کہیں سے اجی اب پاندان رہنے دو۔ بس تم تیار ہو جاؤ۔ جلدی سے تمہارے لئے ڈولی بھی لے آئی ہوں۔

گلشن نے کہا "لیکن میں اس گرمی میں کیسے جاؤں گی (دھیرے سے آواز میں) اور پھر کہ ابا بھی تو آج گھر میں ہیں آج تو نہیں جا سکتی"

بانو نے منہ بنا کر کہا "اے ہے تمہارے دولہا کہیں بھاگے جاتے ہیں یہ ایسی بھی کیا چاہت کہ بیویوں سے دو گھڑی بھی نہیں مل سکتیں۔ بس دیکھ لی تمہاری محبت۔ ہم بھلا ہیں جو بھاگے چلے آتے ہیں تمہیں تو گھر سے نکلنے کی قسم ہے۔

گلشن۔ (ہنستے ہوئے) اے لو ناراض ہوگئیں ابھی پرسوں تو صفیہ کے ہاں گئی تھی اور کیوں بی تم کہاں گئی تھیں اس روز لڑکی کو مجھے تو بھیج دیا۔ اور خود آئی نہیں اللہ جانتا ہے ذرا جی نہ لگا ہو تمہارے بغیر"۔

بانو نے کہا "اے ہے کیا بتاؤں اس روز کیسا جی ترسا ہے لیکن کیا کرتی برقعہ سر پر ڈالا ہی تھا کہ چھوٹی اماں آ پہنچیں بہتیرا کہا کہ ابھی مجھے ضروری جانا ہے مگر وہ نہ مانیں کہ میں تو تمہارے مارے آئی تم چل دیں۔ (آہ بھر کر) آج بھی میری جان کو ایک مصیبت آن پڑی"

گلشن نے گھبرا کر کہا "اے ہے ایسی کیا بات ہوئی بھئی دیکھو اگر آج تم میرے ساتھ نہ گئیں تو میں نہیں جانے کی ہاں سچ کہتی ہوں۔ تمہاری خاطر میں تو جاتی ہوں۔

بانو نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا" اللہ جانتا ہے اسی لئے تو دھوپ میں آئی ہوں کیا بتاؤں بس خالہ اماں سے تو خدا سمجھے ایسے موقعوں پر بلاتی ہیں کہ جان جل جاتی ہے۔ آج ان کی بیٹی کے سسرال والوں کی دعوت ہے۔ ہاتھ بٹانے کو مجھے بلایا ہے اب اگر نہیں جاتی تو جھٹ اماں جان سے شکایت کر دیں گی پھر اماں جان کا غصہ تو تم جانتی ہو لیکن خیر میں وہیں سے آنے کی کوشش کروں گی۔ لو اب اٹھو نا"۔

گلشن نے کہا "نہیں میں نہیں جاؤں گی"۔ بانو نے جھٹ اسے گلے لگا کر کہا "اے ہے میری ایسی اچھی بہن اچھا میں وعدہ کرتی ہوں تم چلو تو سہی میں بھی آ جاؤں گی۔ کہو تو تمہارے دولہا سے اجازت لے دوں (بلند آواز سے) اجازت لے لو نا اپنے دولہا سے۔

افتخار نے وہیں سے جواب دیا "اجازت ہے صاحب میری جانب سے اجازت ہے جس میں یہ خوش اس میں ہم خوش۔ ضرور جائیے" پھر قسمت ہی پھوٹ گئی بیاہ کا ہے کو کیا کوئی سکھ نہ پایا۔ کبھی سیدھے منہ بات بھی نہ کرتے (ٹھنڈی سانس بھر کر) جس مرد کو بازار کا چسکہ

لگ گیا ہو۔ وہ بیوی کو کیا جانے گا"۔

گلشن نے تاسف کے ساتھ کہا "ہاں میں سچ کہتی ہوں لیکن نہ جانے باہر کا مزا کیوں پڑتا۔ ایک چھوڑ تین تین شادیاں کریں۔ پھر بھی نیت بھرے۔ نہ جانے ہماری قوم کے مردوں کو یہ کیا عادت ہے! اچھی بھلی چھوڑ دوسری کر لیتے ہیں۔ بس شادی اور طلاق بس۔ کھیل بنا رکھا ہے۔ اب بھلا تم میں کون سی کمی ہے۔ جوان خوبصورت بیوی کو چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹکتے پھرنا۔" "اللہ کا شکر ہے بہن! یہ بہت سیدھے ہیں۔ بس دکان سے گھر۔"

بانو۔ "آنکھیں ٹھنڈی کرے، اللہ سلامت رکھے گھر ہی میں سب کچھ مل جاتا ہے تو پھر باہر جانے کی کیا ضرورت ہے! اچھا تو بس اب جلدی کرو میں تو تمہیں تمہارے گھر لے جاؤں گی۔ کہیں میرے جانے کے بعد تمہارا ارادہ نہ بدل جائے۔" گلشن ہنستی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔ صندوق کھول کر سوچ رہی تھی کہ کون سا جوڑا پہنے کہ اختر نے آواز دی "ذرا جلدی کرو کب سے تمہاری سہیلی انتظار کر رہی ہے۔ بہت سست واقع ہوئی ہو کبھی وقت پر تیار نہیں ہوتیں ایک یہ تمہاری سہیلی ہیں کہ وقت سے پہلے ہی آن پہنچیں۔ اس کو کہتے ہیں وقت کی پابندی۔ بس اب یہی جوڑا پہن لو نا اچھا ہے۔ یہ چادر رکھا ہے اور ننھے کو بھی ساتھ لیجاؤ نا معلوم کب واپس ہو جاگ کر روئے گا۔ آج ذرا دیر میں بھی آرام کرنا چاہتا ہوں۔ بس اس کا کرتا بدلنے کی کیا ضرورت ننھا یہی ٹھیک ہے۔" ادھر بانو دالان میں بیٹھے بیٹھے فقرے چست کر جاتی تھیں۔ گلشن نے الٹے سیدھے کپڑے بدلے اور ننھے کو گود میں لئے باہر نکلی۔

بانو نے اس کا سفید مگر لال پیلا کڑھا ہوا برقعہ دیکھ کر نفرت سے کہا۔ "آے ہے یہ پہن کر جاؤ گی لو میرا ریشمی برقعہ لے لو۔ میرا کیا ہے میں تو ذرا سے گھر جا رہی ہوں میں تمہارا سیدھا برقعہ پہن لیتی ہوں۔ لاؤ ننھے کو مجھے دو تم جلدی سے برقعہ پہن لو۔" گلشن نے ناک منہ چڑھا کر کہا "بس اسے رہنے دو یہی ٹھیک ہے ایسے موئے انگریزی کا برقعے سے میرا دم الٹنے لگتا ہے۔ اس روز بھی تم نے یہی پہنا دیا تھا۔ دو قدم چلنا دشوار ہو گیا۔ اپنا سیدھا برقعہ اچھا ہے۔ بڑی دقت سے اٹھایا سر پر اٹکا لیا جی چاہا الگ پھینکا۔ ایک یہ ہے ...." بانو نے جھنجلا کر کہا "بس ایسی باتوں سے ہی میری جان جلتی ہے۔ اے ہے اب ایسی بھی کیا سستی۔ وہاں منٹی اڑے گی۔ کئی بار کہا ہے تم بھی ایسا کالا برقعہ سلوا لو ایک جیسے ہو جائیں گے دونوں کے لیکن تم بھلا مانتی ہو اب میں تمہارے دولہا سے کہوں گی وہ بنوا کر دیں گے تمہیں" اور دولہا نے اندر سے جواب دیا "ضرور بنوائیں میں تو ان سے یہی کہتا ہوں"۔ گلشن نے مسکرا کر اپنا برقعہ بانو کو دے دیا۔ اور اس کا پہن کر ڈولی میں جا بیٹھی۔ دونوں ڈولیاں مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئیں۔

گلشن جب فرحت کے ہاں پہنچی تو سہیلیوں کا جمگھٹ لگا ہوا تھا۔ گلشن نے برقعہ نوچ کر الگ پھینکا اور ننھے کو فرش پر لٹا کر دوپٹے سے چہرے کا پسینہ پونچھنے لگی۔ فرحت نے برقعہ دیکھ کر کہا۔ "آے بہن یہ کب بنوایا"۔ گلشن نے بیزار لہجے میں کہا "اے ہے یہ کمبخت مارا بانو کا ہے۔ بس مر ہو گئیں کہ یہی پہنو"۔ فرحت نے معنی خیز نگاہوں سے چمن کی طرف دیکھا۔ چمن نے کہا "وہ آئی کیوں نہیں"۔ گلشن نے کہا "بیچاری کی عجب مصیبت ہے۔ آج اس کو خالہ کے ہاں جانا پڑ گیا۔ بیچاری یہاں آنے کو پھڑکتی رہ گئی۔" جمیلہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "ہاں ایسے موقعوں پر ہی تو اسے برقعہ بدلنے کی ضرورت پڑتی ہے"۔ گلشن نے معصومیت سے کہا۔ "ہاں بہن خالہ کے ہاں انگریزی برقعہ پہن کر کیسے جاتی" چپ ہو رہی۔ اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ گلشن بھی مسکرا دی۔

شام کو جب گلشن گھر پہنچی تو بڑی بی آ چکی تھی اور باورچی خانے میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ گلشن کو آتا دیکھ کر وہ چونک کر بولی "اے ہے دولہن تم کہاں تھیں۔ میں نے جانا تم اندر سو رہی ہو۔ دوپہر کو بھی آئی تھی میں تار گلی والوں کے ہاں سے کھانا لے کر میں نے کہا اچھا دولہن سے ذرا چینی مانگ لاؤں تم کو ڈولی سے اترتے دیکھا۔ میں نے کہا اے دلہن ذرا ٹھہرنا پر تم نے جھٹ باہر کے کواڑ بند کر لئے (ہنستے ہوئے)

خاص نمبر ماہنامہ پنجابی گزٹ سنہ ۱۹۴۶

احمد سعید

فن تاویل

بسم اللہ و نعوذ باللہ۔ ملکہ باغ جس کے جنوبی کنارے پر ہمارا پیارا ٹاؤن ہال یعنی بزرگان شہر کا تکیہ واقع ہے۔ جس کے نرم نرم صوفوں کے گدّوں پر بہت سی روحیں بیٹھنے کو ترستی ہیں۔ جن کی حسرت و آرزو میں ذاتی تو ذاتی آباؤ اجداد کا دفینہ تک ختم ہو جاتا ہے۔ اسی پیارے ٹاؤن ہال کے عین سامنے ایک کنواں ہے جس کو "چاہ و مرد" کہتے ہیں۔ یہ کنواں باغ کے آہنی دروازے کے سامنے ہے کہ جو جانب شمال ریلوے اسٹیشن کے بالمقابل کھلتا ہے۔ اس کنوئیں کے چاروں طرف درخت لگے ہوئے ہیں۔ جن کی وجہ سے یہاں گرمیوں میں بڑی ٹھنڈک رہتی ہے۔ کنوئیں کے متصل ایک مسجد بھی ہے اور چند قبریں بھی۔ ایک گنبد بھی بنا ہوا ہے جو خدا جانے شاہی وقتوں کا ہے یا غدر کے بعد کا، جب کہ ٹاؤن ہال بنا تھا۔ اس وقت ارکان بلدیہ نے اپنی تفریح کے لئے بنوایا تھا۔ بہرحال طرز قدیم ہے۔ تحقیقی علم نہیں۔ اور نہ معلوم ہے کہ قبریں اولیاء اللہ کی ہیں۔ یا لاوارث ملازمان بلدیہ کی۔

ان درختوں اور کنوئیں کے پانی کے سرد ہونے کی وجہ سے اکثر یہاں لوگوں کا اژدحام رہتا ہے۔ مسجد میں امام صاحب بھی رہتے ہیں۔ نماز بھی پانچوں وقت اذان کے ساتھ ہوتی ہے۔ یوں تو کنوئیں کے قریب کوئی آبادی نہیں ہے۔ لیکن زائرین چاہ و مسجد کی وجہ سے جماعت کے وقت مسجد بھر جاتی ہے۔ ہاں البتہ یہاں ایک چیز عجیب نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ نمازی جماعت سے فارغ ہوتے ہی ایک ایک سونٹا اور ایک ایک کونڈی لیکر برابر برابر بیٹھ جاتے ہیں اور کنوئیں کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ بادام کالی مرچیں چاروں مغز اور کچھ دیگر سبز رنگ کی ادویات ڈالکر گھوٹتے جاتے ہیں۔ اور گنگناتے جاتے ہیں ؎

کونڈی کے نقارے پہ خنکے کا لگا ڈنکا ! نت بھنگ پی اور عاشق دن رات بجا ڈنکا

اللہ اللہ کیا محنتی لوگ ہیں رو مالیاں کس کر جب گھوٹتے ہیں تو پسینہ کی نہریں نکلتی ہیں۔ دینداری کا یہ عالم ہے کہ ادھر اذان ہوئی نہ بند لپیٹا گلے میں قمیص ڈالی۔ کونڈی اٹھا کر ایک جگہ دھری اور جماعت میں شریک ہو گئے۔ دیانتداری کا یہ عالم ہے کہ مجال ہے کہ انکی شرکت نماز کے وقت کوئی ذرا سی نکال کر اپنی کونڈی میں ڈال دے یا انگلی بھر چکھ لے۔

اس کنوئیں کے چاروں طرف سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان پر آدمی کثرت سے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں دستی

ہوتیں ہوتی ہیں جن کے پھندوں پر میلا سا کپڑا لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ اس کپڑے کا رنگ بوجہ دود آلود ہونے کے سیاہ ہوتا ہے اور اس میں اس قدر تیزی ہوتی ہے کہ اگر ڈاکٹر عمل جراحی کے وقت مریض کے منہ پر ڈال دے تو بلا کسی اور ڈاکٹر کی مدد کے اس مریض پر بڑے سے بڑا عمل کر سکتا ہے۔ جب تک کپڑا ہٹا کر مریض کو ۵ منٹ لخلخہ نہ سنگھایا جاتے ہوش نہیں آ سکتا۔ چلم پراگندہ ہوتا ہے۔

کہاں تک کروں شکوہ کروں اس پر بھی کمبخت نہ مرے تو میں کیا کروں؟

میں نے ایک دن امام صاحب مسجد ہذا سے کنویں۔ زائرین چاہ۔ چلم اور گونڈی کے متعلق دریافت کیا۔ ارشاد ہوا کہ یہ مسجد اللہ والوں کی ہے۔ کتابی کٹ ملاؤں کی۔ شورش یہ ہے کہ اگر یہ پڑھا جاتے خلوت تلاش کی ہے۔ امام صاحب کا چہرہ مسلمانی ہاتھ پر گٹا۔ ہاتھ میں تسبیح۔ داڑھی لمبی مگر گھنی نہیں۔ جبیں کتری ہوئی صندلانیا۔ کرتہ گھٹنوں سے نیچا سر گھٹا ہوا۔ تہبند اور کرتہ گیروا رنگا ہوا۔ منہ میں پان۔ باچھوں سے ٹپک ٹپک کر داڑھی کو تر کرتی ہوئی۔ میں نے پوچھا گونڈی اور چلم میں کیا ہے۔ فرمایا گونڈی میں جنت کی سبزی ہے۔ یہ وہ نعمت ہے کہ حضرت آدم کے ساتھ دنیا میں آئی ہے چنانچہ جب آپ جنت سے نکالے گئے تھے لنکا میں آکر اترے تھے۔ اس وقت چند بیج سبزی کے انکے پیروں میں لگے ہوئے ساتھ چلے آئے۔ راستے میں کچھ تو ہندوستان میں گر گئے۔ ایک آدھ لنکا پہنچ سکا۔ اس وجہ سے اس آسمانی نعمت کی پیداوار ہندوستان میں زیادہ ہے۔ اور باشندگان ہند ہی اسکے فوائد خوب جانتے ہیں۔ اس کو سبزی کہتے ہیں۔ ہندو اسکو بھنگ کے نام سے پکارتے ہیں۔ عرب حشیش کہتے ہیں۔ اس کا اثر چائے کا سا ہے۔ اصل میں چائے فرنگیوں کی سبزی ہے۔ یہ الہ ماروں کی چائے۔ وہ کافر سبزی یہ اللہ والی۔ وہ حرام ہے یہ حلال۔ دیکھ لو ان آدمیوں میں تم کو کافر انگریز بھی نظر آتا ہے؟ ماشاءاللہ جتنے ہیں داڑھی والے اللہ والے۔ انتہا یہ ہے کہ آجکل کے کالج کے نوجوان کہ جو نام کے مسلمان اور داڑھی مونچھ صاف۔ وقت کے کنہیا ہیں۔ ان میں سے ایک بھی کبھی آکر یہاں پر تک نہیں مارتا۔ یہ ٹھنڈی چائے ہے کہ جاڑے میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ انگریز وحشی قوم اس مہذب چائے کو کیا جانیں۔ کافر جھتی ہیں ناگ پوجا کرتے ہیں۔ ہم تو جب جانیں کہ ہماری طرح گھوٹ کر پئیں۔ ہائے افسوس ۵۷ء میں تقدیر نے یاوری نہیں کی ہنیں تو آج لیٹن اور بروک بانڈ کے ذہنوں میں یہی بکتی۔ حکیم بدرالدین رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کے فوائد دریافت کئے یہ انہیں کی ذات گرامی تھی کہ آج ہزاروں اشخاص جنت کی تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ حسن بن صباح کے ادراک کی قسم سالک اس کو پی کر جس وقت مراقبے میں بیٹھتا ہے تو قرب الہی کے درجے بہت جلد طے کرتا ہے۔ یا تو مریض اس کو پی کر کسی باغ کی سیر کرتا ہے۔ تو پڑے کے اسرار اس پر وا ہو جاتے ہیں۔ گھڑی بھر میں سارا غم غلط کر دیتی ہے۔ دل میں یکسوئی پیدا کرتی ہے۔ بیٹھے بٹھائے کی کیسی ہی گرمی ہو سب رفع کرتی ہے۔ لو کے اثر کو مارتی ہے۔ بھوک خوب لگاتی ہے۔ جسم میں قوت پیدا کر کے اسکو فربہ کرتی ہے۔ پھر کتنی محنت سے گلاس بھر تیار ہوتی ہے۔ اگر افیونی کو صرف آدھ ... اسی کے ہاتھ سے تین سو چالیس دن گھٹوا کر پلا دو تو چنیا بیگم کے عشق سے توبہ کرے گا۔ واللہ سوٹا ٹنڈ بابھک ایک طرف مجلس سرگشائی ایک طرف۔

میں نے پوچھا حضرت ان وحشی چلموں میں بجائے تمباکو کے گولی کیسی رکھتے ہیں۔

فرمایا یہ من صوفی ہے اسکو غذا نما بھی کہتے ہیں یہاں قلب نما سے تو چار سمتیں ہی معلوم ہوتی ہیں اس سے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ کیا من وسلوے کا نام نہیں سنا۔ سلوے یہی بٹیر ہیں جن کو لڑانے کے لئے پالتے ہیں۔ من جمی ہوئی اوس ہے جو ایک خاص قسم کے پودوں پر گر کر جم جاتی ہے۔ اسی طرح یہ پیاری نعمت بھی پیالی سبزی (بھنگ) کے سبز پتوں پر ملتی ہے۔ چونکہ جناب باری کا اپنے بندوں پر انعام ہے۔ اس لئے آسمان سے پتے پر اور پتے سے اللہ کے پیاروں کے ہاتھوں میں اور پھر اسکا نور شعلہ کی صورت میں سینے کے اندر۔ اسحٰق نیوٹن کا اصول یہیں تو غلط ثابت ہو گیا ہے اگر کشش ارضی یا جذب زمین یا زمین کی اپنی طرف کھینچنے کی طاقت کا وجود ہے تو اس نعمت کو وہ اپنی طرف کیوں نہیں کھینچ لیتی۔ پتے پر کیوں رہنے دیتی ہے۔ یہی شے ہے کہ جو سیدھی اللہ میاں کے یہاں سے اس کے بندوں کے لئے براہ راست آتی ہے۔ اور بغیر زمین دیکھے دھوئیں کی شکل میں اپنی ہیئت بدل کر پھر آسمان کو ہی واپس چلی جاتی ہے۔ دنیا کی ہر چیز زمین سے ہی نکلتی ہے۔ اور زمین میں ہی چلی جاتی ہے۔ مگر صرف یہی چرس ہے کہ جو کبھی زمین کو چھوتی تک بھی نہیں۔

میں نے کہا منّ اصلی بھی تو اسی طرح پائی جاتی ہے۔

فرمایا وہ کھائی جاتی ہے اور فضلہ بن کر زمین میں چلی جاتی ہے۔ وہ تبدیل ہیئت غلیظ کرتی ہے یہ لطیف۔ وہ جسم بنانے کے کام آتی ہے یہ روح کی غذا ہے۔ دیکھو ان عشاقان جناب باری کو کہ جب دم لگاتے ہیں تو بجائے دھوئیں کے سینے کے اندر سے شعلہ نکالتے ہیں۔ بیوقوف اور جاہل کٹ ملا اس کو چرس کہتے ہیں۔ ریل کا اتنا بڑا انجن ہے جس میں کتنی زبردست آگ جلتی ہے اس کی چمنی میں سے ہمیشہ دھواں نکلتا ہے۔ کہاں انسان کہاں لوہے کا انجن۔ وہ باوجود اتنی زبردست آگ کے صرف دھواں نکالے۔ یہ صرف ذرا سے تنکے یا سلائی سے شعلہ۔ وہ دھوئیں سے کالا اسے شعلے سے غیرت نہیں۔ تمہارے سر کی قسم اگر انجن اپنی چمنی میں سے ایک دفعہ بھی ایسا دھواں نکالدے تو گاڑیوں۔ پٹڑیوں۔ اور اسٹیشن سمیت بھک سے اڑ جائے۔ یہ فلائی گولہ (ایٹم بم) جانتے ہو کیا چیز ہے؟ یہ فرنگی بچے بڑے ہوشیار ہیں۔ کوئی باغ میں ان اللہ والوں کو دیکھ گیا ہے۔ کسی ترکیب سے بارود میں چرس یا اس کا دم ملا لیا۔ بس بن گیا۔ ہماری آزاد ہند فوج کے آدمیوں نے ہر چند بدبخت جاپانیوں کو سمجھایا کہ ایک کش لگا لو۔ بس فتح تمہاری ہی ہے۔ کمبختوں نے چلم پکڑ بھی لی اور کپڑا بھی لپیٹ لیا۔ سنتک کا بھی لیا۔ لیکن قے کردی اور بے ادبی یہ کی کہ چلم بھی پھوڑ دی آج اسی کے عذاب میں جھنجھنے بنانے کی بجائے خود جھنجھنے بنے ہوتے ہیں۔ اگر ایک دفعہ بھی کش پہنچ جاتا تو خدا جانے کیا سے کیا ہو جاتا۔ آپ ہی غور کریں کہ جب سینے کی اندر اتنا بڑا شعلہ جائے گا تو دل میں روشنی نہیں ہوگی۔ سگریٹ بیڑی۔ حقہ۔ سگار۔ پائپ (انگریزی بے پانی کا حقہ) سب دل کو اپنے دھوئیں سے سیاہ کرتے ہیں۔ مگر چرس کیسے سے کیسا دل سیاہ کیوں نہ ہو۔ اس کو بھی روشن کر دیتی ہے۔ وائے زرتشت کہاں تم نے جنم لیا۔ کاش اگر تو سرزمین ہند میں ہوتا تو کنشت میں کبھی آتشکدہ نہ ہوتا۔ بلکہ مغاں چہار طرف بیٹھے چوبیس گھنٹے صرف چرس کے کش پر کش [illegible]

کرتے کیونکہ اس کو سوائے اس کش کے شعلے کے کسی اور آگ میں خدا کا جلوہ نظر آ ہی نہیں سکتا تھا۔ ابھی حال کا ذکر ہے کہ کسی تعلیم گاہ میں ایک من چلے طالب علم نے شعراء کے کلام پر اعتراض کر دیا کہ چونکہ یہ سائنس کی رو سے قطعاً صحیح نہیں اترتا اس لئے جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی نہیں بلکہ ہزلیات ہے۔ کیونکہ یہ حضرات جب جب اپنے کلام کے معشوقوں کے وہ حلیے بتاتے ہیں کہ علم کی رو سے ان حلیوں سے کسی انسانی ہستی کا جانبر ہونا ممکن نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ یہ روز از بیسیوں بار مرنیوالوں کا جنازہ میں صرف ایک بار ہی اٹھتا ہے۔ اور اختلاج قلب کا دورہ تک ان کو کبھی نہیں ہوا؟ اس سوال پر استاد لڑکے کو مطمئن نہ کر سکا۔ اس کا چرچا اس تعلیم گاہ میں عام ہو گیا۔ بقیہ اساتذہ نے بھی اس کے حل کی کوشش کی مگر ناکامی ہی رہی۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس کنوئیں کے پاس سے ایک بابا ادھر گذر رہا۔ اس نے جو یہ حال سنا۔ فوراً تعلیم گاہ میں داخل ہوا اور اجازت اس سوال کے جواب دینے کی حاصل کی۔ جب اس کو اجازت مل گئی تو اس نے اس مدرسہ کے طلباء و اساتذہ کو جمع کیا اور اپنی پگڑی میں سے دستی چلم نکال کر اس میں چرس کی گولی بھری۔ اب اس نے حاضرین کو مخاطب کر کے چلم کو دیا سلائی دکھائی اور دو ایک خفیف سے دم لگا کر ایک زور کا کش لگایا۔ تو سینے اور چلم کا شعلہ ایک کر کے دکھایا اب اس لڑکے کو مخاطب کر کے کہا کہ بیٹا عشق الٰہی میں فنا ہونے والے اس طرح جیا کرتے ہیں۔ پھر استادوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آپ میں سے کوئی صاحب ایسا کر سکتے ہیں۔ سب نے یک زبان ہو کر انکار کیا۔ تب کہا کہ شریعت اور طریقت میں یہ فرق ہے۔ دیکھا آپ نے یہ شعلہ اور یہ راکھ خاکی اور موت۔ یہ کہکر مولوی صاحب خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت شہر کے اندر اور بھی مساجد ہیں اور وہاں کے امام اہل توحید ہیں۔ وہ تو سب یک زبان ان بیہودہ اشیاء کو حرام اور برا بتاتے ہیں۔

میاں ذرا یہ کہنا تھا کہ غصے کے باعث مولوی صاحب کے منہ سے جھاگ جانے لگے۔ جھلا کر فرمایا۔ خدا بیڑا غرق کرے ان ملاؤں کا۔ جنہوں نے اسلام کا ستیاناس کر دیا۔ کمبختوں کی ساری عمر صرف بے معنی باتیں کرتے گزرتی ہے۔ اور جو کچھ ہے وہ منطق و فلسفہ کی نذر ہو جاتا ہے۔ جب قبر میں پاؤں لٹک جاتے ہیں تو کمبخت صرف آدھا مسلمان ہوتے ہیں۔ اب انکی لن ترانی شروع ہوتی ہے یہ حرام وہ حرام۔ مدرسے کے لیے لاؤ چندہ۔ اسلام میں یہ چاہئے نہیں۔ وہ حرف عربی زبان کے بول نہیں سکتے لکھ نہیں سکتے۔ حج تک نصیب نہیں۔ مولوی بن بیٹھے۔ اگر ان کو ذرہ بھر دوں کو سمجھاؤ۔ تو موٹی موٹی کتابوں کی سامنے لا کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ کتابیں اسقدر زیادہ اور اتنی ضخیم ہوتی ہیں کہ میرے خیال سے ان کو پڑھنے کے لئے کم از کم ڈھائی سال عمر ہونی چاہئے۔ اس پر طرہ یہ کہ کتاب پر کتاب اٹھاتے جاتے ہیں صفحے پر صفحہ کھولتے جاتے ہیں۔ اور کہتے جاتے ہیں یہ لکھا دیکھا۔ خدا جانے واقعی اس میں وہ لکھا ہوا بھی ہوتا ہے یا اپنی مولویت بنانے کے لیے صرف رعب جماتے ہیں۔ زیادہ کو تو کافر بتلاتے ہیں۔ مجھے ان سے سخت نفرت ہے۔ اسی واسطے تو میں کبھی ان سے ملنا جلنا تک نہیں۔ ہندوستان میں صرف ایک ہستی ایسی پیدا ہوئی تھی کہ جس نے اس گروہ کی طرف توجہ کی تھی مگر کچھ تو میرے پاس بیٹھا۔ اٹھا کر پھرنے کے لئے وقت نہ تھا اور کچھ پھر یہ خبر آگئی کہ محمد علی جناح کی مسلم لیگ کی وجہ سے اس گروہ اور اس ناموری میں نہ صرف صلح ہوئی بلکہ ایک دوسرے کے حلیف ہو گئے میں نے بیعت کا ارادہ ترک کر دیا۔ واللہ مولوی کا غلط مذہب کیا خوب

کتاب ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن کی آیت پیش کر دے۔ کہ بھنگ اور چرس حرام ہیں۔ حالت میں یہ کہتا ہوں کہ اسے
تو بیچ کو گدھے کی لید سے بھروا کر پٹوا دونگا۔ میاں زبان عربی میں تو چرس کا کوئی نام بھی نہیں ہے قرآن میں اس کا ذکر
کیسے آسکتا ہے۔ جن چیزوں کے فوائد بزرگان دین کے بعد معلوم ہوئے ہوں۔ اگر ہم ان جہلا کے کہنے سے اپنے اوپر حرام کریں
تو ذرا ان مولویوں سے پوچھو کہ ہوائی جہاز۔ ریل۔ موٹر بائیسکل وغیرہ کا نام یا انکا ذکر قرآن و حدیث میں کہیں آیا ہے تو پھر آپ
ان پر سوار ہو کر کیوں بھٹکتے ہیں۔ کمبخت کہا کرتے ہیں کہ دونوں چیزیں نشہ کرتی ہیں۔ بھلا جو چیزیں انسان کو واصل باللہ
کردیں وہ ان جہلا کی نظر میں منشی ہیں۔ کمبختوں نے ان میں سے کسی چیز کو کبھی استعمال تک نہیں کیا۔ خود مجھ سے ایک جاہل
کٹ ملا اسی مسئلے پر الجھ گیا۔ بہت کچھ سمجھایا مگر وہ اپنی جہالت پر قائم رہا۔ آخر میں نے بھری ہوئی چلم ایک سلگا کر پیش کی اور
کہا کہ اچھا ایک دم لگاؤ۔ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ نشہ ہے یا نہیں۔ کمبخت نے اس طرح لاحول پڑھی گویا کہ میں ہی مجسم شیطان
تھا۔ غصہ کے مارے کانپ اٹھا۔ صورت پر لعنت بھیجی۔ سرپھروں سے کہہ کر نکلوایا۔ میاں صرف شراب حرام ہے وہ نشہ کرتی ہے
دیکھ لو۔ اس کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے۔ افسوس ہے اس فراست پر کہ جنت کی بہتری سے بھی محروم کردیا۔ بھئی فرشتے
کل گندم کے کھانے سے بھی محروم کردیں گے کہ اس کے کھانے سے حضرت آدم نکالے گئے تھے۔ میاں سو سال کی عمر ہوگئی میرا
باپ اس مسجد کی امامت کرتے کرتے مرگیا اور تیس برس مجھ کو ہو گئے۔ نہ تو والد صاحب مرحوم نے اور نہ یہاں کے آنیوالوں
میں سے کبھی کسی ایک نے یہ کہا کہ یہ ہر دو چیزیں نشہ کرتی ہیں۔ نبو عباس کی دلنشینگی قسم جو شخص ان چیزوں کو نشہ بتلائے وہ
صحیح اسلام پر نہیں۔ طریقت سے بہرہ مند نہیں۔ عشق الٰہی سے اسے مس نہیں۔ جو چیز مجاہدین میں قوت پیدا کردے۔ دنیا کے
غموں سے آزاد کردے وہ حرام ہے۔ ابھی ذرا کہیں ہندو مسلم فساد ہو جائے پھر دیکھو جو ایک مولوی بھی گھر سے باہر نکل آئے۔
اگر نکلے گا تو صرف نماز کے لئے وہ بھی محلہ کی مسجد تک۔ مگر کیا مجال جو ان عشاقان ماری میں سے ایک بھی ایک دن کے لئے یہاں
سے غیر حاضر ہو۔ یہی ہستیاں ہیں جو ان پھر ڈنڈ بیٹھک کرتی ہیں اور بھنگ پیتی ہیں انہیں کے دم سے کھاڑے معمور ہیں۔ یہی
ہیں جنکے خوف سے ہندوستان کے مسلمان مامون ہیں۔ جس شخص نے ان میں سے ایک یا دونوں کو کبھی استعمال نہیں کیا۔
اس نے گویا اپنے دماغ کے پرزوں کو کھولا تک نہیں۔ ان پر شاہوں نے گدیاں قربان کردیں۔ ابھی دیکھو تیمور لنگ کی اولاد
آتی ہوگی۔ کیا مجال جو کبھی وقت سے بے وقت ہو جائیں۔ تیس سال امامت کرتے گذر گئے۔ مگر میں نے ان لوگوں کو آج تک
بے وقت ہوتے نہیں دیکھا۔ انکی دولت گئی۔ حکومت گئی۔ عزت گئی۔ مگر نہ گئی تو بھنگ اور چرس نہ گئی۔ ظہر کی پڑھ کر آتے ہیں۔ عصر تک
گھوٹتے ہیں عصر کی پڑھ کر پیتے ہیں۔ مغرب کی پڑھ کر جاتے ہیں۔ کس کا جاڑا کس کی گرمی کبھی عید بقرعید تک ناغہ نہیں کی حد تو یہ ہے
کہ کبھی ایسا نہیں کہ روزے کیوں نہ ہوں۔ رمضان شریف میں تیسوں یہیں افطار کرتے ہیں۔ اور ایسی سے کرتے ہیں۔ پھر کوئی تراویح
ناغہ نہیں۔ رات کو دو دو بج جاتے ہیں۔ کبھی تو اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ گھر پہنچتے ہی سحری کھاتے ہیں۔ قدر کی راتوں میں جو لوگ
مساجد میں جمع ہوتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں یا جو اس کو بدعت بتاتے ہیں وہ اپنے اپنے گھروں میں خلوت میں اپنے رب کو پکارتے
ہیں۔ مگر یہ اللہ کے پیارے باغ کی ہریاول میں جمع ہو کر اس کو تلاش کرتے ہیں۔ خدا کا بڑا شکر اور احسان ہے کہ انگریزوں کو تجارت
کیلئے ان میں کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اگر خدانخواستہ بنیوں کے منہ کو بجائے افیون کے بھنگ اور چرس دیتے تو ہندوستان میں اسکا ناقابل
برداشت قحط پڑ جاتا۔ میں نے عرض کیا کہ کیا تھا ناحق ہو جاتا نہایت درشت کر دیا کہ خون تو ان ڈھیروں کی شروع علداری سے

خاص نمبر ماہنامہ پنجاب اگزیکٹ دسمبر [illegible]

وزارتی مشن

(جعفری)

وزیرانِ برطانیہ کا سفر
درختوں سے لگ لگ کے بادِ صبا
کلینٹ اٹلی ہوئے گلفشاں
اقلیتوں کی ہے ضد بے محل
ہے کیا بات اُن کی عنایات کی
انھا ملک ہندوستاں میں یہ شور
کرسپی اور الیگزنڈر پختہ کار
ڈکوٹے میں اڑ کر مشن نے کہا
وہ خضر کہن سال تھا رہنما
وزیرِ کہن تھا امیرِ مشن
مریض غلامی کی تھا وہ دوا
وہ پیتھیک بھی تھا اور لارنس بھی
کراچی میں پہنچا ہوائی جہاز
تو جیلوں سے لیڈر نکلنے لگے
ہر ایک جا سے لیڈر نے بھیجا پیام
یہ آگے کو کہہ کر بڑھی کانگریس
کہا لیگ نے یہ طریقہ ہے ٹھیک
چلے اپنی اپنی سجا کر بساط
یہ تھا لیگ اور کانگریس کا سماں
مشن مثل سنبدر کے تھا درمیاں
ادھر بھنگیوں پر یہ آئی بلا
کہ مانو نہ مانو میں مہماں ہوں
یہ بولے پٹیل ایک انداز سے
مسلماں سے اچھے ہیں مسٹر پٹیل
مشن نے دیا الغرض ایک بیان
اچھلتا ہوا اور پھلتا ہوا
چلا جب قفس کو بنانے چمن
لگی وجد میں بولنے واہ واہ
کہ آزاد ہوتا ہے ہندوستاں
کہ سوراج آیا بہ بانگِ دہل
مزید روٹی ہے خیرات کی
کہ کھیلیں گے ہم بادشا اور چور
ہوئے رہوار ہوا پر سوار
کہ ہے تم اسیر کمند ہوا
کہ جس نے سکندر کو دھوکہ دیا
سیاست کے تھے یاد سب اُس کو فن
کہ تھی ہومیوپیتھیک اس کی ادا
وہ کوا بھی تھا اور تھا ہنس بھی
اور اترے سیاست کے نغمہ نواز
بیانوں کے چشمے اُبلنے لگے
پہاڑوں کے روزن زمیں کے مسام
تمہارے غیراز تو فریاد رس
اگر ہو سکا ہم بھی مانگیں گے بھیک
برہمن مسلماں اور سکھ ذات
لڑیں جیسے روٹی پہ دو بلیاں
کترتا تھا روٹی یہاں سے وہاں
کہ شودر کے گھر جا بڑے دیوتا
اگر چین ہو تم میں جاپان ہوں
لڑا دو ممولے کو شہباز سے
دیے ہندو کے سر میں چنبیلی کا تیل
بہیں جیسے برسات میں ندیاں
وہ سکھوں کو بالکل کھلا ہوا

ہو ورد جن کے کہتے تھے شیڈیولڈ کاسٹ
کہ دھوبی کے کتے کا گھر ہے نہ گھاٹ

خاص نمبر ماہنامہ پنجابی گزٹ ۱۹۴۶ء

ادارہ اس رائے سے متفق نہیں

احسان الٰہی چاندنہ

ڈرنٹے

ڈائریکٹ ایکشن ڈے

مسلمانوں نے اپنی قومی جماعت کے فیصلے اور قائد اعظم کے حکم سے سولہ ۱۶ اگست کو منانے کا فیصلہ کیا۔ یہ دن سارے ملک میں زیادہ سے زیادہ پر امن طریقے سے منانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اس دن قانون شکنی نہیں کی جائے گی۔ صرف ہر جگہ جلسہ کر کے لوگوں کے اس فیصلہ کا جو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے مشن تجاویز کو رد کرنے اور برطانیہ کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن کرنے کے متعلق کیا تھا۔ لب لباب سمجھایا جائے

بنگال کی بد قسمتی سے وہاں کی لیگ منسٹری نے ۱۶ تاریخ کو عام پبلک کے مفاد کے مد نظر عام چھٹی کا دن قرار دیدیا۔ یہ بات مخالف پارٹی کو سخت ناگوار گذری اور انہوں نے نہ صرف ہوئے خلاف اسمبلی میں تحریک اٹھانے کی کوشش کی بلکہ ان کا سارا پریس بغیر سوچے سمجھے کہ ان کی شر افشانی کے برے نتائج کیا حاصل بھی ہو سکتی ہے زہر اگلنے میں مصروف رہا۔ پبلک جلسے کئے گئے اور ان میں عام مسلمانوں کے خلاف عام طور سے اور وزارت کے خلاف خاص طور سے جی بھر کے نفرت کا زہر اگلا گیا

۱۶ اگست کی صاف اور چمکیلی صبح گو کہ آسمان صاف تھا لیکن سیاسی فضا خراب تھی اور ڈر تھا کہیں سورج دیوتا ڈوبنے سے اور آسمان پر شفق کی سرخی پھیلانے سے پہلے زمین کو انسانی خون سے رنگین ہوتا نہ دیکھ جائے۔ قاسم کو بھی یہی ڈر تھا کہ گھر سے نکلنے کی صورت میں کسی مصیبت کا سامنا کرنا نہ پڑ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ دوپہر کو جلسہ میں شامل ہونے کا ارادہ اس نے ترک کر دیا تھا وہ ایک متوسط درجہ کا آدمی تھا۔ اور ڈرتا تھا کہ اسے کچھ ہو گیا تو اس کے چھ دیچھوٹے چھوٹے بچے بوڑھی ماں اور غریب بیوی غرض سب کے سب بن آئی مر جائیں گے مگر جب اس کے ساتھیوں نے اسے آکر سمجھایا تو وہ بھی حوصلہ کر کے ساتھ چل پڑا۔ ابھی راستہ ہی میں تھا کہ سنا کہیں جھگڑا ہو گیا ہے۔ وہ واپس گھر آ گیا۔ ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ پڑوسی نے آواز دے کر کہا کہ میاں گھر سے باہر نہ نکلنا ابھی ابھی کچھ لوگ آئے ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں کا جلوس جب شہر کی ایک شاہراہ سے گذر رہا تھا تب ہندوؤں سے ٹکراؤ ہو گیا۔ ابھی یہ لوگ باتیں کر رہی رہے تھے کہ کچھ اور پڑوسی آتے دکھائی دیئے، رنگ زرد، چہرے فق، ـــ ارے بھئی کیا ہوا؟ ایک ہندو علاقہ سے گذر رہے تھے وہاں سے ہم پر پتھر آنے لگے جان بچا کر بگٹٹ بھاگے چلے آرہے ہیں۔ شیخ حمید بھی پاس کھڑے ہوئے سب کچھ سن رہے تھے انہیں غصہ آگیا اور کہا "اچھا ان کافروں کی یہ مجال! آؤ میرے ساتھ کون کون مائی کا لال آتا ہے چند پر جوش اور گرم مزاج کے لوگ ان کے ہمراہ ہوئے تھوڑے سے فاصلے پر گئے تھے کہ چند ہندو جاتے نظر پڑے اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کا نقشہ کھینچنے کی قلم میں طاقت نہیں مسلمان ہندوؤں اور ہندو مسلمانوں کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ عورتیں اور بچے کسی پر رحم ، . . . . اور دکھایا گیا ملکہ جو سامنے آیا تھا۔ کسی نے یہ نہ دیکھا کہ یہ نیشنلسٹ ہے یا لیگی

پھر سناٹا ـ موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ مگر کچھ چند سربریدہ لاشیں پڑی تھیں اور مجاہدانِ اسلام "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے آگے چل پڑے۔ ہندوؤں کے نعرے بھی مدہم نہ تھے۔

محلہ ہری رام کا سب پر جوش اور طاقتور نوجوان قتل ہو جائے اور محلہ والے خاموش بیٹھے رہیں۔ یہ ان کی صریحاً بے عزتی تھی

ان کی بہادری اور مردانگی پر حملہ تھا اور یہ ان سے برداشت نہ ہو سکتا تھا ان کی آن میں جو سات سو ہرم کے نام پر جان قربان کرنے کو اکٹھے ہو گئے۔ محلے میں جتنے مسلمانوں کے گھر تھے انہیں تباہ کر دیا گیا جتنی مسلمانوں کی دکانیں تھیں سب لوٹ لی گئیں جو مسلمان محلہ میں آیا یا وہاں سے گذرا اُسے سنگسار کر دیا گیا اور اس پر بھی جب غصہ کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تو اہنسا کے پجاری ہاتھوں میں لاٹھیاں، چھرے کرپانیں، اور پٹرول کے ٹین لئے دھرم کی لڑائی لڑنے چل کھڑے ہوئے سب سے پہلا نزلہ عارف والی بستی پر گرا۔ یہ لوگ کچے مکانات میں رہتے تھے پوری کی پوری بستی میں قریبًا ۵۰ مسلمان آباد تھے تندر آتش کر دی گئی۔ آگ سے ڈر کر جو باہر نکلا پار ہو گیا۔ عورت بچے بوڑھے جوان کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ عارف کے چاروں طرف آگ کا ایک سمندر تھا جو لہریں لے رہا تھا، سرخ سرخ شعلے عفریت کی سی زبانیں کھولے اس کی طرف لپکے چلے آ رہے تھے۔ یکایک وہ بھاگا۔ مکان کی پچھلی طرف اس کے ایک ہندو دوست کا مکان تھا وہ وہاں کود گیا اس ہندو دوست نے اُسے دھوتی کرتہ دیا تب وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا اور جب وہ میرے سامنے دہلی میں بیٹھا اپنی مصیبت کی داستان سنا رہا ہے میں اخباروں میں پڑھ رہا ہوں کہ ہندو علاقوں میں مسلمان اور مسلمان علاقوں میں ہندو ذبح کر دیے گئے ان کی دکانیں لوٹ لی گئیں یا انہیں آگ لگا دی گئی۔ چاروں طرف خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں انسان نما درندے اپنے ہم جنس کو چیر پھاڑ رہے ہیں۔ آگ کی لپٹیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ ہر طرف سے آہ و پکار اور ماتم کی آوازیں آ رہی ہیں شہر جہنم کا نمونہ بنا ہوا ہے اور لیڈر یہ سوچ رہے ہیں کہ "ڈائرکٹ ایکشن ڈے" منانے سے ہمارا یہ مطلب نہ تھا یا ڈائرکٹ ایکشن ڈے کی مخالفت سے یہ غرض تو نہ تھی کہ یوں درندے انسانیت کے ماتھے پر بدنما داغ اور ایک دوسرے کی لاشوں پر اپنی بہادری کا محل کھڑا کریں۔

نظر بر خطبۂ صدر

راشٹرپتی مولانا ابوالکلام صاحب آزاد

وہی کفار جن کی راہ نمائی پر اعتماد کی تلقین کی جا رہی ہے کبھی ان کے متعلق ارشاد تھا۔

"کفار جو واقعات کو جھٹلاتے ہیں۔ حقیقتِ حال کو جھٹلاتے ہیں۔ اصلیت کو چھپاتے ہیں۔ ماجرائے وقوع کو غلط بتاتے ہیں۔ نقضِ امن کرتے ہیں اور پھر اس کو حفظِ امن کا لباس پہنا لیتے ہیں۔ قتل کرتے ہیں۔ اور اسے جاں بخشی دکھاتے ہیں۔ بات کچھ ہوتی ہے مگر اپنی بات کی پچ میں جمہور (پبلک) کو کچھ اور جتلاتے ہیں۔ ایسے کی اطاعت منع ہے۔ ان کی فرمانبرداری جرم ہے۔ گناہ ہے۔ موجب عذاب ہے۔ اس قلادے کو توڑ دینا چاہیئے۔ اس اطاعت سے تبری فرض ہے۔ اس فرمانبرداری پر نافرمانی کو ترجیح ہے۔ ان کی تو خواہش ہے کہ مسلمان مداہنت کریں۔ خوشامد کریں۔ ریاکاری کریں۔ منافقت کریں تو انہیں بھی اظہارِ نفاق کا موقع ملے۔ مگر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ صورت کس قدر خطرناک ہے؟ کفار کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزتِ نفس و شرف کا انہیں لحاظ تک نہیں۔ قسمیں کھاتے ہیں۔ حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے زبان سے سب کچھ کہتے ہیں مگر ہاتھ سے کام لینے کے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کے مطیع رہنا ذلت کی بات ہے۔ اسلام اپنے فرزندوں کو ان کی اطاعت سے باز رہنے کی ہدایت کر رہا ہے کہ خبردار یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں۔ ان کے حلف پر نہ جانا۔ یہ ادھر کی بات ادھر لگاتے ہیں۔ قوم میں تفرقے پیدا کرتے ہیں۔ منعِ خیر کے لئے نہایت مبالغے کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ تعدی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے۔ سرکشی ان کی خو ہے .... بھلا پھر ایسے لوگوں کی اطاعت کیونکر پسندیدہ ہو سکتی ہے؟ ان کو تو اپنے مال و اولاد کی فراوانی و کثرت یعنی فرطِ دولت و تکثیر آبادی کی وجہ سے اتنا گھمنڈ ہو گیا ہے کہ آیاتِ قرآنی کو پرانے ڈھکوسلے کہنے لگے ہیں۔" (الہلال ش ۱۹۱۳ ۲۷)

دوسری جگہ رقم طراز ہیں:-

"کفار سے مسلمانوں کو ساز باز نہ رکھنی چاہیئے۔ ان سے بے تعلق ہونا لازم ہے۔ جو ساز باز رکھتے ہیں جنہیں

ان سے بے تعلق رہنے میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مشکلات اور مصائب کا اندیشہ ہو وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو پشیمان ہونا پڑے گا۔ اسلام کو فتح نصیب ہوگی اور مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرت کاملہ کوئی اور انتظام کردے گی۔ اسوقت معلوم ہوگا کہ "الآن قد ندامت ولا ینفع الندم" اس وقت تم نادم ہو جائے جب ندامت مفید ہی نہ ہی" (مضامین آزاد حصہ سوم)

کہاں تک لکھتے چلے جایئے۔

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

آنکھوں والے کے لئے اتنا ہی کیا کم ہے۔ وہ یہ کچھ دیکھکر یقیناً متعجب ہوگا کہ بالآخر کیا بات ہے۔ کہ مولانا صاحب یہ سب کچھ جانتے ہوئے آج گمراہی و ضلالت کے اس قدر عمیق گڑھوں میں جاگرے ہیں۔ اور اپنے ہی گرنے پر اکتفا نہیں۔ قوم کو بھی اسی جہنم کی طرف بلائے جارہے ہیں۔ یقیناً یہ سوال قدرتی طور پر آپ کے دل میں پیدا ہونا چاہیئے۔ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں خود مولانا صاحب سے سنئے۔ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے تو اس کی مقدم کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے سوچنے والے دماغوں اور دیکھنے والی آنکھوں کو اپنے قابو میں کرلے۔ تاریخ آپکے سامنے ہے۔ زمانہ کی شہادات آپ کے روبرو ہیں انہیں دیکھیئے اور غور کیجئے کہ دنیا کس طرح اس اصول پر عمل پیرا ہوتی چلی آرہی ہے۔ یذبحون ابناءھم (یعنی اسرائیلی کے بیٹوں کا قتل) کچھ فرعون مصر کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا۔ دنیا میں ہر مستبد قوت اس قسم کے قتل کرتی چلی آئی ہے اور کر رہی ہے۔ فرق صرف آلاتِ قتل و ذرائع استعمال کا ہے۔ یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔ ہندو نے جب یہاں مسلمانوں کو غلام بنانے کی ٹھانی تو انہوں نے بھی سب سے پہلے اسی حربہ کو استعمال کیا۔ اور مسلمانوں میں یذبحون ابناءھم شروع کردیا۔ ملت اسلامیہ کے ہونہار سپوتوں میں سے کچھ ایسے تھے جو ہندوؤں کے دام فریب سے بچ کر نکل بھاگے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو وہیں کے کندہ گئے۔ دنیا میں زنجیریں صرف لوہے کی ہی نہیں ہوتیں اور چیزوں کی بھی ہوتی ہیں۔ سنئے کہ مولانا صاحب کیا فرماتے ہیں۔

"سالک راہ حریت و صداقت کے پاؤں میں اس کے دشمن لوہے کی زنجیریں ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ آیندہ کے منازل طے نہ کرسکے۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ زنجیر لوہے کی جگہ سونے کی ہوتی ہے۔ وہ اس طلسمی زنجیر کو دیکھ کر راہ و رسم منزل صداقت پرستی سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف دوڑ جاتا ہے اور مسکراتا ہوا دشمن کے ہاتھ سے لیکر اپنے پاؤں میں ڈال لیتا ہے۔ یہ طلسمی زنجیر کیا ہے؟ امید زر اور طمع جاہ!

لیکن آہ! کس قدر دنی الوجود کم ظرف ہے وہ انسان جو صرف حب مال اور الفت زر کے لئے خدا کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے اور ایک فانی شئی کے لئے سچ و صداقت کی باقی لازوال دولت کو ہمیشہ کے لئے کھو دیتا ہے۔ وہ چاندی سونے کے سکوں کو اگر خدا کے لئے اور اس کی سچائی کے لئے کھودے تو خدا اسے سچائی کے ساتھ واپس دلا سکتا ہے۔ پر جو خدا کی محبت کو دولت کے لئے کھوتا ہے وہ تو اسے دولت نہیں دلا سکتی پھر انسانیت کے لئے کیسی دردانگیز موت ہے کہ ان آسمان کی سب سے بڑی امانت کو زمین کی سب

بڑی ذلت کے لئے لکھ دے؟

کتنے بڑے بڑے تاجدار پرہیبت فاتح، عظیم الشان سپہ سالار، نامور محبِ وطن اور محبوب القلوب وملت پرست انسان ہیں جن کی حق پرستانہ عزائم کی استقامت کو اسی لعنتِ طمع نے ڈگمگا دیا۔ انہوں نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنی فوج اور در اصل اپنے خدا اور اس کی صداقت سے غدّاری کی، اور دشمنوں کے لئے دوستوں کو، غیروں کے لئے اپنوں کو، ظالموں کے لئے مظلوموں کو بے رحم فاتحوں کے لئے بیکس مفتوحوں کو، اور شیطان کے تخت کی زیب و زینت کے لئے خدائے رحمٰن کے دربار اجلال کی عزت و عظمت کو چھوڑ دیا! تاریخ کے صفحات ہمیشہ سے اسی درد کے ماتمی ہیں۔ قوموں اور ملکوں کی داستانیں ہمیشہ اسی ناپاک سرگذشت پر خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ اور دولت پرستی کی ملعون نسل آغازِ عالم سے ناصیۂ انسانیت کے لئے سب سے بڑا بے عزتی کا داغ رہی ہے فی الحقیقت راہِ حق پرستی کی سب سے بڑی آزمائش چاندی کی چمک اور سونے کی سرخی ہی ہے اور اگر اس منزلِ پرخطر سے تم گذر گئے تو پھر تمہاری ہمت بے پروا اور تمہارا عزم ہمیشہ کے لئے بے خوف ہے۔ یہی طمع کا خبیث دیو ہے۔ جس کا پنجہ بڑا ہی زبردست اور جس کی پکڑ قلبِ انسانی کے لئے بڑی ہی مضبوط ہوتی ہے اسی نے فرزندانِ ملت سے غیروں کے آگے مجری کرائی ہے۔ یہی پکڑ پکڑ کے ابنائے وطن کو لے گیا ہے اور غیروں کے قدموں پر اخلاق کی ناپاکی اور جذبات کی کثافت کے کیچڑ میں گرا دیا ہے۔ تاکہ اپنے وطن، اپنی سرزمین، اپنے مذہب، اپنی قوم، اور اپنے بھائیوں کے خلاف جاسوسی کریں! اسی نے بڑے بڑے مدعیانِ خدمتِ ملک وملت کی برسوں کی کمائی ایک دن کے اندر ضائع کر دی ہے اور انہیں چارپایوں کی طرح گرا دیا ہے تاکہ برسوں کی سچائی کو ایک لمحہ کی طمع پر قربان کر دیں۔ آہ! یہی انسانیت کے لئے وہ روحِ خبیث ہے جو بڑے بڑے پاک جسموں، بڑی بڑی مقدس صورتوں، بڑے بڑے پُر از علم وعمل والوں کے اندر حلول کر گئی ہے۔ اور فرشتہ سیرتوں نے شیطانوں کے، اور ملکوتی صفات ہستیوں نے خونخوار عفریتوں کے سے کام کئے ہیں۔

آہ! ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہمارا قلب خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ رہا ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آ رہا ہے۔ ہاتھوں میں قلم کانپ رہا ہے کہ اے اللہ! جو تیری درگاہ سے دھتکار دیا جاتا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوتا ہے! اے مالک الملک صدقہ اپنی رؤف الرحیمی کا! غربت و افلاس، بھوک اور پیاس کی زندگی دیدینا۔ لیکن طمعِ جاہ ہوسِ زر کی نظر فریب افسونگرانہ کشش و جاذبیت سے بچائے رکھنا۔ کہ جو اس سحر سے مسحور ہو گیا۔ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گیا۔ اور جو تیرے در سے ٹھکرا دیا گیا۔ اس کا کہیں ٹھکانا نہ رہا۔ لغزش تو ہر ایک کی خطرناک ہوتی ہے۔ لیکن ایک عالم کی لغزش تو وہ ہے جس کے متعلق خود نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ

"میں اپنی امت کے حق میں سب سے زیادہ جن باتوں سے ڈرتا ہوں وہ یہ ہیں -

(۱) عالم کی لغزش

(۲) منافق کا قرآن سے استدلال

(۳) اور گمراہ کرنے والے سردار (لیڈر)

کہتے ہیں کہ حضرت امام اعظمؒ ایک دن بازار سے گذر رہے تھے - بارش ہو رہی تھی - اور راستہ میں کیچڑ تھی - ایک لڑکا ادھر سے گذرا - تو آپ نے فرمایا کہ بیٹا احتیاط سے چلو - قدم نہ پھسل جائے - گر جاؤ گے - اس نے مڑ کر دیکھا اور آپ کو پہچان کر کہا کہ حضور! میرے گرنے کی فکر نہ کیجیے - اپنے آپ کو سنبھالیے - میں گرا تو خود ہی گروں گا - اور اگر (خدا نہ کردہ) آپ گر گئے تو ساری دنیا گر جائے گی -

کس قدر صحیح تھا اس بچے کا تبصرہ - زید و بکر گمراہ ہوں تو ان کی گمراہی انہی کی ذات تک محدود رہے گی - لیکن مولانا ابوالکلام آزاد صاحب صحیح راستہ چھوڑ جائیں تو پوری کی پوری قوم کو لے ڈوبیں - ایک لیڈر کی یہی لغزش ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے -

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ ۲۹-۲۸

کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا - جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناسپاسی سے بدل دیا -

اور اپنی قوم کو تباہی و بربادی کے جہنم میں لے گرے -

لیکن اللہ کا شکر ہے کہ قوم بروقت متنبہ ہو گئی اور جہنم میں گرنے سے بچ گئی - اے کاش آج بھی اللہ تعالیٰ ان جہنم میں گرنے والوں کی چھنی ہوئی بصارت انہیں واپس دیدے اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ فریب نفس نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے - کہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے - بشرطیکہ دلوں اور آنکھوں پر مہر ہی نہ لگ چکی ہو

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ -

قتیل شفائی

دو سائے

دور ندی میں شام کی دیوی جھانک رہی ہے
اک چرواہی اپنی بھیڑیں ہانک رہی ہے

وہ نیلے آکاش پہ چمکا پہلا تارا
اک دہقاں نے اپنے سر سے بوجھ اتارا

شہتوتوں سے ہٹ کر چاند کا چہرہ ابھرا
دو ٹوٹی سی جھونپڑیوں پر سونا بکھرا

اونگھ رہا تھا دیر سے ان کھیتوں کا منظر
چونک اٹھا ہے دو سایوں کی آہٹ پاکر

(خاص نمبر ماہنامہ پنجابی گزٹ ۱۹۴۷ء)

شبستان

انعام الرحمٰن چاندنہ

"کیا میں آپ کا اسم شریف دریافت کر سکتا ہوں" — "کیا میں دریافت کر سکتی ہوں کہ اس کی ضرورت آپ کو کیوں محسوس ہو رہی ہے؟ —"

"او صاحب واہ! چاہنے والے کو اپنی محبوبہ کے نام کا بھی علم نہ ہو تو لعنت ہے ایسے چاہنے والے پر —"

"اوہو! خیر سے آپ میرے چاہنے والے ہیں۔ ذرا گندے نالے میں جا کر اپنا منہ دھو آؤ — یہ منہ اور مسور کی دال — تم — اے عشق چلے آتے ہیں ہم تیری نگریا — اس نگر کے رہنے والے برا بھلا ہم کو کہیں وہ سننا ہم چپ کا — ورنہ یقین مانو — اس نگر کی رہنے والیوں کی قسم اگر ہمارے دنیا میں کوئی اس طرح کہتا تو میں ایک ڈنڈے سے سر پھوڑ دیتا — لیکن میری سمجھ میں نہ آیا! بانو کہ مجھ سے ایسی بیگانگی کا کیا مطلب ہے۔ آخر تم مجھ سے کیوں اس طرح منہ موڑ رہی ہو —"

بانو — مولوی صاحب! یہاں دھرم شالہ نہیں کھلا ہوا کہ آئے اور آرام کر کے چلے گئے۔ یہ طوائف کا کوٹھا ہے اور طوائف انسان کی نہیں روپوں کی بھوکی ہوتی ہے۔ اسی کے کارن وہ اپنی عصمت — عصمت کے خریداروں کے ہاتھ فروخت کرتی ہے۔ آج آپ یہاں پورے چھ ماہ بعد تشریف لائے ہیں۔ اس مرتبہ آپ شراب کے دام نہیں دے کر گئے تھے جو کہ بازار سے منگائی گئی تھی بلکہ یوں ہی باتوں ہی باتوں میں مجھے بہلا گئے — اس کے بعد بھی متعدد بار میں نے آپ کو اس کوچے سے گذرتے دیکھا لیکن آپ دام دینے یہاں واپس تک نہ آئے۔

مولوی صاحب۔ — دراصل ان دنوں میرا ہاتھ ذرا تنگ تھا مگر تم گھبراتی کیوں ہو۔ اس مرتبہ سب حساب بیباق کر دوں گا۔ ارے تم کیا سمجھتی ہو۔ اب میں ملازم ہوں — تم فکر مت کرو۔ (نوٹوں کا گڈا دکھاتے ہوئے) چلو اندر چلو۔ آج عید کے دن ہم تم کو نہال کئے دیتا ہے — سب کچھ تمہارا ہے جب ہم خود تمہارے ہیں —" بانو مولوی صاحب کو عزت کے ساتھ پان بنا کر دیتی ہے۔ مولوی صاحب پانچ کا نوٹ نکال کر تھالی میں ڈال دیتے اور پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے "تو پھر ہو جائے کوئی غزل ہو جائے۔" طبلے پر تھاپ پڑتی ہے اور بانو گانا شروع کرتی ہے — "اے عشق چلے آتے ہیں ہم تیری نگریا" — مولوی صاحب کی واہ واہ سے کمرہ گونج اٹھتا ہے — "ارے کمبخت بانو تم نے ہماری پسندیدہ چیز تو منگوائی نہیں — جلد منگوا کر دو — مجھ پر تمہاری اس مدھر آواز کا ہلکا ہلکا سا نشہ چھاتا جا رہا ہے — میں بے خود سا ہو رہا ہوں — میں چاہتا ہوں کہ یہ نشہ دوگنا ہو جائے اور میں ہوش و حواس کھو جاؤں اور مجھ میں یہ محسوس کرنے کی قوت نہ رہے کہ میں تمہارے کمرے پر ہوں بلکہ یہ سمجھنے لگوں کہ میں جنت الفردوس میں ہوں اور تم وہاں کی حور ہو جو میرے آغوش میں ہے — لاؤ جلد لاؤ۔ لاؤ بانو بھر بھر کے جام پلاؤ — آج مجھے مدہوش کرنے میں کسر نہ رہ جائے — شراب آتی ہے۔ دور جام پر جام چلنے لگتے ہیں۔ گانا پھر شروع ہو جاتا ہے۔"

اے عشق چلے آئے ہیں ہم تیری نگریا" مولوی صاحب نشے میں پاگل ہو کر چیخنے لگتے ہیں۔ واہ بانو واہ ___ تم بیشک جنت کی حور ہو۔ ہاں اب میں جنت میں ہوں ___ آؤ ___ بانو ___ میرے نزدیک آ جاؤ ___ دروازے سے دو نوجوان جن کے گلے میں ہار پہنے، قہقہے لگاتے سگریٹ کے دھوئیں کے چھلے اڑاتے اندر داخل ہوئے ___ ارے بھئی سلاملیکم (اسلام علیکم)

بانو:- آئیے سرکار آج بہت دن بعد رخ کیا کیا بھول گئے تھے کنیز کو ___ ایک ارے بھئی تم کوئی بھولنے کی چیز ہو۔

دوسرا:- دراصل بات یہ ہے کہ ہم تہواروں کے موقعہ پر ادھر کا رخ کرتے ہیں ___ یا کبھی یار دوست گھسیٹ لاتے ہیں۔ آج عید کا دن تھا ہم نے سوچا ___ (مولوی صاحب کو غور سے دیکھنے لگتا ہے)۔

بانو - ہاں ہاں آپ بات کرتے کرتے کیوں رک گئے (مولوی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ___ ان کو بخش دیجئے ___ یہ تو اس وقت جنت میں ہیں ___ "نہیں نہیں یہ بات نہیں ___" بانو نے پان کی تھالی آگے بڑھائی ___ دونوں نے پان کی گلوریاں منہ میں رکھ لیں اور پانچ روپے تھالی میں ڈال دیئے"___

ایک ساتھی دوسرے ساتھی سے:- اماں حمید! ذرا غور سے دیکھنا یہ تو مجھے وہ مولوی صاحب نظر آ رہے ہیں جو ہم کو عیدگاہ میں وعظ فرما رہے تھے اور انہوں نے ہی نماز پڑھائی تھی تم کو یاد ہے انہوں نے اپنے وعظ میں کیا فرمایا تھا کہ جو لوگ دنیا میں شرابیں پئیں گے اور رنڈی بازی کریں گے۔ اُن کو محروم کر دیا جائے گا۔ جنت کی اُس شیریں انگور کی شراب سے جس کے ذائقہ کی نظیر نہیں اور جنت کی وہ حوریں بھی نہیں ملیں گی جن کے لئے پروردگار عالم نے وعدہ کیا ہے___" لیکن اس وقت تو یہ خود شراب کے نشہ میں مدہوش ہے___"

مولوی صاحب (نشہ کی حالت میں بڑبڑاتے ہوئے) لاؤ بانو گلاس اور لاؤ ___ میرا نشہ کافور ہوتا جا رہا ہے۔

حمید:- (مولوی صاحب کو جھنجھوڑتے ہوئے) مولوی صاحب تم تو صبح وعظ میں فرما رہے تھے کہ جو دنیا میں شراب پئے گا اُسے جنت کی شیریں شراب نہیں ملے گی۔ اور جو رنڈی بازی کرے گا۔ اُسے جنت کی حوروں سے محروم کر دیا جائے گا۔ اور آپ یہ حرکتیں کرتے ہیں۔ جانتے ہیں آپ کا حشر کے دن کیا انجام ہوگا۔

مولوی صاحب:- میں دنیا کے لئے کہتا ہوں اپنے لئے نہیں۔ مجھے اس کا عقیدہ نہیں اور میاں سو جب حشر کا دن آئے گا ___ اس وقت دیکھا جائے گا۔ حفیظ بانو تم کیوں خاموش ہو گئیں ___ ہاں ناچتی جا اور گاتی جا ___ نظروں سے دل بھر مائے جا ___ تڑپائے جا ___ تڑپائے جا حفیظ

بانو - تم چپ تم ان بیوقوفوں کے وعظ پر غور بھی نہ کرو۔ جو میرے وعظ پر عمل نہیں کرتے اور میرے منع کرنے کے باوجود اس گندی نالی میں غوطے کھانے چلے آتے ہیں۔

حمید - آپ کو شرم نہیں آتی جب آپ خود ہی عمل نہیں کرتے تو ہم لوگ جو دنیوی معاملات اور گناہ و ثواب کے کاموں سے اس قدر واقف نہیں کہاں سے عمل کر سکتے ہیں۔

مولوی صاحب:- تم ابھی ناتجربہ کار ہو تم میرا مطلب ہی نہیں سمجھے تم سمجھتے ہو یہ بال میں نے دھوپ میں پکائے ہیں میں نے پچپن سال کی طویل عمر میں یہی سیکھا کہ میں کیوں مروں اور باسی ٹکڑے کھاؤں ___ میں نے ٹھوکریں کھا کر اب یہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ "دنیا جھکتی ہے جھکانے والا چاہیئے" - آج کل سچائی کی کوئی قدر نہیں۔ ___ فریب اور دھوکہ دینے والے ہمیشہ سکھ سے رہتے ہیں۔ اب میں دنیا کو فریب دیتا ہوں ___ میں محسوس کر رہا ہوں کہ دنیا میری طرف جھکتی چلی جا رہی ہے دنیا کو میرے چہرے پر نفس نظر آتا ہے ___ دنیا مجھے ایک بزرگ

سمجھتی ہے اور میں خوش ہوں - جانتے ہو مجھے اس سال صرف
زکات ہی زکات کے ۱۵/- روپے ملے ہیں اور آج صبح عیدی
ہی عیدی میں ۵/- روپے کے قریب جمع ہو چکے ہیں اور ابھی
کل کا دن باقی ہے -- میں خوش ہوں تم کو چاہیئے کہ تم میری
طرف مت دیکھو بلکہ اپنا کام کرو تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی زندگی کی
خوشیوں کو تم لوگوں کی خاطر پامال کر دوں - اپنے اس دل کو
نکال کر پھینک دوں - تم پاگل ہو - بیوقوف ہو — میں پاگل نہیں
میں تمہاری طرح بیوقوف نہیں — میں جانتا ہوں تم یہاں سے
چلے جاؤ — بانو کو تمہاری ضرورت نہیں میرے پاس اتنے دام
موجود ہیں کہ میں تمہارا حصہ بھی دے دوں گا - تاکہ بانو کو کوئی
اعتراض نہ ہو -- میں تمہیں زیادہ دے دوں گا میرے پاس بہت کچھ ہے

دنیا میری طرف جھک رہی ہے -

پیسے روپے کی کمی نہیں — بانو جام لاؤ --- میرا نشہ
کافور سا ہوتا جا رہا ہے — لاؤ جلدی لاؤ — (مندان سے
کہو یہ تشریف لے جائیں -- (جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر
منہ کو دیتے ہوئے) جب نے بانو کی تھالی میں رکھا تھا اس
کی بانو کو ضرورت نہیں جاؤ پھر آنا — اس وقت مجھے مدہوش
ہونے دو — میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں —

سب کچھ —

حقیقہ شراب کے نشے میں ترشیلان "خدا کو بھول گیا اب
دنیا بھولنا چاہتا ہے - دونوں چلے جاتے ہیں —
مولوی کی قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھتا ہے (مولوی صاحب
بڑبڑاتے ہوئے) بیوقوف ہیں سالے ! ان کو کچھ خبر نہیں
بانو کچھ سہمی سہمی سی معلوم ہو رہی ہے -
(مولوی صاحب بڑبڑاتے ہوئے) دنیا بیوقوف ہے ان کو نہیں
معلوم کہ میں ان کا دیا ہوا روپیہ کہاں خرچ کرتا ہوں —
اسی کو کہتے ہیں دنیا جھکتی ہے — جھکانے والا چاہیئے - ہاہاہا

یونس باغپتی

الٰہی حسن خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

آج پھر شادی کا تذکرہ چھیڑے ...... حسب دیکھو ... شادی ہو رہی ہے آخر بدمذاقی۔ کیسی کیسی باتیں ہو رہی ہیں۔ کہ لگے ہیچ میں ٹانکہ اڑانے۔

شادی ..... میں پوچھتا ہوں آخر یہ ہوا کیا ہے؟

"تم کیا جانو شادی کسے کہتے ہیں۔ شادی کرو تو معلوم ہو

تم تو لفظ شادی کی ابجد سے ناواقف ہو۔

"محض پانی کا ایک ننھا بلبلہ اور بس"

"پانی کا بلبلہ ہی سمجھ لو لیکن ہے دلچسپ!

"کسی سے کم تو نہیں"

"حسن [illegible] سب ہی۔ لیکن بغیر دیکھے چاند کی باتیں آج ہی سنی ہے۔

"تمہارے چاند کو تو نہیں دیکھا بزرگوں سے تو سنا ہے"

بزرگوں نے خوب کہی۔ یہ تو صرف دل توڑنا جانتے ہیں۔

"دلیل بھی تو ہوتی ہے"

"دلیل ویل کچھ نہیں ...... کچھ اپنا دکھڑا کچھ گئے گزرے دنوں کے قصے اور بس! یہ ہے ان کی دلیل۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو ...... ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا ... ہاں ذرا تصور کرو میاں بیوی ایک دوسرے سے بالکل ناآشنا ... بالکل اجنبی کیونکہ ہماری تہذیب یہی ہے نہ صورت دیکھی نہ دکھلائی۔ رہتی گھر میں پابند [illegible] ناآشنائی کی صورت میں [illegible] دونوں کے دلوں میں ولولے، جوش ایک دوسرے کو دیکھنے کا اشتیاق ..... اشتیاق بھی کیا جو لذت اور دلربائی کی حد تک پہنچ گیا ہے"

"مجھے تو ڈر لگتا ہے کہیں تمہاری یہ باتیں ......

"مجھے تمہاری ان باتوں سے قطعی دلچسپی نہیں ہے"

"دلچسپی نہ سہی لیکن نفرت بھی تو نہ ہوگی۔ اور جب نفرت نہیں تو تمہیں یہ باتیں ضرور سننا پڑیں گی۔"

"آخر کب ہے آپ کی شادی؟"

"بس چند روز بعد!"

"خدا انجام بہتر کرے اور آنے والی کے دماغ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے!"

"چند گھنٹے باقی ہیں، اور صبر کر لو۔ جہاں اتنا عرصہ گذرا ہے یہ چند گھنٹے اور سہی ....

"تم خاموش کیوں ہو گئے؟"

"کچھ نہیں ایک بات سوچ رہا ہوں۔"

"آخر کیا، میں بھی تو سنوں۔"

"یہ سوچ رہا ہوں ... کہیں محترمہ کی ایک آنکھ ...... میرا مطلب ہے ...... خدانخواستہ ....

"دونوں آنکھوں کو چوپٹ ہی کر دو"

"خیر اتنی بڑی بات تو نہیں کہہ سکتا ...... لیکن اور ایک بات تو ضرور پوچھوں گا کہ تمہاری نجم الاولیٰ جو مبلغ ۔/۵۱ میں خریدی گئی ہیں اگر ایک آنکھ کی ہوتیں تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔ ارمان ... ولولے ... اور نہ معلوم کیا کیا ..... ان کا

کیا ہوگا۔ سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے"۔
"لیکن تم اطمینان رکھو وہ ایک آنکھ کی نہیں ہیں"
"کیا تم نے انہیں دیکھا ہے۔؟"
"دیکھا تو نہیں سنا ضرور ہے۔
"سننے کی بات چھوڑو ..... بہرصورت تم کمرے میں داخل ہوکر ان کی صورت کیسے دیکھو گے؟
"تم پوچھتے کیوں ہو؟"
"مجھے تو کبھی کبھی اس آگ میں کودنا ہی ہے!
"تجربہ مجھے بھی نہیں ہے۔ کل پرسوں شاید تمہاری مدد کرسکوں۔

اور وہ چند گھنٹے جو انور کے خیال میں صدیوں کی مسافت طے کر رہے تھے ایک ایک کرکے ختم ہوئے۔ باہر سے آواز آئی "پالکی تیار ہے۔ دولہا میاں کو لے چلیے"۔

دولہا میاں گھوڑے پر بیٹھے ...... چند ساعتیں ...... صرف چند ..... لیکن یہ بھی کتنی سست ہیں ختم ہی نہیں ہوتیں۔ جونک کی چال چل رہی ہیں ۔۔۔ کسی نے آواز دی گھوڑے کو بڑھائیے ...... یہ گھوڑا بھی آج کتنا آہستہ آہستہ چل رہا ہے ... یہ بھی بیچارہ کیا کرے۔ اس کے آگے چلنے والے بھی ذرا قدم نہیں بڑھاتے ..... غرضیکہ اب انور کا اشتیاق شاید پاگل پن کی حد سے بھی تجاوز کرچکا تھا ..... لیکن یہ کیا ہوا .... ہٹو ...... بچو ...... آخر یہ کیا ہو رہا ہے ..... گھوڑے کی پیٹھ پر کسی بچے نے پتھر کھینچ مارا۔ اور وہ بدک گیا۔ اس پر لوگوں نے غل مچانا شروع کیا جس سے گھوڑا اور تیز بھاگنے لگا۔ ...... اب کیا ہوگا ......
کیا ہوگا ..... کوئی نہیں جانتا ..... گھوڑے نے دولہا کو ایک نالے میں جا گرایا! اف خدایا! کیسا دلدوز حادثہ ہے ...... اٹھاؤ بھی اٹھاؤ ...... کہاں چوٹ لگی ہے ...... سر پھٹ گیا ہے ...... خون بہت زیادہ نکل رہا ہے برف رکھو سر پر شاید خون تھم جائے ...... لیکن برف رکھنے سے بھی کچھ فائدہ نہیں ہوا ...... اب کیا ہوگا۔
...... کسی نے کہا ہسپتال لے چلو ..... بیچارے کو ہسپتال لیجایا گیا۔ ہسپتال پہنچ کر سر میں ٹانکے لگے تب کہیں جاکر خون بند ہوا ...... باراتیوں کے چہروں سے فکر کے آثار دور ہوگئے ......
چلو خدا نے خیر کرلی ...... خون بند ہوگیا اب کوئی خطرہ نہیں ہے ..... "دلہن کی خدا نے سن لی" شاید انہی کی دعاؤں کا اثر ہو۔ ورنہ چوٹ تو بہت سخت آئی تھی"۔ یہ تھے وہ جملے جو باراتیوں نے آپس میں کہے۔ ہر ایک کو امید تھی کہ یہ صبح تک ٹھیک ہوجائیں گے۔ ...... لیکن صبح ..... صبح ڈاکٹر نے خبر دی ۔۔ "دماغ پر سخت چوٹ آنے سے دولہا کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی ہے۔ اور ہوسکتا ہے یہ زندگی بھر ایسے ہی رہیں ......
بینائی جاتی رہی ...... بینائی ..... اف بیچارہ ...... دلہن کی صورت بھی نہ دیکھ سکے گا۔؟

"کون صاحب ہیں؟"
"میں ہوں!"۔
"کون محمود؟ آؤ بھائی آؤ۔ کہو تو اچھے تو ہو۔؟
"کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟
"ٹھیک ہے!"
"سنا ہے ڈاکٹر نے آپریشن کیا تھا؟
"ہاں کیا تو تھا۔ لیکن بیکار"۔
"کیا مطلب"؟
"آپریشن آنکھوں کو واپس نہ لاسکا۔
"ڈاکٹر اب کیا کہتا ہے؟"
"اپنی لاچارگی کا رونا روتا ہے۔ وہ بیچارہ بھی کیا کرے

اندھے کو بینائی کو دینا کسی کے بس میں نہیں "

• "تمہاری بیوی آئی تھیں ؟"

" ہاں کل آئی تھیں ...... پوچھو گے کیسی تھیں ؟ لیکن یہ میں تمہیں نہیں بتا سکوں گا ...... اندھا ہوں نا "

" ایسی باتیں مت کرو تم جلد اچھے ہو جاؤ گے ۔ "

" میں نے تم کو اپنا تجربہ بتلانے کا وعدہ کیا تھا ... یاد ہے ؟"

" مریض کو ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں اس سے مرض میں اور اضافہ ہوتا ہے ۔"

" میں سوچتا ہوں کیا میں زندگی بھر اندھا رہوں گا .... زندگی بھر .... نہ معلوم زندگی میں مجھ سے ایسی کون سی غلطی سرزد ہوئی ، جس کی پاداش میں مجھے اتنی سخت سزا مل رہی ہے ۔"

" تو کل اُن سے کیا کیا باتیں ہوئیں ؟"

" باتیں ! وہ بیچاری تو خیریت ہی بمشکل دریافت کر سکی ۔ اس کی موجودگی میں سوچتا رہا کہ اس کی شکل و صورت کیسی ہو گی ۔ لوگوں سے ان کی خوبصورتی کی تعریف ضرور سنی تھی لیکن یہ کسی نے نہیں بتایا تھا کہ کیسی آنکھیں ہیں ۔ کیسی ناک ہے کیسا نقشہ ہے ۔ صرف خیالی نقوش تھے جو میری آنکھوں کے ارد گرد گھومتے رہتے ۔ لیکن اس کی خوبصورتی نہ دیکھ سکا جس کی تعریف سنی تھی .... تم خاموش کیوں ہو ..... میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے ..... کیا چلے گئے تھے "......

" نہیں بیٹھا ہوا ہوں ! "

" کیا میری حالت پر آنسو بہا رہے ہو ؟ لیکن کیوں .... اندھا ضرور ہو گیا ہوں ...... لیکن دل پر کوئی اثر نہیں آیا ہے ایک خوبصورت چیز کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا ۔ دل سے دیکھ لیتا ہوں اور پھر تصور میں تو بینائی کی ضرورت نہیں ہوتی ..... میں تمہیں بتلا سکتا ہوں کہ میری بیوی کی کیسی آنکھیں ہیں ۔ کیسی ناک ہے ۔ کیسے ہونٹ ہیں ۔ وہ جب چلتی ہیں تو کیا معلوم ہوتا ہے .... لیکن یہ سب ایک خیالی تصویر ہوتی ہے جسے میں ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہوں ...... اپنے پاس ... . اپنے دل میں ...... اسے خدا بھی مجھ سے نہیں چھین سکتا "

" میرے خیال میں تمہیں اپنی دلبستگی کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے کم از کم اُن کو ہی بلا لو ! "

" میں خود ہی اب گھر چلا جاؤں گا ۔ اب اور ہسپتال میں نہیں رہا جاتا ۔ یہ آنکھیں اب نہ آئی ہیں ۔ نہ آئیں گی جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ۔ "

" کس سوچ میں بیٹھے ہوئے ہیں آپ ؟ "

" نہیں کچھ نہیں "

" آخر کچھ تو ہو گا ہی ؟ "

" کوئی خاص بات نہیں ہے "

" خاص نہ سہی عام ہی سہی ۔ مجھے بتلانے میں کوئی عذر ہو تو نہ پوچھوں "

" تجھ سے ایک بات پوچھوں ؟"

" پوچھئے ! "

" سچ سچ بتلاؤ گی ؟ "

" آپ کی قسم "

" تمہیں مجھ سے نفرت نہیں ہے ؟ "

" آج تک اپنے جسم سے کبھی کسی نے نفرت کی ہے جسم میں جب ناسور پڑ جاتے ہیں تو اس سے بھی نفرت ہونے لگتی ہے "

تندرست ہونے کا ارمان ہوتا ہے نفرت نہیں ہوتی اگر نفرت ہوتی تو ہر شخص اپنے جسم کو کاٹ کر پھینک دیتا اور جسم کو کاٹنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے !"

" میری ایک بات مانو گی ؟"

" فرمائیے ! "

انور نے بہت کوشش کی کہ بجھا ہوا دیا پھر سے روشن ہو جائے
لیکن جس ڈاکٹر کو بھی دکھاتا وہ بے چارگی کا اظہار کر دیتا۔
کسی نے کوشش بھی کی تو کارگر نہ ہوئی۔۔۔۔۔۔۔

یوں ہی دن گذرتے گئے۔ یہاں تک کہ میں نے تیسرا جنم
لے لیا اور ایک روز۔۔۔۔۔۔

"میکے سے جلدی کیوں لوٹ آئیں۔"

"ایک خبر سنانے"!

"کیا کوئی خاص بات ہے"۔

"ہاں"۔

"آخر کیا؟"

"رات کے اندھیرے میں چاند کا ظہور"!

"کیا سچ؟"

"اب تک تو سچ ہی ہے"

"مبارک ہو!"

"مجھے مبارکباد دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ مبارکباد تو مجھے آپ کو دینی چاہئے"۔

"نہ معلوم چاندنی ہے یا چاند؟"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"ایک ایسا انسان جس کے سینے میں دل نہ ہو۔"

"یہ کیوں؟"

"خدا کیلئے بتائیے۔"

"کبھی اس کا بھی سنگر نجمہ بیاہی نہ ہو"

"آخر آپ ان آنکھوں کے لئے اتنے پریشان کیوں ہیں"؟

"اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔۔"

میں نے لاکھ کوشش کی کہ یہ خیال آپ کے دماغ سے
نکال دوں۔ لیکن تاحال مجھے اس میں کچھ کامیابی نہ ہو سکی۔۔۔
۔۔۔۔۔ لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ایک نہ ایک روز آپ کی
آنکھیں ضرور ٹھیک ہو جائیں گی"۔

"اب اس کی کوئی امید نہیں"۔

"امید پر تو دنیا قائم ہے۔

"ممکن ہے ایسا ہی ہو"!

"خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔۔۔۔۔ یہ بتلائیے۔ آپ نے
ناشتہ کر لیا ہے؟"

"کر لوں گا"!

"ابھی تک نہیں کیا۔ سچ کے دس بجنے کو آئے۔"

"تم جو نہیں تھیں"۔

"لیکن میں ملازم سے کہہ کر تو گئی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ کیا۔۔۔۔۔
یہ میز پر کھانا کیسا پڑا ہوا ہے؟"

"رات کا"

"کیا رات بھی کھانا نہیں کھایا؟"

"نہیں"۔

"لیکن کیوں؟"

"آنکھیں ہی باہر چلی گئی تھیں۔ کھانا کیسے کھاتا"!

"اُف میرے خدا۔۔۔۔ مجھے معاف کرو۔۔۔ میں اب کبھی
نہیں جاؤں گی"!

نجمہ کو امید تھی کہ بچہ ہونے کے بعد انہیں اپنی آنکھوں کا خیال نہیں رہے گا۔ وہ اس امید پر گھڑیاں گن رہی تھی کہ بچہ پیدا ہو تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ سکوں۔۔۔۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔۔۔۔۔ ساتویں مہینے کے شروع میں نجمہ ایک اونچی جگہ گر پڑی۔ اور۔۔۔۔۔۔ حمل ساقط ہو گیا۔۔۔۔۔ آخری امید بندھی تھی وہ ختم ہو گئی۔ پھر وہی غم کی گھٹائیں۔۔۔۔ لیکن نجمہ

سہیلے سوچتی گھناؤنی ....

اس حادثہ نے نجمہ کی زندگی پر توڑ ڈالا .... ڈاکٹروں نے جواب دیدیا۔ ..... درخت میں ایک ہی شاخ بچی تھی جس پہ آسرا جایا۔ اب وہ بھی ٹوٹ رہی تھی .... اب کیا ہو گا ..... اف بیچارہ ...... وہ سوچ رہا تھا ... دنیا میں کوئی چیز ایسی مل جائے جس کو بیچ کر قیمت دے کر میں اس کی زندگی واپس لے سکوں۔ ...... لیکن ایسی کوئی چیز نہ تھی۔

اب تمہاری کیسی طبیعت ہے؟

اچھی ہوں!

رات کو نیند آگئی تھی؟

ہاں کچھ دیر

میں بھی کتنا بدقسمت ....

"اب نہ کہیے ..... بدقسمت تو میں ہوں جو آپکے کسی کام نہ آسکی۔ آپکا سہارا بننے کی کوشش کی میں خود نڈھال کر کر پڑی ...... میرے مرنے کے بعد .....

ایسی بات زبان سے مت نکالو ..... تم نہیں مر سکتیں ...... میں تمہیں نہیں مرنے دوں گا ...... تم نہیں مرو گی .... کیا خدا نے دنیا میں صرف مجھ ہی کو تختۂ مشق بنایا ہے ..... ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ..... یہ کبھی نہیں ہو گا...

..... ایسا نہ کہیے۔

"آخر میں نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا جس کی وجہ سے مجھے یہ سزا مل رہی ہے!!

"مجھے پیاس لگی ہے۔ ذرا آدمی کو آواز دیجیئے وہ دوائی کی شیشی دے جائے۔

"دوائی کہاں رکھی ہے؟

"یہ سامنے میز پر ہے"

نہیں لا کے دیتا ہوں۔

آپ نہ جائیے ...... آپ کو میری قسم کہیں دشمنوں کو پتہ نہ لگ جائے"

"کچھ نہیں ہو گا ...... میں لے آتا ہوں ....

. . . .

"خیر تو ہے کیا ہوا آپ کو"

"کچھ نہیں پاؤں پھسل گیا گر پڑا ہوں

اف کیسے گرے ...... دیکھوں ..... کہیں چوٹ تو نہیں آئی ...... یہ کہکر وہ اٹھی .... لیکن چند قدم چلنے نہ پائی تھی کہ گر پڑی ۔ اور .... مرض نے اور بھی شدت اختیار کر لی۔

آخر تم نے اٹھنے کی کیوں کوشش کی تھی ..... کہاں چوٹ آئی ہے ..... لاؤ سر دبا دوں ......

یہ کہکر اس نے نجمہ کے سر کو اپنی گود میں رکھ لیا۔

تمہیں یاد ہے کبھی جب میں اور تم ...... ایسے ہی گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے ...... عجیب عجیب باتیں۔ اور جب تم روٹھ جایا کرتی تھیں۔ تو میں تم کو منانے کی لاکھ کوششیں کیا کرتا۔ لیکن تم ایک نہ سنتیں ...... اور آخر کار مجھے اپنی آنکھوں کی قسم دینا پڑتی ..... اس پر تم ...... تم جیسے روٹھی ہی نہ تھیں......

وہ دن جب ہم اپنے ہونے والے بچے کی خوشی میں راتیں جاگ کر گذارتے تھے ...... شاید ہمیں یہ خیال ہوتا تھا کہ صبح ہی ہم بچے کی صورت دیکھ سکیں گے ...... لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ خوشی ایک روز رنج کی صورت میں تبدیل ہو جائے گی ۔ اور ہمیں بچے کی صورت بھی دیکھنا نصیب نہ ہو گا .... لیکن تم اداس کیوں ہوتی ہو

بقیہ صفحہ ۱۰

انور نے بہت کوشش کی کہ بجھا ہوا دیا پھر سے روشن ہو جائے لیکن جب ڈاکٹر کو بھی دکھایا تو وہ اپنی لاچاری کا اظہار کر دیتا۔ کسی نے کوشش بھی کی تو کارگر نہ ہو سکی ....

یوں ہی دن گذرتے گئے۔ یہاں تک کہ میں نے تیرا جنم لے لیا اور ایک روز ....

"میکہ سے جلدی کیوں لوٹ آئیں۔؟"

"ایک خبر سنانے"!

"کیا کوئی خاص بات ہے"۔

"ہاں"۔

"آخر کیا؟"

"رات کے اندھیرے میں چاند کا ظہور!"

"کیا سچ؟"

"اب تک تو سچ ہی ہے"

"مبارک ہو!"

"مجھے مبارکباد دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ مبارکباد تو مجھے آپ کو دینی چاہئیے"۔

"نہ معلوم چاندنی ہے یا چاند؟"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"ایک ایسا انسان جس کے سینے میں دل نہ ہو۔"

"یہ کیوں؟"

"خدا کیلئے بتائیے۔"

"کبھی اس کا بھی سفر نہ بیاہی نہ ہو"

"آخر آپ ان آنکھوں کے لئے اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

"اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔"

"میں نے لاکھ کوشش کی کہ یہ خیال آپ کے دماغ سے نکال دوں۔ لیکن تاحال مجھے اس میں کچھ کامیابی نہ ہو سکی ...... لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ایک نہ ایک روز آپکی آنکھیں ضرور ٹھیک ہو جائیں گی"۔

"اب اس کی کوئی امید نہیں"۔

"امید پر تو دنیا قائم ہے۔"

"ممکن ہے ایسا ہی ہو!"

"خیر چھوڑیئے ان باتوں کو ...... یہ بتلائیے۔ آپ نے ناشتہ کر لیا ہے؟"

"کر لوں گا"!

"ابھی تک نہیں کیا۔ صبح کے دس بجے تو آتے ہ"

"تم جو نہیں تھیں"!

"لیکن میں ملازم سے کہہ کر تو گئی تھی ...... رہ گیا ...
یہ میز پر کھانا کیسا پڑا ہوا ہے؟"

"رات کا"

"کیا رات بھی کھانا نہیں کھایا!"

"نہیں"!

"لیکن کیوں؟"

"آنکھیں ہی باہر چلی گئی تھیں۔ کھانا کیسے کھاتا؟"

"اف میرے خدا .... مجھے معاف کرو .... میں اب کبھی نہیں جاؤں گی"!

سنیہ کو امید تھی کہ بچہ ہونے کے بعد انہیں اپنی آنکھوں کا خیال نہیں رہے گا وہ اس امید پر گھڑیاں گن رہی تھی کہ بچہ پیدا ہو تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ سکوں ..... لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا ..... ساتویں مہینے کے شروع میں ہی سنیہ ایک اونچی جگہ گر پڑی - اور ...... اور حمل ساقط ہو گیا ...... آخری امید بندھی تھی وہ ختم ہو گئی - پھر وہی غم کی گھٹائیں .... لیکن سنیہ

پہلے سوچی کتنا ذلتی ......

اس حادثہ نے نجمہ کی زندگی پر اثر ڈالا ...... ڈاکٹروں نے جواب دیدیا ...... درخت میں ایک ہی شاخ بچی تھی جس پہ آسرا دیا تھا - اب وہ بھی ٹوٹ رہی ہے ......

اب کیا ہو گا ...... اف بیچارہ ...... وہ سوچ رہا تھا ...... دنیا میں کوئی چیز ایسی مل جائے جس کو منہ مانگی قیمت دے کر میں اس کی زندگی واپس لے سکوں - ...... لیکن ایسی کوئی چیز نہیں تھی -

" اب تمہاری کیسی طبیعت ہے "

" اچھی ہوں ! "

" رات کو نیند آ گئی تھی نا "

" ہاں کچھ دیر "

" میں بھی کتنا بدقسمت ......

" اب نہ کہیے ...... بدقسمت تو میں ہوں جو آپ کے کسی کام نہ آ سکی - آپکا سہارا بننے کی کوشش کی لیکن خود لڑکھڑا کر گر پڑی ...... میرے مرنے کے بعد ......

ایسی بات زبان سے مت نکالو ...... تم نہیں مر سکتیں ...... میں تمہیں نہیں مرنے دوں گا ...... تم نہیں مرو گی ...... کیا خدا نے دنیا میں صرف مجھے ہی تختۂ مشق بنایا ہے ...... ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ...... یہ کبھی نہیں ہو گا ...... ایسا نہ کہیے -

" آخر میں نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا جس کی وجہ سے مجھے یہ سزا مل رہی ہے "

" مجھے پیاس لگی ہے - ذرا آدمی کو آواز دیجئے "" دوائی کی شیشی دے جائے -

" دوائی کہاں رکھی ہے "؟

" وہ سامنے میز پر ہے "

" میں لائے دیتا ہوں " -

" آپ نہ جائیے ...... آپ کو میری قسم کہیں دشمنوں کو پریشانی نہ ہو جائے "

" کچھ نہیں ہو گا ...... میں لے آتا ہوں ......

. . . .

" خیر تو ہے کیا ہوا آپ کو "

" کچھ نہیں پاؤں پھسل گیا اور گر پڑا ہے "

" اف میرے ذرا ...... دیکھوں ...... کہیں چوٹ تو نہیں آئی ...... یہ کہہ کر وہ اٹھی ...... لیکن چند قدم چلنے نہ پائی تھی کہ گر پڑی ...... اور ...... مرض نے اور بھی شدت اختیار کر لی -

---

" آخر تم سے اٹھنے کے لئے کس نے کہا تھا ...... کہاں چوٹ آئی ہے ...... لاؤ میں دبا دوں ......

یہ کہہ کر اس نے نجمہ کے سر کو اپنی گود میں رکھ لیا -

تمہیں یاد ہے نجمی جب میں اور تم ...... ایسے ہی گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے ...... عجیب عجیب باتیں - اور جب تم روٹھ جایا کرتی تھیں - تو میں تم کو منانے کی لاکھ کوششیں کیا کرتا - لیکن تم ایک نہ سنتیں - ... اور آخر کار مجھے اپنی آنکھوں کی قسم دینا پڑتی ...... اس پر تم ...... تم جیسے روٹھی ہی نہ تھیں ......

وہ دن جب ہم اپنے ہونے والے بچے کی خوشی میں راتیں جاگ کر گذارتے تھے - ...... شاید ہمیں یہ خیال ہوتا تھا کہ صبح تک ہم بچے کی صورت دیکھ سکیں گے ...... لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ خوشی ایک روز رنج کی صورت میں تبدیل ہو جائے گی - اور ہمیں بچے کی صورت بھی دیکھنا نصیب نہ ہو گا ...... لیکن تم اداس کیوں ہوتی ہو

بقیہ صفحہ ۱۰

مس خاں کے ٹوٹے ہوئے دل کو کس طرح سمجھائے۔ وہ صوفے پر بیٹھا ہوا چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور مس خاں کبھی کبھی کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ لیتی تھیں۔ کمرے میں صرف شرمیتی مس خاں، سلیم اور چینگاری تھے۔ اور فیصلہ سے چار ۔۔۔ سکول کی موٹر آگئی اور مس خاں چلی گئیں۔ آج انہوں ۔۔۔ تھی۔ لیکن دوپہر سے قبل ہی لوٹ آئیں۔ شرمیتی نے پھر یہ سر پھیرا لیکن تسلی بخش جواب نہ پاکر خاموش ہوگئیں۔ شام کی گاڑی سے سلیم اور چینگاری واپس آرہے تھے۔ اور شرمیتی کو برلی کسی کام سے جانا تھا۔ شام کی چائے مس خاں نے خود بنا کر بھیجی تھی۔ اس میں بہت سی لذیذ اور پر تکلف چیزوں کے علاوہ ایک پرچ میں دو مرجھائے ہوئے پھول دوسرے پرچ سے سرپوش رکھے تھے خالی برتن جانے لگے تو سلیم نے دونوں پھول اٹھا کر ان کی جگہ شرمیتی کا ایک خط رکھدیا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ "آپ کی ہونیوالی دلہن حسین دراز قد کشادہ پیشانی روشن خیال مضمون نگار دوشیزہ ہیں" ملازم برتن لے گیا۔

مہمانوں کو الوداع کہنے کے لئے میزبان کی تمام سہیلی استانیاں سٹیشن پر موجود تھیں۔ مس خاں بھی سیاہ برقعہ میں ملبوس کھڑی تھیں۔ سب نے خدا حافظ کہا گاڑی روانہ ہونے لگی۔ تو مس خاں درخت کے پیچھے سے سلیم کے ڈبے کے سامنے آئیں ان کے ہاتھ میں دو مرجھائے ہوئے پھول اور سلیم کا بھیجا ہوا شرمیتی کا خط تھا۔

وہ مطلب سمجھ گئیں تھیں۔ ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ کہ مجھے افسوس ہے۔ آپ نے تو حق آگہی دی ہیں یہ بھی جانتی ہوں کہ سکینہ نے کافی سے زیادہ حاشیہ آرائی سے کام لیا۔ اخلاقی مجرم سلیم کو اس واقعہ کا اب بھی جب خیال آجاتا ہے۔ مس خاں کی بھولی بھالی بے گناہ تصویر اور دو مرجھائے ہوئے پھول سامنے آجاتے ہیں۔

(صفحہ ۱۰۹ کا بقایا)

اللہ ہم کو اور دیدے گا ۔۔۔ میری طرف دیکھو ۔۔۔۔ مجھے بالکل غم نہیں۔۔۔ لو اب سو جاؤ ۔۔۔۔۔۔۔ رات زیادہ ہو چکی ہے۔۔۔ تمہارا سر تکیہ پر رکھدوں ؟۔۔۔ نجمی۔ نجمی۔ نجمی۔۔۔ لیکن نجمی اس دنیا سے کوسوں دور ہو چکی تھی اتنی دور۔۔۔۔ جہاں وہ کوئی بات سن بھی نہیں سکتی تھی۔

"حمید۔ اندر آجاؤ بارش ہو رہی ہے ۔۔۔۔۔۔ برآمدہ میں بھیگ جاؤ گے آج کل بھیگنا ٹھیک نہیں"

"سوچ رہا ہوں ۔۔۔۔۔۔ قدرت نے اندھے سے اس کی لاٹھی بھی چھین لی اب اندھے کو ہی کس ۔۔۔ زندہ رکھا ہوا ہے ۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ دن رات ٹھوکریں کھاتا ہے ۔۔۔۔۔۔ ایسی زندگی بھی کیا زندگی ہے"

میاں اندر چلو ۔۔۔۔۔۔ بجلی چمک رہی ہے" یہ بھی اپنے مالک کی ستم ظریفی پر آنسو بہا رہی ہے اس کے سینے میں بھی دل ہے بیچاری دوسرے کے غم میں شریک ہو جاتی ہے۔ ۔۔۔۔۔ اور کر بھی کیا سکتی ہے سوائے آنسو بہانے کے ۔۔۔۔ بیچاری نجمی ۔۔۔۔۔ میرے ساتھ رہ کر کوئی سکھ نہ پا سکی ۔۔۔ ساتھی بھی ملا تو کیا ۔۔۔۔۔ اندھا جو کسی کے کام نہ آسکے ۔۔ لیکن وہ بھی تھی بے وفا ۔۔۔۔۔۔ خود سکون حاصل کر لیا ہے ۔۔۔ اور مجھے میری قسمت میں وہی ٹھوکریں نہ معلوم کب ختم ہوں گی ۔۔۔۔ اب تو قدرت سے بس یہی دعا ہے کہ مجھے بھی سکون مل جائے ۔۔۔ مکمل بالکل سکون جہاں میں اپنے اندھے پن پہ نہ رو سکوں ۔۔۔ جہاں مجھے نجمی کی یاد نہ آسکے ۔۔۔۔ ایسا سکون جس سے میں خود کو بھی بھول جاؤں سکون ۔۔۔ بالکل سکون ۔۔ بجلی کی کڑک ۔۔۔ ہائیں یہ کیا ۔۔۔ یہ کیا ہو گیا ہے یہ میرے ہاتھ ۔۔۔ یہ میرے پاؤں اور ۔۔۔ یہ ۔۔۔ محمود ۔۔ محمود ادھر آؤ میرے سامنے ادھر دیکھو ۔۔۔ میری طرف دیکھو ۔۔۔ یہ آنکھیں انہیں کیا ہو گیا ہے۔ دیکھو ان کو کیا ہو رہا ہے ۔۔۔ روشنی ۔۔ بجلی ۔۔۔۔ تم ۔۔ میں سب کچھ دیکھ رہا

از نیر الحسن انصاری

شادی کا اشتہار!

ہر شخص کی دلچسپی کے رجحان الگ الگ ہوتے ہیں کچھ لوگ سینما سے بہت زیادہ مانوس ہوتے ہیں۔ تو کچھ تھیٹر سے ہماری بعض قسم کے لوگ کبڈی کو اچھا سمجھتے ہیں۔ تو بعض چھٹے دلے پتنگ لڑا کر خوش ہو لیتے ہیں۔ لیکن انسانی دلچسپی کے سامان ہمیشہ ایک ہی نہیں رہتے عمر کے ساتھ یہ بھی ڈھلتی چھاؤں کی طرح تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ بارہ برس کی عمر کا انسان اگر تاش کھیلنا پسند کرتا ہے تو یہ ضروری نہیں۔ کہ وہ عمر بھر تاش ہی کھیلتا رہے۔ وہ بہترین عالم بہترین فلسفی اور بہترین قمار باز بھی ہو سکتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے آئندہ سالوں میں بہترین گمراہ کن لیڈر بن جائے۔

لیکن ہر شخص کی زندگی میں اگر نہیں تو ننانوے فیصدی لوگوں کی زندگی میں ایک زمانہ ایسا ضرور آتا ہے جب کہ وہ "ضرورت شادی" کے اشتہاروں میں دلچسپی لیتے ہیں اخبار خریدتے ہیں۔ تو صرف اس اشتہار کے لئے۔ پڑھتے ہیں تو صرف اسی حصہ کو جس میں یہ اشتہار شائع ہوتے ہیں۔ اور یہ پڑھ لینے کے بعد بیچارے اخبار کو دوبارہ اس کے ہاتھوں میں ہونا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمارے سلیم بھائی بھی ان ننانوے فیصدی والوں میں تھے۔ ہندوستان ٹائمز کو چندہ صرف اس لئے دیتے تھے کہ وہ شادی کے اشتہار چھاپتے ہیں۔ اور باقاعدہ طور سے اکثر اشتہار دینے والوں سے آپ کی خط و کتابت رہتی تھی۔ لیکن مکمل کبھی نہ ہوتی۔ صرف دلچسپی کا سامان ہی جو ٹھہرا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ایک صاحب سے آپ کی خط و کتابت کم و بیش چھ ماہ رہی۔ اور پھر خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے وہ صاحب اتفاق سے "صاحبہ" تھیں۔ سلیم سے شریمتی سکینہ دیوی خط و کتابت کر رہی تھیں۔ چھ مہینے کی خط و کتابت میں شریمتی نے یہ لکھا "کہ لڑکی مسلمان پابند صوم و صلوٰۃ حسین و جمیل امور خانہ داری میں ماہر اور ایف اے پاس برسر روزگار ہے۔ آپ ہم کو قطعی پسند ہیں۔ صرف ایک بار برائے نام نمائش کے لئے آ جائیے۔ میں لڑکی کی بڑی بہن کی قریب ترین سہیلی ہوں۔ آپ کے خطوط ہم سب کے لئے سامان دلچسپی ہوتے ہیں۔ گھنٹوں ان خطوطوں پر بحث ہوتی ہے۔ بعض دفعہ خواب میں بھی آپ ہی نظر آتے ہیں۔ آپ ایک دفعہ اور بس ایک دفعہ ضرور تشریف لا دیں۔ روہیلکھنڈ تاریخی علاقہ ہے۔ آپ کو خوب سیر کرائی جائیگی۔ حافظ رحمت خاں کے حمام میں آپ کو نہلانے کا انتظام کیا جائیگا۔ حافظ رحمت خاں کے بنائے ہوئے پل پر ہم سب لوگ کھڑے ہو کر ریت سے لبالب بھری نہر کا نظارہ کیا کریں گے۔ حافظ رحمت خاں کی بنائی ہوئی مسجد میں (اگرچہ ہندو دیوی ہوں) آپ اور آپ کی "ہونیوالی دلہن" اکٹھے نماز پڑھینگے۔ اور آپ کی "ہونیوالی دلہن" ایک روشن خیال مضمون نگار دوشیزہ .... ایک قابل معلمہ ہیں ہمارے سکول کو ان پر ناز ہے اور آپ کی "ہونیوالی دلہن" روہیلکھنڈ کے ایک اعلیٰ خان کی دختر نیک اختر ہیں۔ ان کے بھائیوں میں روہیلے سپاہیوں کی تلوار کی سی چمک نظر آتی ہیں۔ حافظ رحمت خاں کا خون ان میں موجیں مار رہا ہے وہ بہت اچھی فوٹو گرافر ہیں۔ اور ہاں وہ انگریزی کھانوں میں تو

بس ماہریں سکول کے ہرڈ زیں ...... یا دیتی ہی ہوتی ہیں۔ اور آپ کی "ہونیوالی دلہن" شرم و حیا کا مجسمہ ہیں۔ گھر سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا۔ دا گرچہ سکول میں معلمہ ہیں ، برقعہ پہن کر آتی جاتی ہیں۔ لیکن پردہ سے کوئی خاص النسبت نہیں۔ پردہ کے متعلق ان کی آیندہ رائے آپ کی رائے پر منحصر ہوگی۔ اور آپ ایک دفعہ ضرور آیئے۔ اِک بار ضرور لکھیئے گا۔ کہ کب تشریف آ رہی ہو گی۔

سلیم نے اس چھ ماہ کے عرصہ میں اپنی "ہونیوالی دلہن" کی بڑی بہن کی قریب ترین سہیلی کو یقین دلا دیا۔ کہ وہ اپنی ہونیوالی دلہن" میں ہر خوبی دیکھ رہا ہے اور کیوں نہ ہو آخر مرحوم حافظ رحمت خاں کے خاندان کی یادگار ہے۔ اسے یقین ہے اس کی ہونیوالی دلہن بہترین بہو، بہترین بیوی، بہترین ماں، اور بہترین ساس ، بن سکے گی۔ اور وہ اپنی "ہونیوالی دلہن" کو دیکھنے کے لئے ضرور آئیگا۔

اپنی "ہونیوالی دلہن کو دیکھنے کے لئے" آنا ذرا عجیب کی بات تھی لیکن سلیم کے بر زور اصرار اور شریمتی جی کے دبی زبان میں ان کا نتیجہ صرف "آپ آیئے تو سہی دیکھا جائیگا" نکلا،

اب سوال یہ تھا کہ وہ ہونیوالا دولہا" "ہونیوالی دلہن" کو دیکھنے تنہا جاتے یا کسی شری مان کے ساتھ۔ وہاں بھی تو شریمتی سکینہ دیوی وکیل ہیں۔ یہ آخر بلا وکیل کیوں جاتے۔ اور پھر وہ سکول بیسیوں استانیاں سینکڑوں لڑکیاں پردیس میں نیا شہر اور پھر وہ شہر بھی ایسا جہاں حافظ رحمت خاں نے گوروں اور ان کے کالے علمبرداروں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ اور سلیم ٹھہرے خالص انگریزی پیار وہ صرف رنگ سے مجبور تھا۔ اور اس پر کوئی بس نہ چلتا تھا۔ بہت سمجھ اور کئی ناکام اور کامیاب بحثوں کے بعد..... سوچ بچار کے بعد چہیتے دوست "چنگاری کو اکسایا شریمتی سکینہ دیوی اور گرلز سکول اور پھر سلیم کی "ہونیوالی دلہن" سے ملاقات بھلا کون بیوقوف ہے جو موقع ہاتھ سے دے۔ ویسے تو خط و کتابت میں بھی چنگاری پچاس فیصدی کے حصہ دار تھے۔ لیکن

یہ "ان کے ہاں جانا" خاص طور سے پُر لطف تھا۔ لیکن "وہ نکے" دلیس میں "چنگاری" بھی کسی کو نہ جانتے تھے۔ ضروری یہ سمجھا گیا۔ کہ چلنے سے پہلے وہاں کے کسی ایماندار مولوی سے فتوٰی لیا جائے کہ سلیم کی "ہونیوالی دلہن" کیا اور کیسی ہیں۔ چنانچہ یہ مشکل اس طرح حل ہوتی کہ سلیم کے رامپور کے ایک چھری مار دوست منظور نے اپنے ایک دوست کو جو "وہ نکے" شہر میں رہتے تھے۔ خط لکھا کہ جملہ حالات فلاں بنت فلاں سکنہ فلاں پیشہ معلمی سے کم و کاست فوراً مطلع کیا جائے" مولوی سر نیدر نے شریمتی سکینہ دیوی نیلے پر دہلا مارا اور ہفتہ عشرہ میں لکھ بھیجا کہ "حسکم حضور کی تعمیل کی گئی جواب میں عرض ہے۔ کہ دوشیزہ موصوفہ حسن کی جیتی جاگتی مجسمہ ہی ہر زاویہ سے دیکھا۔ ہر پہلو سے ناپا لیکن کسی کونے میں ایک دانہ کم نہیں۔ ہر وہ خوبی جو شمالی حسن کا ایک مسلمہ ہو سکتی ہے۔ آپ کی ہونیوالی بھابی میں موجود ہے۔ شاید ... آپ بنفس نفیس ملاحظہ فرمانے پر کچھ زیادہ ہی پا ئیں گے ؟۔

حالات حسب منشا تھے۔ سلیم کو مولوی سر نیدر کے فتوٰے پر ایمان لانا ہی چاہیے تھا۔ آخر مولوی سر نیدر کو جھوٹ بول کر کے رکعت کا ثواب ملتا۔ اور پھر سلیم کے چھری مار دوست منظور بھی چہرے اور جسامت سے تو اچھے خاصے شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ شک کی گنجائش ہی نہ ہو سکتی تھی۔ "وہ اسباب سارا راہ سفر کا سنبھال کر" غرض کہ سلیم "چنگاری" منظور کی دعا، اور بہت دیال ساتھ لیکر جنوری کی ایک کڑکڑاتی رات کو تین بجے گھر سے نکلے اوور کوٹ مفلر اور سوٹر کے باوجود دونوں گرمی سے دور تھے "ہونیوالی دلہن" ہی کا ایک ایسا خیال تھا۔ جو بجلی بن کر سلیم کو چلا رہا تھا۔ اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ سٹیشن پر دیکھا تو گاڑی میں جگہ اسباب ڈالنے کے لئے بھی نہیں بڑی مشکل سے ایک آدمی کی جگہ ملی۔ وہ بھی اتفاق سے نہ آ سکا تھا۔ لیبل لگا ہوا تھا۔ لیکن جگہ خالی دونوں ہمت کر کے بیٹھ ہی تو گئے۔ پھر تو

[illegible] چھوٹا دل لے کر وہ بار بار بولی جھنتے ہوئے رو [illegible] کے علاقہ میں داخل ہو گئے۔ راستہ میں کھانا نہ ملنے ریلوے والوں کی بے اعتنائیوں اور مسافروں کی زیادتیوں سے جو کچھ ان دو جیبوں صیبت پہ گذرا ہوگا۔ اس کا صرف تصور ہی کر لیجئے آپ کو رلا دینے کے لئے وہی کافی ہوگا۔

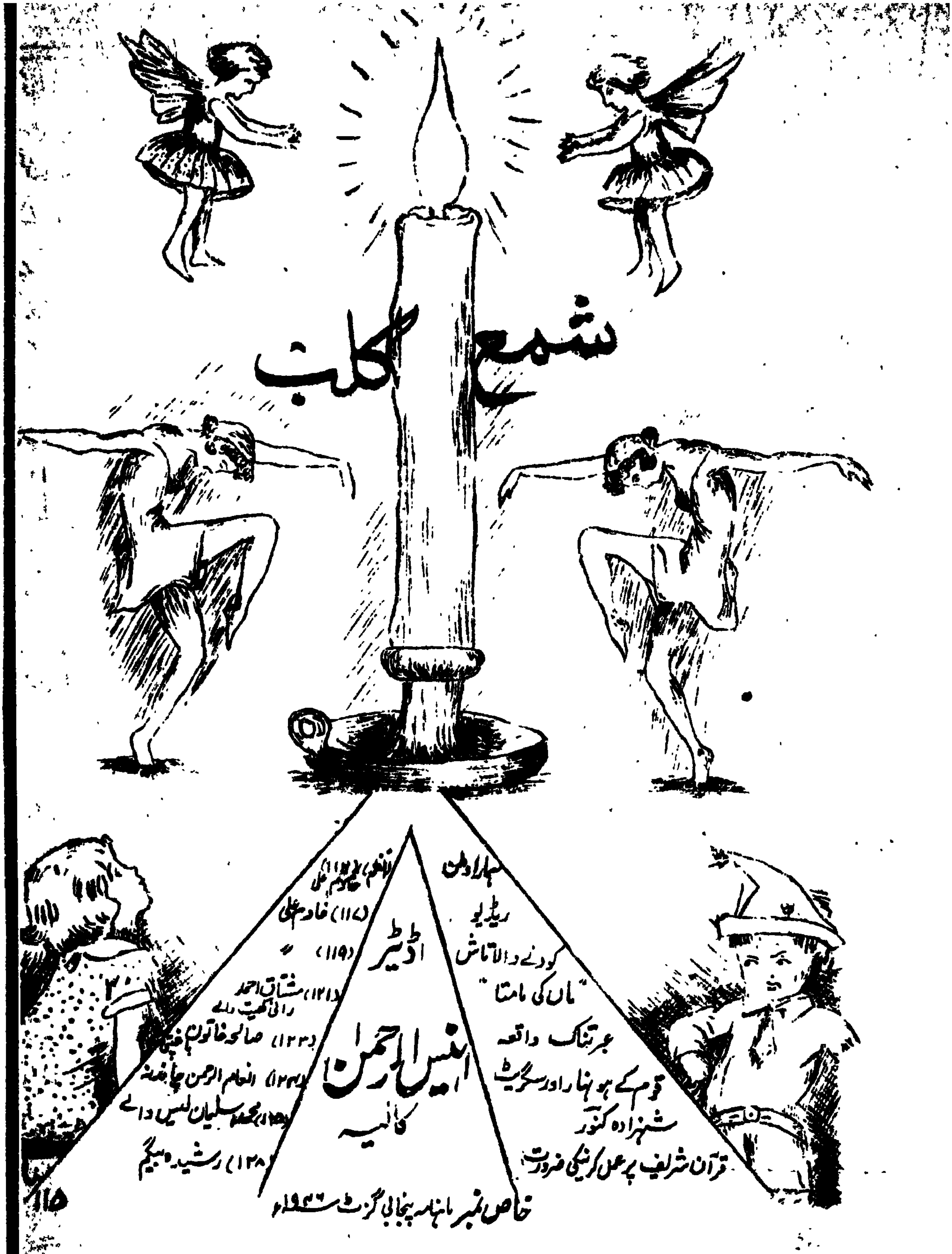
لنکر "سٹیشن پر پہنچے تو استقبال کے لئے سوائے آنے جانے والے مسافروں کے اور کوئی نہیں چنگاری ٹھہرے۔ امیراں مہرا کے ہوتے ان کی یہ سرد مہری دیکھ کر اور کھلا گئے اور واپس چلنے کی ٹھانی۔ لیکن یہاں بھی سلیم کی ثابت قدمی کام آئی اگرچہ چاہتے تو چنگاری بھی یہی تھے۔ کر "اتنی" اس لغزش کو درگذر کر دیا جائے۔ شریمتی سکینہ دیوی نے نہایت شاندار ریسٹ ہاؤس میں اپنے مہمانوں کے ٹھہرانے کا انتظام پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ ان دونوں کے پہنچنے پر باوردی بیروں نے سجے سجائے کمرے کھول دیئے میزبان کو اطلاع کرائی گئی۔ صبح کا وقت تھا۔ جواب آیا کہ موصوفہ چائے پر انتظام کر رہی ہیں۔ آگے آگے سلیم اور پیچھے چنگاری شریمتی کے بنگلے میں داخل ہوئے ہر قسم کے فرنیچر سے آراستہ ہال میں ایک طرف کھانے کی میز پر چائے کے برتن لگے ہوئے اور دوسری طرف صوفے کرسیاں قالین دنیا بھر کا سامان نہایت قرینے سے رکھا ہوا۔ اور ایک طرف ایک صوفے پر ایک اعظیم الشان تھیلا (جو اکثر فوج کے گورے سپاہیوں کے پاس سامان بھرنے کیلئے ہوتا ہے) پر رکھا ہوا نظر آیا سمجھ میں نہ آیا کہ اتنے ماقاعدہ مکان میں صوفے پر یہ تھیلا کس لئے رکھا گیا تھا۔ گیلری میں کھڑے ہوئے شریمتی کے استقبال کے لئے آنے کے انتظار میں گلوں کے رنگ بدلتے پھول دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ چند لمحوں کے بعد دیکھا۔ کہ تھیلا متحرک ہے اور اندر سے باہر کی طرف آ رہا ہے۔ دروازہ پر پہونچکر صاف نظر آنے لگا۔ اوہ یہ تو ایک خاتون تھی۔ جو سر کے بالوں سے لے کر سینڈل تک چمکدار پکے سیاہ رنگ کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"آ اپنے اندر تشریف لائیے" اب معلوم ہوا کہ آپ ہی شریمتی سکینہ دیوی ہیں۔ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات شریمتی کے آئینہ میں ان کے موکل کا چہرہ کچھ دھندلا دھندلا نظر آنے لگا۔ ان کی تمام خط و کتابت منظور۔ اور مولوی مرید سب یکے بعد دیگرے آنکھوں کے سامنے اس طرح چلتے پھرتے معلوم ہونے لگے جس طرح ریل میں بیٹھا ہوا مسافر دوڑتے ہوئے درختوں اور کھیتوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے اور پھر ریل کھڑی ہو گئی ہر چیز ساکت معلوم ہونے لگی

بادل ناخواستہ چائے پی میزبان تاڑ گیا کہ مہمان کچھ دل شکستہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن رات کی تکان آڑے آ گئی۔ اور کچھ ظاہر نہ ہونے دیا پھر یہ خیال کہ یہ کیا ضروری ہے کہ وکیل کا موکل بھی ایسا ہی ہو۔ جیسا کہ وکیل ممکن ہے کہ یہ سب "خیال" ہو۔ یہ امید صرف دس فیصدی رہ گئی تھی۔ شریمتی نے چائے کے دوران میں راستہ کی تکالیف پر ہمدردی ظاہر کی اور اپنی تمام خط و کتابت کو مختصر الفاظ میں دہرا کر لوٹتے ہوئے دل پر مرہم رکھنے کی کوشش کی اور سلیم نے بھی کچھ دیر کیلئے اپنے کو دھوکہ ہی دے لینا مناسب سمجھا۔ آزمائش بڑی کڑی تھی۔ دن روز ندامت سے کسی طرح کم نہ تھا۔ پر تکلف کھانوں اور شریمتی کی باتوں میں دو دن گذر گئے۔ دوسری رات ان کی سہیلیوں سے ملاقات کی رات تھی۔ سلیم کو خیال ہوا کہ شاید اس جھرمٹ میں ان کی "ہونیوالی دلہن بھی ہوں گی۔ آخر تعلیم یافتہ ہیں۔ حسن مجسم ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ مصلح ہیں۔ بغیر دیکھے کس طرح اپنے "ہونیوالے والے دولہا" کو قبول کر لیں گی۔ وہ وقت بھی آیا۔ ایک دو تین چار چھ سات دس بارہ خواتین ایک ایک دو دو کر کے اس طرح آئیں۔ جیسے تھیٹر کے سٹیج پر دعا کے وقت ایکٹریسیں آتی ہیں۔ اور بیٹھ گئیں۔ شریمتی نے تعارف کرایا مس لائق۔ مس سیوارڈ۔ مس ہربرٹ۔ مسز شرما اور مسز اگروال وغیرہ وغیرہ سلیم اور چنگاری نے سب چہرے بغور دیکھا

گفتگو ہونے شروع کے لیکن مولوی سرہندر کے خواب کی تعبیر نہ نکلی۔ یہ ممکن تھا کہ "ہونیوالی دولہن" کسی اور نام سے متعارف کرادی گئی ہوں۔ لیکن یہ دونوں بھی زبردستہ مال تھے۔ لیکن انکار مل شرمیتی کے خطوط اور مولوی سرہندر کے بیان کے مطابق چل رہا تھا۔ ہر چہرہ پر رکتا اور آگلے کی طرف روانہ ہو جاتا آخر یہ خیال آیا کہ انھیں بلایا ہی نہیں گیا۔ اور اس خیال نے "یقین" کی شکل اختیار کر لی۔ ان میں دو تین قابل قبول ضرور تھیں۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ "ہونیوالی دلہن" نہیں اِدھر اُدھر کی باتوں اور ایک دوسرے پر فقرے کس نے میں رات کے تین بج گئے۔ خواتین نے شادی سے پہلے ہی سلیم اور چنگاری دونوں کو دل کھول کر پریشان کیا ہر فقرہ اپنی جگہ پر تیز لیکن اچھا ہوتا تھا۔ ریسٹ ہاؤس اور شرمیتی کا بنگلہ شہر سے بالکل باہر ہونے کی وجہ سے گیدڑوں اور کتوں سے بالکل قریب تھا۔ جنکی آوازوں کے وہ لوگ عادی ہو چکے تھے۔ لیکن مہمانوں نے خوب لطف اٹھایا۔ گیدڑ کی آواز کا چنگاری نے "نان کہ خوردی کہ د" ترجمہ کیا تو ان خواتین میں سے ایک نے دوسرے کے کان میں کہا "معلوم ہوتا ہے یہ لوگ جانا چاہتے ہیں" یہ سب اپنی گفتگو میں ہندی کے "سیر" زیادہ استعمال کر رہی تھیں۔ ان ایک خاتون کی ترجمانی پر دونوں مہمانوں کا ماتھا ٹھنکا لیکن بات آئی گئی ہوئی محفل برخاست ہو گئی۔ اور صبح کو پھر چائے پر ملنے کے وعدہ سے چلے گئے۔ سلیم اور چنگاری بھی "دھڑکتا ہے دل زار خدا خیر کرے" کہتے ہوئے ڈاک بنگلے میں چلے گئے۔

آج ان کا رومیلکھنڈ میں آخری دن تھا۔ شام کی گاڑی سے واپس ہونے والے تھے۔ لیکن "ہونیوالی دلہن" سے ابھی تک تعارف نہ ہوا تھا۔ چائے پر آتے ہوئے سلیم نے طے کر لیا کہ آج بالکل صاف الفاظ میں تعارف کا مطالبہ کیا جائے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ شرمیتی نے جواب دیا "اگر آپ لوگ مل چکے ہوں" ان اس جواب سے سلیم کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ نڈھال ہو گیا۔ لیکن چہرے پر ظاہر نہ ہونے دیا اور دوبارہ ملاقات پر اصرار کیا۔ بڑی مشکل سے مس خاں کو بلایا گیا "ہونیوالی دلہن" آئیں لیکن اس طرح جیسے رخصت کے وقت شرماتے ہوئے دلہنیں چلا کرتی ہیں۔ یہ تو وہی تھیں۔ جنہوں نے گذشتہ شب سلطان کے "نان کہ خوردی فانہ برو" کا ترجمہ کر کے اپنی سہیلیوں سے کہا تھا کہ "معلوم ہوتا ہے یہ لوگ جانا چاہتے ہیں" مس خاں نام خدا کوئی بتیس برس کی خاتون تھیں۔ رنگ سیاہی مائل سر میں آدھے بال سفید پیشانی اور پستہ قد سلیم نے اپنی "ہونیوالی دلہن" کو دیکھا۔ اور سر جھکا لیا۔ چہرے سے محسوس ہو رہا تھا کہ تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اپنی تکلیف اور محنت رائیگاں گئی کہ قطعی خیال نہ تھا۔ ایک سوال اس کے دماغ میں بار بار آ رہا تھا۔ کہ انکار میں وہ جلا تا گیا ہوگا۔ اور اقرار میں اپنے ماں باپ بھائی بہنوں اور دوستوں میں اس کا درجہ کیا ہوگا۔ اگر انکار کرے تو مس خاں کو کتنا صدمہ ہوگا۔ اور ان کی سہیلیاں ان کا کس طرح مذاق اڑائینگی۔ اور صدمہ کس ممکن حد تک جا سکتا ہے بدشکل سے بدشکل عورت بھی یہ سننا کبھی گوارا نہیں کرے گی کہ اس کے "ہونیوالے دولہا" نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ صرف اس لئے کہ وہ بدشکل ہے اور سلیم کے متعلق اس کو خود یقین تھا۔ کہ وہ رستہ کے لئے تیار ہے اور رکنے آئے گا۔ لیکن اب وہ پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اس اخلاقی جرم کے ذمہ دار شرمیتی سکینہ دیوی منظور اور مولوی سرہندر تھے لیکن اب وہ خود آخری فیصلہ کے لئے موجود تھا۔ اور شرمیتی کا سوال "کہئے کیا خیال ہے" اس کے دماغ میں گونج رہا تھا۔ مس خاں ایک صوفے پر شرمیلی دلہن کی طرح بیٹھی تھیں۔ کس کس بات کے جواب میں "جی" اور "جی" "نہیں" کہہ رہی تھیں اور بس سلیم اگر مس خاں کا دل رکھے تو خود زبردست قربانی ہے۔ لیکن کس جرم میں وہ خود گمراہ کیا گیا تھا۔ اگر ٹالے تو کس طرح اور



شمع کلب
اڈیٹر
انیس الرحمن
کانیہ
ہمارا وطن
ریڈیو
کودنے والا تماشا
"ماں کی ممتا"
عبرتناک واقعہ
قوم کے ہونہار اور سگریٹ
شہزادہ کنور
قرآن شریف پر عمل کرنیکی ضرورت
(نظم) (۱۱۵) کاظم علی
(۱۱۷) خادم علی
(۱۱۹) "
(۱۲۱) مشتاق احمد رالی کھیت والے
(۱۲۳) صالحہ خاتون
(۱۲۴) انعام الرحمن
(۱۲۶) محمد سلیمان
(۱۲۸) رشیدہ بیگم
خاص نمبر ماہنامہ پنجابی گزٹ ۱۹۴۶ء

ہمارا وطن

یہ پاکستان ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ اس کے درختوں کی سبزیاں
وہ پھل پھول پودے وہ پھلواریاں

یہ پاکستان ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ ساون میں کالی گھٹا کی بہار
وہ برسات کی ہلکی ہلکی پھوار

یہ پاکستان ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

ہوا میں درختوں کا وہ جھومنا
وہ پیڑوں کا پھولوں کا منہ چومنا

یہ پاکستان ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

اسی سے ہے جینے کی ساری بہار
وطن کی محبت یا ماں کا پیار

یہ پاکستان ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

خطابات ہوئے ختم نوابیاں
ہیں زوروں پہ اب جنگ کی تیاریاں

یہ پاکستان ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ اسلامی ریاست وہ پاکستان
لرزتا ہے جس سے یہ ہندوستان

وہ پاکستان ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

خادم علی

ریڈیو!

موجودہ زمانہ کی ایجادات میں ریڈیو کا نام سب سے اونچا ہے۔ یعنی اس کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ کیوں نہ ہو؟ جبکہ یہ تجارت کی ترقی، تعلیم اور معلومات کا ذریعہ بن گیا ہے۔ ہم اسی کے ذریعے دنیا کے ہر گوشے کی خبریں آن کی آن میں سن لیتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ ہے کیا بلا؟ بغیر تار یا رشتہ کے کام کرتی ہے۔ آپ نے ہزاروں دفعہ دریا یا تالاب وغیرہ میں پتھر پھینکے ہوں گے اور شاید غور بھی کیا ہوگا کہ پتھر کے پھینکنے سے پانی میں لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی ہیں اور بڑی ہو جاتی ہیں لیکن جوں جوں یہ لہروں کے حلقے بڑے ہوتے جاتے ہیں توں توں مدھم پڑتے جاتے ہیں۔

یہی حال ہوا کے سمندر کا بھی ہے جس وقت ہم باتیں کرتے ہیں تو گویا ہوا کے سمندر میں پتھر پھینک رہے ہیں اور اس کی وجہ سے اس میں گول گول لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ہم جو آپس میں بات چیت کرتے ہیں ان سے جو لہریں پیدا ہوتی ہیں وہ زیادہ دور نہیں جا سکتیں اور اگر جا بھی سکتی ہوں تو یہ اتنی طاقت ور نہیں ہوتیں کہ ہوا کے تھپیڑوں کو برداشت کر سکیں یہ فوراً منتشر ہو جاتی ہیں اس لئے ہم کو اپنی آواز دور دراز فاصلے پر پہنچانے کے لئے بہت طاقتور لہریں پیدا کرنی ہوں گی۔

جو ہوا کے سمندر میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ نہ جائیں جیسے تالاب میں کنکر پھینکنے سے حلقے ٹوٹ جاتے ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب ہم کسی باجے کو بجاتے ہیں تو اس کے اندر کی ہوا میں بھی ویسی تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے جو اس کی جھلی پر ہوتی ہے۔ ریڈیو کا بھی وہی حساب ہے یعنی اس ہوا کی تھرتھراہٹ کو ہم بجلی کی تھرتھراہٹ میں تبدیل کر لیتے ہیں اور اس طرح ہوا کی لہروں کی بجائے بجلی کی لہریں پیدا کر لیتے ہیں جو اتنی طاقتور ہوتی ہیں کہ کرہ زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک لاکھ اسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کر سکتی ہیں۔ اور سفر کے دوران میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹتی پھوٹتی بھی نہیں۔

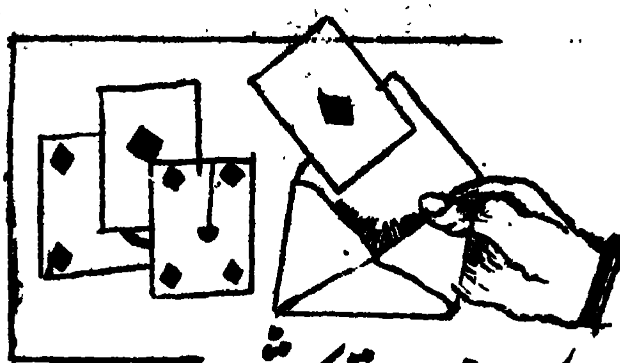
آپ کہیں گے کہ لہریں تو بغیر تار کے سفر ہی نہیں کر سکتیں نہیں بغیر تار کے بھی سفر کر سکتی ہیں۔ ان کی مثال بھی روشنی کی سی ہے یعنی جیسے روشنی کی لہریں بغیر تار وغیرہ کے سفر کرتی ہیں اسی طرح یہ بھی سفر کرتی ہیں۔

اچھا اب دو اسٹیشن بنائیے۔ ایک تو آل انڈیا ریڈیو اور دوسرا آپکے گھر کا ریڈیو۔ جس وقت ریڈیو اسٹیشن پر کوئی بولتا ہے تو ہوا میں لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ لہریں ایک ایسے باریک پردہ پر جا کر ٹکراتی ہیں جو ہمارے کان کے پردے سے مشابہ ہے۔

یہ پردہ بولنے سے بہت زور سے تھرتھرانے لگتا ہے۔ اسی مقام پر بجلی کا خزانہ بھی ہوتا ہے جس میں سے بجلی کی لہریں آتی ہیں اسی باریک پردہ کے تھرتھرانے سے بجلی کی لہروں میں بھی تھرتھراہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تھرتھراتی ہوئی لہریں ایک تار کے ذریعہ ایک ایسی جگہ جاتی ہیں جہاں ان کو بہت طاقتور بنایا جاتا ہے اور یہاں یہ لہریں بس تیار ہوتی ہیں کہ آزاد کر دی جائیں ان کی مثال بالکل ان کبوتروں کی سی ہے جو اپنے پیروں میں خطوط باندھے ہوئے اڑنے کو تیار ہیں

کہ کبوتر بھی پہنچایا کرتے ہیں۔ اب ان ہرکاروں کا نام برقی کبوتر رکھے ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن پر بڑے اونچے اونچے لوہے کے ستون لگے ہیں اور ان کے سروں پر لوہے کے تار لگے ہوتے ہیں۔ ان کبوتروں کے لئے پنجرے جن سے برقی کبوتر اڑنے کے لئے کھول دئے جاتے ہیں اور یہ تمام دنیا میں ایسی تیز رفتاری سے اڑنے لگتے ہیں کہ ہم قیاس بھی نہیں کر سکتے ان کے سامنے اگر مکان، دیواریں اور قلعے بھی آجائیں تب بھی ان کے لئے روک نہیں۔ روشنی رک جاتی ہے مگر یہ نہیں رکتے۔

آپ نے کبوتروں کی چھتری تو دیکھی ہوگی۔ بس اسی میں کبوتر پکڑے جاتے ہیں۔ بس دو چھوٹے چھوٹے بانس اور ایک تار۔ ایسی ہی چھتری آپ کے مکان پر بھی لگی ہوتی ہے۔ یہ برقی کبوتر جیسے ہی کانوں سے چھوٹتے ہیں ان چھتریوں میں پھنس جاتے ہیں اور قید ہوجاتے ہیں۔ یہاں آ ایک باریک سے پردے پر آہستہ آہستہ ٹھونگیں لگاتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے انڈے میں سے نکلتے وقت مرغی کا بچہ۔ یہ تھرتھراہٹ پھر ہوا کی تھرتھراہٹ میں تبدیل ہوجاتی ہے وہیں ایک آلہ بلند آواز لگا ہوتا ہے۔ جو اسی ہلکی سی تھرتھراہٹ کو بہت بڑا کر دیتا ہے اب آپ سوچیں گے کہ یہ تو بہت دیر کا کام ہے۔ مگر نہیں اس کو بھی ایسا ہی سمجھئے جیسے آپ آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ جتنی دیر ان کے سننے میں لگتی ہے اتنی ہی دیر ان برقی کبوتروں کو ریڈیو اسٹیشن سے ریڈیو سیٹ تک آنے میں لگتی ہے۔



کودنے والا تاش

از (خادم علی)

یہ دلچسپ کھیل تم اپنے دوستوں کو دکھا سکتے ہو۔ وہ بہت حیران ہوں گے۔ حالانکہ اس میں حیرانگی کی کوئی بات نہیں۔ اس عجیب و غریب تاش کے بنانے کے لئے تم کو تاش کے دو پتوں، ایک لفافہ اور ایک لچک دار ربڑ کی ضرورت ہوگی۔ سب سے پہلے دو کارڈ تیار کرو۔ ان کو اس طرح کاٹو کہ ہر کارڈ کے بیچ سے سوراخ کر کے اسے نیچے تک پہنچا دو۔ اب تم ربڑ کا ٹکڑا لو اور اس کے دونوں سروں پر گرہیں لگا دو۔ پھر اس ربڑ کے دونوں پتوں کے شگاف میں اس طرح ڈالو کہ گرہیں دونوں پتوں کے پیچھے ٹک جائیں پھر ان پتوں کو لفافے میں رکھ کر لفافے کو تھوڑا سا دبا کر پکڑ دو تاکہ ربڑ دونوں پتوں کے درمیان ڈھیلا رہے اب تم اپنے دوستوں سے کہو کہ یہ جادو کا لفافہ ہے۔ میں اس میں بار بار کارڈ رکھتا ہوں لیکن یہ باہر نکل آتا ہے پھر تم ایک اور کارڈ لو اور اس کو دونوں کے درمیان رکھ کر ذرا نیچے کی طرف دباؤ اس طرح کرنے سے ربڑ کھیچ جائے گا پھر اپنے ہاتھ کو ڈھیلا چھوڑ دو تو کارڈ باہر نکل پڑے گا۔ اس طرح بار بار دہراؤ۔

نوٹ :۔ لچک دار ربڑ سائیکل کا ٹیوب کاٹ کر حاصل کیا جا سکتا ہے اس کی لمبائی تقریباً ½1 انچ اور چوڑائی ½ انچ ہونا چاہئے۔

پنجابی گزٹ

ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا

(منیجر)

فہرست شادی

نمبر شمار	تاریخ نسبت	تاریخ نکاح	نام نوشہ	عمر	ولدیت نوشہ	سکونت	ولدیت عروس	سکونت	تعداد مہر
۱	۲۱	۷	محمد شفیق	۳۰ سال	شیخ علاؤ الدین میرٹھ والے	صدر میرٹھ	فیض الدین [illegible] والے	بلیماران	۲۱۰۰
۲	[illegible]		محمد اقلیم	۲۳ سال	شیخ محمد صدیق مرحوم [illegible]	[illegible] گنج	محمد جان لاہور والے	برف خانہ	۳۱۰۰
۳	۱۵	۲۵	احسان الٰہی	۱۵ سال	منشی رحیم الٰہی لاہور والے	نواب گنج	محمد الدین [illegible]	[illegible]	۲۱۰۰
۴	۲۵	۲۵	عمر الٰہی	۲۲ سال	محمد عاشقین	باغیچی اچھے جی	محمد امین [illegible] والے	سبزی والا باغ	۳۱۰۰
۵	۲۶	۲۶	محمد عشر	۱۹ سال	محمد ابراہیم [illegible] مرحوم	شیش محل	محمد عاشقین کلکتہ والے	فیاض گنج	۲۱۰۰
۶	۲۷	۲۷	محمد صالحین	۲۰ سال	محمد دین مرحوم کلکتہ والے	شیش محل	محمد ادریس [illegible] والے	فیاض گنج	۲۱۰۰
۷	۲۵	۲۸	محمد صدیق	۲۵ سال	محمد اسمٰعیل جالندھر والے		کرم الٰہی مرحوم	پکی گلی	۲۱۰۰
۸	۲	۴	محمد دین	۲۴ سال	محمد اسحاق دواکی والے	گلی چابک سواران	محمد اسمٰعیل دواکی والے	[illegible]	۴۱۰۰
۹	۱۲	۱۲	عطاء الرحمن صاحب	۱۹ سال	شیخ عبدالرحمن سروا والے	سبزی والا باغ	شیخ احسان الرحمن	بارہ دری	۵۱۰۰
۱۰	۱۶	۱۶	عبدالخالق اللہ والے	۱۹ سال	شمس العارفین اللہ والے	بلیماران	محمد امین	بارہ دری	۵۱۰۰
۱۱	۲۳	۲۲	محمد فردوس	۲۳ سال	محمد عبداللہ [illegible] والے	باغیچی اچھے جی	محمد عمر صاحب [illegible] والے	باغیچی اچھے جی	۲۱۰۰
۱۲	۲۳	۲۳	محمد یونس	۲۲ سال	محمد شفیق مرحوم	کالے صاحب	شیخ محمد صدیق	گلی [illegible]	۴۱۰۰
۱۳	۲۹	۲۹	حاجی عبداللہ صاحب	۷۵ سال	شیخ انعام اللہ صاحب مرحوم	نواب گنج	محمد اسمٰعیل مرحوم	بلیماران	۱۰۰۰
۱۴	۳۰	۳۰	ممتاز الدین	۲۴ سال	غیاث الدین [illegible]		محمد صدیق [illegible] والے	گلی [illegible]	۳۱۰۰
۱۵	۳۰	۳۰	محمد آصف	۱۹ سال	محمد حنیف صاحب		محمد عاشقین صاحب [illegible]	چھوٹی باغیچی	[illegible]
۱۶	۳۰	۳۰	آفتاب الدین	۲۲ سال	سراج الدین کلکتہ والے مرحوم	[illegible]	عبدالعزیز [illegible] والے	[illegible]	۱۴۰۰
۱۷	۳۰	۳۰	محمد عثمان [illegible]	۲۲ سال	عطاء الرحمن [illegible]	گلی چابک سواران	محمد یعقوب [illegible] والے	گلی [illegible]	۵۱۰۰
۱۸	[illegible]	۲	محمد ذکی	۲۱ سال	محمد تقی صاحب	بلیماران	حافظ [illegible] احمد	گلی [illegible]	۵۱۰۰
۱۹	۲۷	۲۷	محمد یونس	۲۸ سال	محمد عارف صاحب [illegible] والے	حویلی حسام الدین	عبدالوہاب [illegible] والے	کشن گنج	۲۱۰۰
۲۰	۳	۳	عبدالخالق	۲۳ "	عبدالستار [illegible] والے	حویلی حسام الدین	فضل الٰہی [illegible] والے	کالے صاحب	۱۹۰۰
۲۱	۴	۴	سلطان احمد	۲۲ سال	عبدالغنی [illegible] والے	برف خانہ	حافظ محمد [illegible] میرٹھ	[illegible]	[illegible]
۲۲	۶	۵	مشتاق احمد	۲۰ سال	حاجی [illegible] اللہ والے	بارہ دری	شیخ محمد ابراہیم	[illegible]	[illegible]
۲۳	۱۰	۱۰	محمد احمد	۲۰ سال	حاجی محمد [illegible]	نیا محلہ	حاجی محمد [illegible] والے	کشن گنج	[illegible]
۲۴	۲۴	۲۴	سلطان احمد اللہ والے	۲۴ سال	حاجی رفیع الدین اللہ والے	بارہ دری	شیخ عبدالخالق	[illegible]	۵۱۰۰
۲۵	۲۹	۳۰	شیخ محمد خلیل سورت والے	۵۵ سال	حاجی محمد شفیع سورت والے	نواب گنج	نور محمد [illegible] والے	نیا محلہ	۳۱۰۰

۲۷	۲۸	۲۸	محمد عارف	۲۱ سال	محمد حنیف حسینے والے	کانپور	محمد مشتاق [illegible]	[illegible]	[illegible]
۲۸	۷	۷	محمد تقی	۲۱ سال	محمد امین ستر والے	عزیز گنج	مشتاق احمد	لال منڈوا	۳۱۰۰
۲۸	۸	۸	محمد یوسف	۲۰ سال	محمد یعقوب	احاطہ کیدارہ	محمد یاسین بھینہ والے	احاطہ کیدارہ	۳۱۰۰
۲۹	۸	۸	محمد یوسف	۱۸ سال	محمد یونس مرحوم گٹ والے	بکی گلی	حافظ یاسین بھینہ والے	احاطہ کیدارہ	۳۱۰۰
۳۰	۱۶	۱۶	محمد شفیع	۲۱ سال	حاجی محمد عمر بمبئی والے	فیاض گنج	شیخ ریاض الدین	بکی گلی	۳۱۰۰
۳۱	۱۷	۱۷	حافظ مشتاق احمد	۲۱ سال	شیخ محمد عمر بینت والے	حویلی حسام الدین	شیخ محمد صدیق تاجر	احاطہ کالے خاں	۳۱۰۰
۳۲	۱۶	۱۶	عبدالرشید	۲۱ سال	عبدالعزیز جوتی والے	کشن گنج	شیخ محمد یحییٰ صاحب سوت والے	بیری والا باغ	۳۱۰۰
۳۳	۲۶	۲۷	ضمیر الدین	۱۹ سال	شیخ وحید الدین کلکتہ والے	بھنڈ خانہ	شیخ نور احمد کلکتہ والے	نواب گنج	۳۱۰۰
۳۴	۲۸	۲۸	نور احمد	۲۴ سال	محمد نادر علی صاحب	کشن گنج	شیخ مقبول الٰہی صاحب	بھنڈ خانہ	۳۱۰۰
۳۵	۲	۲	عبدالستار	۲۰ سال	عبدالحمید بان والے	فیاض گنج	عبدالجبار بیڑی والے	گلی [illegible]	۵۰۰۰
۳۶	۲	۲	محمد زاہد	۲۲ سال	شیخ محمد رفیع سوت والے	بارہ دری	شیخ محمد دین مرحوم چھتو والے	نیا محلہ	۳۱۰۰
۳۷	۱۹	۱۹	عنایت اللہ	۱۹ سال	حافظ حبیب اللہ سوت والے	نواب گنج	محمد صدیق چاقو والے	گلی چابک سواران	۳۱۰۰
۳۸	۱۹	۱۹	عبدالستار	۲۱ سال	منشی عبداللہ مرحوم	باغیچی اچھے جی	محمد یوسف خضاب والے	نواب گنج	۳۱۰۰
۳۹	۲۲	۲۲	حافظ محمد الیاس	۲۴ سال	محمد یسین انبالہ والے	کشن گنج	شیخ حبیب اللہ سوت والے	نواب گنج	۳۱۰۰
۴۰	۲۷	۲۷	سلطان احمد	۱۸ سال	محمد یعقوب	کٹرہ محمد شفیع	محمد شفیع بٹن والے	کشن گنج	۳۱۰۰
۴۱	۳۰	۳۰	محمد یوسف	۲۲ سال	ریاض الدین	کٹرہ محمد شفیع	محمد یاسین	بیری والا باغ	۱۲۰۰
۴۲	۷	۷	محمد یوسف	۲۲ سال	حافظ محمد امین صاحب مرحوم	محلہ فیاض گنج	حبیب الرحمن اللہ والے	نیا محلہ	۳۱۰۰
۴۳	۷	۷	محمد تقی	۲۰ سال	شیخ محمد یسین چمڑے والے	باغیچی اچھے جی	محمد یوسف [illegible] والے	نواب وزیر	۳۱۰۰
۴۴	۸	۸	محمد شفیع	۱۹ سال	شیخ محمد یسین چمڑے والے	باغیچی اچھے جی	حاجی عبدالمجید [illegible] والے	نیا محلہ	۳۱۰۰
۴۵	۸	۸	محمد یونس	۲۳ سال	محمد جان کلکتہ والے	بیری والا باغ	حبیب الرحمن سوت والے	بیری والا باغ	۱۴۰۰
۴۶	۱۱	۱۱	فضل رحمن	۲۰ سال	ذکریا الرحمن رنگون والے	گلی ذکریا	فضل اسحق صاحب	کالے صاحب	۱۱۰۰
۴۷	۱۲	۱۲	محمد تقی	۲۰ سال	شیخ عبدالوہاب صاحب	بیری والا باغ	محمد اشفاق لاکھ والے	بیری والا باغ	۳۱۰۰

فہرست پیدائش

(بقیہ فہرست شادیاں)

شمار	تاریخ اندراج	تاریخ پیدائش	بچہ کا نام	نام بچہ کے باپ کا	بچہ کے نانا کا نام	نام محلہ	علاقہ نمبر
۱	۳۱	۳۱	محمد کاظم	محمد صالحین جوتے والے	حاجی محمد امین چمڑے والے	کشن گنج	[illegible]
۲	۱	۱	نواب محمد ہارون	محمد رفیع بمبئی والے	محمد سلیمان [illegible] والے	حویلی حسام الدین	۹
۳	۵	۵	قمر المتین	محمد تقی ولد محمد عمر گلی والے	شیخ محمد صدیق صاحب	حویلی حسام الدین	۹

[illegible]	[illegible]	۱۰ ۹/۵۶	محمد مسلم صاحب	محمد الیاس ... صاحب	محمد احمد ... والے	بارہ دری	۳
[illegible]	۱۰ ۹/۵۶	۱۰ ۹/۵۶	مبارک النساء	محمد احمد صاحب فتحپوری والے	محمد یعقوب صاحب فیروز پوری	احاطہ کیدار	۱۳
[illegible]	۱۴ ۹/۵۶	۱۲ ۹/۵۶	خورشید احمد	محمد حبیب صاحب مسلم	شیخ احمد جان ... والے	باغیچی اچھے جی	۱۳
[illegible]	۱۱ ۹/۵۶	۱۱ ۹/۵۶	محمد نقی صاحب	محمد الیاس صاحب بجلی والے	شیخ محمد ایوب ٹیلے	بارہ دری	۳
۸	۲۰ ۹/۵۶	۲۰ ۹/۵۶	شکیلہ بیگم	محمد ایوب صاحب فیروز پوری والے	حاجی محمد صدیق دلال	احاطہ کیب بارہ	۱۳
۹	۹ ۹/۵۶	۹ ۹/۵۶	محمد سلیم	عبدالغنی صاحب سورت والے	محمد یوسف چمڑے والے	نواب گنج	۱۳
۱۰	۲۵ ۹/۵۶	۲۴ ۹/۵۶	روشن آرا بیگم	شیخ ولی الدین صاحب چاندنی	حاجی محمد تقی صاحب الٰہ دی والے	کشن گنج	۱۴
۱۱	۲۰ ۹/۵۶	۲۰ ۹/۵۶	نجمہ خاتون	محمد صالحین صاحب تیلی	حاجی شمس العارفین گلاس والے	کشن گنج	۱۳
۱۲	۲۹ ۹/۵۶	۲۹ ۹/۵۶	نواب میاں	محمد میاں جی نورہ	محمد اسمٰعیل چانولہ	نواب گنج	۱۳
۱۳	۳۰ ۹/۵۶	۳۰ ۹/۵۶	لڑکی	حاجی نصیر الدین الٰہ والے	عبدالرشید بابن والے	بارہ دری	۱۳
۱۴	۱ ۱۰/۵۶	۳۱ ۹/۵۶	نورالنساء بیگم عرف نجمہ	خلیل الرحمٰن باڑی	حافظ مشتاق احمد	احاطہ کالے صاحب	۶
۱۵	۳ ۱۰/۵۶	۲ ۱۲/۵۶	عتیق الرحمٰن	حبیب الرحمٰن باڑی	حافظ مشتاق احمد	- -	۶
۱۶	۵ ۱۰/۵۶	۵ ۱۰/۵۶	نفیسہ خاتون	محمد یوسف ولد سراج الدین	محمد امین	سنگیش محل	۱۳
۱۷	۱۰ ۱۰/۵۶	۱۰ ۱۰/۵۶	ممتاز بیگم	محمد عمر ولد احسان الٰہی صاحب	محمد یعقوب صاحب	بازار بیماران	۹
۱۸	۱۵ ۱۰/۵۶	۱۵ ۱۰/۵۶	نسیم اختر	سعید احمد دوائی والے	حاجی عبدالکریم صاحب	گلی ہنگا بیگ	۳
۱۹	۲۰ ۱۰/۵۶	۲۰ ۱۰/۵۶	لڑکا	عبدالستار انبالہ والے	حاجی عبدالمتین انبالہ والے	- -	۳
۲۰	۳۱ ۱۰/۵۶	۳۰ ۱۰/۵۶	محمد اقبال	شیخ عبدالغنی صاحب والے	حاجی احمد مرحوم	سنگیش محل	۱۳
۲۱	۱ ۱۱/۵۶	۱ ۱۱/۵۶	غیور الدین احمد	افتخار الدین	حاجی محمد حسین گھڑی والے	نواب گنج	۱۱
۲۲	۲ ۱۱/۵۶	۲ ۱۱/۵۶	رفعت بیگم	حافظ محمد ارشاد احمد ...	خان بہادر حاجی رشید احمد	کشمیری گیٹ	۱

فہرست اموات

نمبر شمار	تاریخ	نام میت	ولدیت	نام محلہ	عمر متوفی	کیا مرض ہوا
۱	۱۵ ۱۱/۵۶	مردہ پیدائش	فیروز النساء ... والے	احاطہ کالے صاحب	—	—
۲	۱۲ ۱۱/۵۶	مسماۃ سمی جان	فضل الٰہی دہلوی	بارہ ہندوراؤ باغیچی اچھی جی	۶۵ سال	پیچش
۳	۱۷ ۱۱/۵۶	مردہ پیدائش	محمد سعید ٹاٹ والے	چوڑی واڑہ کلاں	—	—
۴	۱۷ ۱۱/۵۶	روشن جمال	محمد سعید ... والے	حویلی حسام الدین حیدر	۶ ماہ	کالا تا
۵	۱۸ ۱۱/۵۶	مردہ پیدا ہوئی	نورالحق سٹریٹ والے	—	—	—
۶	۲۲ ۱۱/۵۶	سعیدہ خاتون	حاجی احمد حسن الٰہ دی	کٹرہ نئی	۴۴ سال	ہارٹ فیل

نمبر	تاریخ	نام	ولدیت	سکونت	عمر	وجہ
[illegible]	۲۲ ۱۰/۵۴	عبدالرحمن	حبیب بخش مرحوم	محلہ طوطا مسجد	[illegible] سال	[illegible]
۸	۲۲ ۱۰/۵۴	میمونہ بی	نواب الدین بجلی والے	بارہ دری نواب وزیر	۱½ ماہ	بخار
۹	۲۲ ۱۰/۵۴	ثناء اللہ	حاجی صبغت اللہ	بیری والا باغ	۵ سال	میعادی بخار
۱۰	۲۳ ۱۰/۵۴	سمیہ خاتون	شفیع محمد احمد	احاطہ کالی صاحب	۳ سال	بخار
۱۱	۲۴ ۱۰/۵۴	محمد عثمان	ولد محمد اشفاق	پھاٹک حبش خاں	۲ دن	بخار
۱۲	۲۵ ۱۰/۵۴	مشفق النساء	شیخ الٰہی بخش	شیش محل	۲۰ سال	کھانسی بخار
۱۳	۲۶ ۱۰/۵۴	انیس الرحمن	سید محمد ادریس	حویلی حسام الدین حیدر	۱۰ سال	بخار
۱۴	۲۶ ۱۰/۵۴	فاطمہ بی	سراج السلام صاحب	لیلاماں حویلی حسام الدین حیدر	۲ گھنٹے	بخار
۱۵	۲۸ ۱۰/۵۴	فضل الٰہی	احمد بخش نیچہ بند والے	چمنی میل	۷۵ سال	بخار
۱۶	۲۸ ۱۰/۵۴	راشدہ خاتون	محمد الیاس چمڑے والے	نواب والا باغ	۱½ ماہ	بخار
۱۷	۲۹ ۱۰/۵۴	مردہ پیدائش	محمد شفیع شاہد رہ والے	کشن گنج	-	-
۱۸	۲۹ ۱۰/۵۴	قسمت بی	حافظ عبدالسلام مرحوم	باغ بیری والا	۴۵ سال	بخار
۱۹	۳۰ ۱۰/۵۴	سلطانہ بیگم	محمد یونس صاحب	نیا محلہ	۴ ماہ	بخار
۲۰	۳۰ ۱۰/۵۴	ہاجرہ بیگم	محمد امین	کٹرہ شفیع	۴ ماہ	بخار
۲۱	۳۰ ۱۰/۵۴	روشن آرا بیگم	نور احمد	احاطہ کالی صاحب	۴ سال	بخار
۲۲	۳۰ ۱۰/۵۴	عبدالمتین صاحب	عبدالغفار صاحب	حویلی حسام الدین حیدر	۶ سال	بخار
۲۳	۱ ۱۱/۵۴	فہمیدہ بانو	محمد یعقوب	کشن گنج	۱½ سال	نمونیہ
۲۴	۲ ۱۱/۵۴	شکیلہ خاتون زوجہ عبدالغنی	محمد صدیق	برف خانہ فیاض گنج	۱۸ سال	بخار
۲۵	۳ ۱۱/۵۴	محمد یسین	حاجی نثار احمد	کشن گنج	۵۲ سال	بخار
۲۶	۵ ۱۱/۵۴	نسیمہ خاتون	محمد یونس شیر فروش	کٹرہ محمد شفیع پھاٹک حبش خاں	۸ سال	بخار
۲۷	۵ ۱۱/۵۴	مردہ پیدائش	عبدالمنان	کٹرہ محمد شفیع	-	-
۲۸	۱۰ ۱۱/۵۴	انیس احمد	محمد احمد	نیا محلہ پل بنگش	½ ۱ سال	بخار
۲۹	۱۲ ۱۱/۵۴	خورشید انور	محمد سعید	باپسی اچھے جی	دو ماہ	بخار
۳۰	۱۳ ۱۱/۵۴	مردہ پیدائش	حافظ محمد شفیع	طوطا مسجد	-	-
۳۱	۱۹ ۱۱/۵۴	گلزار بیگم	محمد موسیٰ رانی کھیت والے	سول لین	۲½ برس	میعادی بخار
۳۲	۲۰ ۱۱/۵۴	مردہ پیدائش	محمد فائق	پھاٹک حبش خاں	-	-
۳۳	۲۳ ۱۲/۵۴	حافظ محمد عثمان خلف	حافظ محمد اسمٰعیل خلق شاہ والے	بیری والا باغ	۴۴ سال	حرکت قلب
۳۴	۲۴ ۱۲/۵۴	حبیبہ بیگم	فضل الرحمن لاہور والے	نواب گنج	۱½ ماہ	بخار

[redacted]				نیا محلہ	چار ماہ	بخار
۳۶	۲۷ ۳/۴۶	رشیدہ خاتون	حاجی عبدالسلام	نیا محلہ	۱۴ سال	بخار
۳۷	۲۷ ۳/۴۶	عطیہ بیگم	فضل الرحمن لاہور والے	نواب گنج	۴ سال	بخار
۳۸	۱۸ ۳/۴۶	سلیم اللہ	رحیم الہی	ملیاران	چھ ماہ	بخار
۳۹	[illegible]	مختار احمد	محمد احمد	شیش محل	۷ گھنٹہ	-
۴۰	۲۹ ۳/۴۶	عبدالرشید چھڑی والے	حاجی عبدالعزیز چھڑی والے	گشن گنج	۱۰ سال	سرسام
۴۱	۲۱ ۱۱/۴۵	زبیر احمد	محمد احمد	پھاٹک حبش خاں	۵ یوم	-
۴۲	۲۱ ۱۱/۴۵	اسلام النساء	محمد عثمان	احاطہ کالے صاحب	۴ سال	بخار
۴۳	۲۱ ۱۱/۴۵	حافظ عبدالغنی	عظیم بخش	اسلام گنج	۹۵ برس	فالج
۴۴	۲۲ ۱۱/۴۵	مردہ پیدائش	محمد الیاس	بلیماران	-	-
۴۵	۲۵ ۱۱/۴۵	محمد یعقوب	محمد یعقوب لالی والے	بارہ دری نواب وزیر	۴ سال	بخار
۴۶	۲۶ ۱۱/۴۵	شجاع الدین	اسلام الدین	برف خانہ	ایک سال	بخار
۴۷	۲۷ ۱۱/۴۵	حمیدہ بیگم	محمد کاظمین	میم کی کوٹھی	۱۲ سال	دق
۴۸	۲۸ ۱۱/۴۵	لعیق النساء	شیخ محمد اسمعیل ٹوپی والے	باڑہ ہندو راؤ	۶۵ سال	پیچش
۴۹	۲۹ ۱۱/۴۵	نور بانو	ڈاکٹر محمد ادریس	گلی چابک سواران	۲½ مہینہ	مسان
۵۰	۳۰ ۱۱/۴۵	عمر النساء	محمد نسیم	بلیماران حویلی حسام الدین حیدر	۱۲ سال	بخار
۵۱	۲ ۱۲/۴۵	نجمہ بیگم	ریاض الدین عرف ...	بیری والا باغ	دو ہفتہ	بخار
۵۲	۵ ۱۲/۴۵	قدسیہ بیگم	محمد یوسف	چھڑی والان خورد	۱۳ مہینہ	نمونیہ
۵۳	۶ ۱۲/۴۵	طاہرہ بیگم	محمد سعید صابن والے	بلیماران حویلی حسام الدین حیدر	۲ ماہ	بخار
۵۴	۷ ۱۲/۴۵	سراج الحق	محمد صدیق	بلیماران	۱۵ روز	بخار
۵۵	۸ ۱۲/۴۵	نسیم احمد	محمد یسین	بیری والا باغ	۴ ماہ	بخار
۵۶	۸ ۱۲/۴۵	فیروز خاتون	محمد اسحاق	ریٹھی والا باغ	۷۰ سال	بخار
۵۷	۱۰ ۱۲/۴۵	شیخ ابوالفضل	امین الدین	بیری والا باغ	۶۰ سال	ہارٹ فیل
۵۸	۱۰ ۱۲/۴۵	انعام الہی	مقبول الہی مرحوم	نواب والا باغ	۱½ سال	بخار
۵۹	۱۱ ۱۲/۴۵	محمد شفیع	دلدار حسین	شیش محل	۵۰ سال	ہارٹ فیل
۶۰	۱۲ ۱۲/۴۵	محمد صالحین	عبدالغنی	گشن گنج	۲۵ سال	نمونیہ
۶۱	۱۳ ۱۲/۴۵	مہر النساء	جمیل الرحمن	احاطہ کالے صاحب	۱۴ ماہ	بخار
[redacted]			محمد نذیر	نیا محلہ	۳۹ سال	بخار

خاص نمبر ماہنامہ پنجاب گزٹ ۱۹۴۶ء

۶۳	۱۵ ۱۲/۴۵	مریم بی	محمد حسن	گلی بینگا بیگ	۶۵ سال	بخار
۶۴	۱۷ ۱۲/۴۵	زینب بی	حاجی رحیم الدین ٹھیکیدار	گلی قاسم جان چھتہ [illegible]	۵۰ سال	بخار
۶۵	۲۰ ۱۲/۴۵	امت بی	ذکر الرحمن صاحب	جامع مسجد	ایک مہینہ	بخار
۶۶	۲۴ ۱۲/۴۵	محمد یونس	محمد مرتضیٰ	کچا باغ	۱۱ سال	بخار
۶۷	۲۷ ۱۲/۴۵	عبدالاحد	عبدالقہار	کچا باغ	ایک ماہ	بخار
۶۸	۱۸ ۱۲/۴۵	[illegible] بیگم	عبدالمتین	فیاض گنج	۲۳ یوم	بخار
۶۹	۱ ۱/۴۶	مردہ پیدائش	چھا کلی والے	محلہ چوڑ والا	—	—
۷۰	۱۱ ۱/۴۶	حاجی محمد بلال	ولد بخش اللہ	باڑہ ہندو راؤ	۴۵ سال	بخار
۷۱	۱۲ ۱/۴۶	محمد صدیق	ولد عبدالغنی	محلہ بلیماران	۷۵ سال	بخار
۷۲	۱۴ ۱/۴۶	سراج العارفین	محمد یوسف گنگوہی	پھاٹک حبش خاں [illegible]	۸ یوم	بخار
۷۳	۱۵ ۱/۴۶	عبدالجبار کراچی والے	عبدالوہاب	[illegible] کامیل	۳۲ سال	بخار
۷۴	۱۵ ۱/۴۶	محمد ایوب	پیر جی رحمت اللہ	رنگ محل	۵۵ سال	
۷۵	۱۵ ۱/۴۶	عبدالالٰہی	حاجی انعام الٰہی	چوڑ والا کلاں	۶۶ سال	
۷۶	۱۷ ۱/۴۶	لڑکا	محمد شفیع	رنگ محل پھاٹک حبش خاں	ایک مہینہ	—
۷۷	۱۸ ۱/۴۶	مردہ پیدائش	عبدالخالق	بیری والا باغ	—	—
۷۸	۱۹ ۱/۴۶	شیخ سراج الدین	انعام اللہ [illegible] والے	احاطہ کالیا صاحب	۷ سال	ہارٹ فیل
۷۹	۲۰ ۱/۴۶	محمد سلیمان	محمد فاروق	نواب گنج	۳ ماہ	بخار
۸۰	۲۰ ۱/۴۶	مردہ پیدائش	محمد یوسف	چوڑ والا چھوٹا	—	—
۸۱	۲۰ ۱/۴۶	حمیرہ جی	حاجی محمد شفیع [illegible] مرحوم	احاطہ کالیا صاحب	۴ سال	—
۸۲	۲۳ ۱/۴۶	بچہ مرا ہوا	شیخ محمد اسحاق	بلیا ساؤ	—	—
۸۳	۲۳ ۱/۴۶	اہلیہ شیخ عبدالمجید ملتانی	حاجی عبدالرحمن [illegible]	[illegible] گنج	[illegible] سال	بخار
۸۴	۲۶ ۱/۴۶	محمد اسماعیل	محمد ابراہیم	نیا محلہ	۴۰ سال	کھانسی بخار
۸۵	۲۶ ۱/۴۶		شیخ عبدالرشید کلکتہ والے	نیا احاطہ کالیا صاحب	۴ سال	بخار
۸۶	۲۸ ۱/۴۶	اہلیہ نور محمد	کریم الدین شیشے والے	بکی گلی چھتہ نواب صاحب	۳۵ سال	بخار
۸۷	۳۱ ۱/۴۶	محمد یونس	حاجی محمد اسماعیل شیشے والے	احاطہ کدارہ	۳۵ سال	بخار
۸۸	۴ ۲/۴۶	مسماۃ آمنہ بی	ولد حاجی محمد اسماعیل [illegible]	گلی بھجو بیگ	۶۵ سال	بخار
۸۹	۵ ۲/۴۶	ارشاد حسین	غلام حسین	شیش محل	۶۰ سال	بخار
۹۰	۶ ۲/۴۶	لڑکا	شیخ عبدالعزیز	فیاض گنج	ایک یوم	کھانسی

۹۱	۹	آمنہ بی	ملا ابراہیم دودھ والے	پھاٹک حبش خاں	۲۰ سال	سنجار
۹۲	۱۰	حمید اللہ کالیے	—	بیری والا باغ	۵۰ سال	سنجار
۹۳	۱۲	شاہدہ بیگم	شیخ شجاع الدین	پھاٹک حبش خاں	۳ ماہ	سنجار
[illegible]	[illegible]	[illegible] فہم	ولد محمد اشفاق	بیری والا باغ	۲ ماہ	سنجار
۹۵	۱۵	محمد نثار	ولد انعام اللہ	تنگ محل	۴۵ سال	سنجار
۹۶	۱۷	محمد اسحق	ولد حافظ اللہ دیا	باڑہ ہندو راؤ	۶۵ سال	سنجار
۹۷	۱۹	صاحبزادی بیگم	شرف الدین	باڑہ ہندو راؤ دہلی	۸۰ سال	سنجار
۹۸	۲۱	مردہ پیدا الش	عبد الستار	تنگ محل پھاٹک حبش خاں	—	—
۹۹	۲		محمد یونس [illegible] والے	گلی والی برانچ	۳ یوم	—
۱۰۰	۲۸	نسیما خاتون	لطیف اللہ	نواب گنج	۲ یوم	سنجار
۱۰۱	۱	عطا کارط	عنایت اللہ	بارہ دری نواب وزیر	۳۵ سال	کھانسی
۱۰۲	۳	عائشہ	زوجہ عبد الحق [illegible] والے	احاطہ کدارہ	۶۰ سال	سنجار
۱۰۳	۵	محمد شفیق	حافظ محمد یونس	باڑہ ہندو راؤ کوٹھی میم	۵ ماہ	سنجار
۱۰۴	۷	لڑکا	غیاث الدین	احاطہ کدارہ	ایک یوم	—
۱۰۵	۹	گلزار بیگم	آفتاب الدین	محلہ نواب گنج	ڈیڑھ سال	سنجار
۱۰۶	۱۵	محمد یونس	حاجی محمد اسحق دوائی والے	گلی چابک سواران	ڈیڑھ سال	سنجار
۱۰۷	۱۹	اخلاق احمد	محمد عمر بکس والے	نیا محلہ پل بنگش	ایک ماہ	

بقیہ فہرست شادی

نمبر شمار	تاریخ نکاح	تاریخ	نام نوشہ	عمر	ولدیت نوشہ	سکونت	ولدیت عروس	سکونت	تعداد مہر
۱۰۸	۱۸	۲۸	نور احمد	۱۹ سال	شیخ فیاض الدین اللہ والے مرحوم	گلی بنگالی بیگ	شیخ عبد اللہ کوڑی والے	بلیماران	۵۱۰۰
۱۰۹	۱۰	۱۸	ممتاز الدین	۲۱	شیخ نور الدین صاحب [illegible] والے	پھاٹک حبش خاں	شیخ محمد صدیق [illegible] والے	باڑہ ہندو راؤ	۳۱۰۰
۱۱۰	۲۰	۲۰	محمد تقی	۱۸	حاجی صالحین	بیری والا باغ	حاجی محمد تقی صاحب	عزیز گنج	۳۲۰۰
۱۱۱	۲۱	۲۱	محمد [illegible]	۲۴	محمد صدیق صاحب [illegible]	نئی مسجد	حاجی محمد صالحین	پھاٹک [illegible]	۲۱۰۰
۱۱۲	۲۱	۲۱	محمد یحیی	۱۹	حافظ محمد [illegible] والے	چمن واڑہ	حاجی محمد سعید صاحب	گلی چابک سواران	۵۱۰۰
۱۱۳	۲۲	۲۲	رفیق احمد	۲۱	حافظ محمد اسماعیل مرحوم پانی والے	نیا محلہ	شیخ محبوب الٰہی صاحب	پھاٹک حبش خاں	۴۱۰۰
۱۱۴	۲۹	۲۹	محمد [illegible]	۲۰	[illegible] والے	کوٹھی میم	[illegible] کلکتہ والے	کشن گنج	[illegible]
۱۱۵	۳۰	۳۰	محمد زکی	۱۸	ابو محمد شفیع صاحب مرحوم	چمن واڑہ	شیخ شہاب الدین [illegible]	کشن گنج	۲۱۰۰

۱	پیم ۶	پیم ۶	نہا احمد	۱۶ سال	محمد فاروق صاحب [illegible]	[illegible]	محمد حسین انبالہ والے	[illegible]	[illegible]
۲	پیم ۹	پیم ۹	محمد سعید	۱۱ سال	محمد حسین انبالہ والے	گلی محمد ذکریا	محمد شفیع صاحب مرحوم انبالہ والے	بیری والا باغ	۱۰۰
۳	پیم ۱۱	پیم ۱۱	محمد یونس	۲۳ سال	محمد حامد	گلی محمد ذکریا	محمد اسمعیل بنو والے	سٹیشن محل	۳۱۰۰
۴	پیم ۱۲	پیم ۱۲	عبدالرزاق	[illegible] سال	[illegible] عبدالرحمن	[illegible]	انیس الرحمن	[illegible]	۱۰۰
۵	پیم ۱۳	پیم ۱۳	سلطان احمد	۱۶ سال	حاجی محمد امین صاحب مرحوم	بیری والا باغ	حافظ عبدالرحمن مرحوم [illegible]	بیری والا باغ	۱۰۰
۶	پیم ۱۴	پیم ۱۴	حافظ محمد یحییٰ جہانگیر	۲۱	حافظ حمید اللہ جہانگیرے	کشن گنج	خان بہادر ایس ایم عبداللہ	نواب گنج	۵۱۰۰
۷	پیم ۱۵	پیم ۱۵	محمد صالحین	۲۱	شیخ محمد رفیع	احاطہ کالی صاحب	رحمت الٰہی صاحب	کالی صاحب	۵۱۰۰
۸	پیم ۱۶	پیم ۱۶	محمد شفیع ٹبلہ	۱۹	شیخ محمد عمر صاحب ٹبلہ	گلی ہنگا بیگ	شیخ محمد عثمان الٰہ والے	کٹرہ دھوبی	۵۱۰۰
۹	پیم ۱۸	پیم ۱۸	رحمت الٰہی	۲۳	نور الٰہی کپڑے والے	سٹیشن محل	قمر الدین	نئی مسجد	۲۱۰۰
۱۰	پیم ۱۸	پیم ۱۸	حافظ محمد یوسف	۲۱	حاجی انعام الٰہی بھرولہ والے	احاطہ کالی صاحب	شیخ حفیظ الرحمن مرحوم	احاطہ کالی صاحب	۴۱۰۰
۱۱	پیم ۱۹	پیم ۱۹	محمد تقی	۱۸	شیخ تعیین الدین الٰہ والے	گلی ہنگا بیگ	شیخ عبدالجبار کراچی والے	نیا محلہ	۵۱۰۰
۱۲	پیم ۲۱	پیم ۲۱	خلیل الرحمن	۲۲	عبدالاحد گلاس والے	احاطہ کالی صاحب	محمد عمر صاحب ٹبلہ	بھائک حبش خاں	۵۱۰۰
۱۳	پیم ۲۵	پیم ۲۵	مشتاق احمد	۲۱	محمد اشفاق صاحب مرحوم انبالہ والے	بیری والا باغ	محمد عثمان انبالہ والے	بلیماران	۲۵۰۰
۱۴	پیم ۲۸	پیم ۲۸	محمد فاروق	۱۹	انعام الٰہی اجمیر والے	کالی صاحب	محمد صالحین صاحب	گلی ہنگا بیگ	۵۱۰۰
۱۵	پیم ۲۸	پیم ۲۸	محمد شفیع	۳۰	محمد ابراہیم کلکتہ والے	〃	غیاث الدین		۵۱۰۰
۱۶	پیم ۲۸	پیم ۲۸	محمد رفیع	۱۸	محمد ابراہیم کلکتہ والے	کالی صاحب	محمد ایوب صاحب	احاطہ کالی صاحب	۲۱۰۰
۱۷	پیم ۲	پیم ۲	محمد احمد	۳۰	شیخ عبدالحق صاحب	〃	محمد عثمان صاحب	بیری والا باغ	۲۵۰۰
۱۸	پیم ۳	پیم ۳	محمد صالحین	۲۰	بھائی عبدالرحمن	کالی صاحب	عزیز الرحمن شیشے والے	احاطہ کالی صاحب	۲۱۰۰
۱۹	پیم ۵	پیم ۵	محمد فاروق	۲۲	شمس الحق رنگ والے	بیری والا باغ	محمد رفیع کلکتہ والے	اب گنج	۱۱۰۰
۲۰	پیم ۵	پیم ۵	ذکر الرحمن	۲۱	حاجی عبدالرزاق انبالہ والے	کشن گنج	حاجی محمد شفیع	گلی رنگ والی	۴۱۰۰
۲۱	پیم ۹	پیم ۹	خلیل احمد	۱۹	حاجی عبدالرزاق انبالہ والے	کشن گنج	حاجی محمد شفیع صاحب	اسلام گنج	۴۱۰۰
۲۲	پیم ۱۰	پیم ۱۰	شجاع الدین	۱۸	احمد دین صاحب	کٹرہ شفیع	محمد عمر صاحب بیل والے	حاجی کٹرہ	۱۱۰۹
۲۳	پیم ۱۲	پیم ۱۲	محمد بشیر	۲۵	احمد دین صاحب	احاطہ کدارہ	محمد صالحین شیشے والے	بیری والا باغ	۱۱۰۰
۲۴	پیم ۲۶	پیم ۲۶	ممتاز الدین	۳۰	شیخ وحید الدین کلکتہ والے	بلاف خانہ	محمد تقی سوت والے	بارہ دری	۲۱۰۰
			ادارہ اب تک	فہرست	نہ چھاپنے پر معذرت	خواہ ہے	آئندہ اس قسم کا		
۰			تساہل	نہ	برتنے کی پوری	کوشش	کی جائے گی ۔		

[illegible] نمبر خاص نمبر ماھنامہ پنجابی گزٹ ۱۹۶۲ء

جامعہ نگر (نئی دہلی)

L 4222 PRICE -/12

Idar.............. Name..............

......لڑکی ھماری زندگی کا ایک اُھم ستّون ھے - اُسے نہ صرف ایک صحت مند نسل پیدا کرنی اور پرورش کرنی ھے بلکہ نئی نسل کی معلمہ بننے کے فرائض بھی اس پر عائد ھوتے ھیں - آج مدرسہ کے دروازہ میں داخل ھونے والی سراسیمہ بچی کل ھماری ماں بننے جارھی ھے - اور ماں کا وہ ھاتھہ جو پنگوڑے کو ھلاتاھے ایک قوم کی زندگی بنانے اور بگاڑنے کی زبردست طاقت رکھتا ھے

- عمر الٰہی -

A few lines from the forward of Syllabus and Prospectus for Girls education, running in 200 Pages written and chalked out by Mr. Umar Elahi, Member Working Committee Anjuman Wakil-e-Qum Panjabian and Joint Secretary Girls Schools Su[illegible]mmittee.